Gulshan-e-Hind

Lutf, Mirza Ali

گلشنِ ہند

مشہور شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ

جس کو

میرزا علی متخلص بہ لطف

نے بعہد مارکوئس آوف ویلزلی گورنر جنرل ہند اُردو کے مشہور سرپرست مسٹر جان گلگرسٹ کی فرمائش سے

علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرہ گلزارِ ابراہیم سے مع اضافوں کے اُردو زبان میں

جو آج سے ایک سو پانچ برس پیشتر کی سادہ اُردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے

سنہ ۱۸۰۱ء

میں تصنیف کیا، اور

سنہ ۱۹۰۶ء

میں

شمس العلماء مولوی شبلی کی تصحیح و تحشیہ اور مولوی عبدالحق صاحب بی اے

کے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ، اُردو زبان کی خدمت کے لئے

عبداللہ خاں نے حیدرآباد دکن سے شائع کیا

اور

دارالاشاعت پنجاب کے

رفاہ عام سٹیم پریس لاہور میں چھپا

پبلشر کی التماس

سنہ ۱۳۲۶ ہجری کے موسم برسات میں پایۂ تخت حیدرآباد کی مشہور ندّی میں جو حصارِ شہر کے نیچے بہتی چلی گئی ہے، ایک عظیم الشان سیلاب آیا۔ اس سیلاب سے لاکھوں روپے کا نقصان ہوا، اور کچھ لوگوں کو بہ مصداق "چوں خراب شود خانۂ خدا گردد" فائدہ بھی پہنچا۔ لیکن اس طوفان کی سب سے بڑی اور مفید یادگار یہ تذکرہ ہے، جو پبلک میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر سیلاب نہ آتا تو اس منجمد زمین سے اس علمی چشمے کا بہنا ممکن نہ تھا۔ یہ سیلاب جہاں اور ہزاروں چیزوں کو اپنے ساتھ لایا، وہاں کسی آفت زدہ کا ایک کتب خانہ بھی بہا لایا؛ اور اس میں یہ تذکرہ بھی تھا۔ پبلک میں یہ آب آورد کتابیں کوڑیوں کے داموں بکیں اور یہ تذکرہ ہمارے کرم فرما مولوی غلام محمد صاحب مددگار کیبنٹ کونسل دولتِ آصفیہ کے ہاتھ لگا۔ انھوں نے علامہ شبلی کو دکھایا۔ علامۂ موصوف نے اس کو بدرجۂ غایت پسند کیا اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کرنے کا قصد کیا؛ لیکن انجمن اپنی پیچ در پیچ طرزِ عمل کی وجہ سے اس کو نہ چھاپ سکی اور علامۂ موصوف نے ہم کو اس کے شائع کرنے کی رائے دی، اور خود اس کے اڈِٹ کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ علامۂ موصوف نے اس کی تصحیح بھی کی اور اس پر کچھ نوٹ بھی لگائے، جو بجنسہ چھاپ دیئے گئے ہیں۔

اس تذکرے کی معنوی خوبیاں اور تاریخی حیثیت سے اس کی اہمیت، اس مقدمے سے ظاہر ہوگی جو ہمارے کرم فرما مولوی عبدالحق صاحب بی اے، پرنسپل مدرسۂ آصفیہ حیدرآباد نے ہماری فرمائش سے اس تذکرے پر لکھا ہے جس میں انھوں نے اردو زبان کے نشو و نما کی تاریخ اور اس کی قدیم تصانیف کا بیان اور تذکرۂ ہذا کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق

صاحب کو بڑی فیس لکھنے میں جو خاص ملکہ ہے۔ اُس کو تمام اُردو داں پبلک جانتی ہے کہ وہ کس خوبی سے اس اہم کام کو انجام دیتے ہیں، اس لئے ہم بجز شکریئے کے اور زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے

ہمیں مولوی غلام محمد صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اپنی علمی فیاضی سے یہ کتاب ہم کو چھاپنے کے لئے دی اور کئی سال تک ہمارے پاس رہی۔ علاّمہ شبلی بھی خاص شکریئے کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اپنی عنایت سے اُس کی تصحیح اور تحشی میں اپنا وقت صرف کیا۔

اس کتاب کے چھپوانے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی چھوٹنے نہ پائے؛ البتہ صرف اتنا تصرّف کیا گیا ہے کہ میرؔ، سوداؔ دردؔ اور مصنّف کا نمونۂ کلام، جو اس تذکرے میں نہایت کثرت کے ساتھ درج تھا، اُس میں سے صرف عمدہ نمونہ چُن لیا گیا ہے اور اس خدمت کو بھی مولوی عبدالحق صاحب کے ذوقِ سلیم نے انجام دیا ہے۔ اس کے سوا اس میں اور کوئی تصرّف نہیں کیا گیا بلکہ مقدمے اور نوٹوں سے اس کو اور زیادہ مخزنِ معلومات بنایا گیا ہے۔ جس کی قدردانی کی پبلک سے اُمید کی جاتی ہے۔ اگر پبلک نے اس کی قدر دانی کی تو ہم بہت جلد اور مفید علمی کتابوں کے شائع کرنے کے قابل ہو سکیں گے جو انگریزی اور عربی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن
۱۶ر نومبر ۱۹۰۶ء

عبداللہ خاں

فہرست تذکرۂ گلزار ابراہیم

حرف (ب)

حرف (ح)

حرف (ق)

حرف (ن)

مقدمہ

بر تذکرۂ گلشنِ ہند

(از مولوی عبدالحق صاحب بی اے۔ پرنسپل مدرسۂ آصفیہ حیدرآباد دکن)

یہ کتاب شعرائے اُردو کا قابل قدر و نایاب تذکرہ ہے اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت[1] شخص کے ہاتھ لگ گیا جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیّہ کیا اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں خود بے بضاعت، تاہم اس فرمائش کو جو اُنھوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا، اور بسر و چشم قبول کیا۔

حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ کے عہد، او

---

[1] مولوی عبداللہ خاں صاحب کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن ۱۲

امیر الممالک لارڈ وارن ہیس ٹنگز، گورنر جنرل کے زمانے میں، علی ابراہیم خاں[1] نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا فارسی میں لکھا تھا اور اس کا نام گلزارِ ابراہیم رکھا تھا۔ کوئی بارہ برس کی محنت میں ۱۱۹۸ھ ہجری مطابق ۸۴-۱۷۸۳ عیسوی میں جا کر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اُردو کے بڑے قدر دان اور محسن، مسٹر گلگرسٹ کی نظر سے گزرا۔ اُنھوں نے مولفِ تذکرہ ہذا سے فرمائش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اُردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ اُن کا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں اور اُن میں اُردو زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اس طرح یہ کتاب اُردو میں لکھی گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ نرا ترجمہ ہے، بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے، حالات میں بھی اور کلام میں بھی، جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہو گئی ہے۔

یہ تالیف اُس زمانے میں ہوئی جب کہ دلّی میں شاہ عالم بادشاہ اور لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں رونق بخش مسند حکومت تھے۔ بادشاہ تو ایک بے بسی اور بے کسی کی حالت میں تھے اور نام کے

---

[1] علی ابراہیم خاں متخلص بہ علی، مشہور ادیب اور مؤرخ ہیں۔ پٹنہ کے رہنے والے تھے، اور بعد گورنر جنرل لارڈ کارنوالس بنارس میں چیف مجسٹریٹ اور بعد ازاں گورنر رہے، اور ۱۲۰۸ھ ہجری میں وہیں انتقال کیا۔ ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں:

(۱) گلزارِ ابراہیم، تذکرہ شعرائے اُردو جو شاہ عالم کی بادشاہت، آصف الدولہ کی وزارت، اور وارن ہیس ٹنگز کی گورنر جنرلی میں ۸۴-۱۷۸۳ء (۱۱۹۸ھ) میں لکھا ہے، اور جس پر میرزا علی لطف نے اپنے اس تذکرہ گلشن ہند کی بنیاد رکھی۔

(۲) خلاصۃ الکلام اور صحف ابراہیم۔ یہ دونوں فارسی شعرا کے تذکرے ہیں۔

(۳) وقائع جنگ مرہٹہ۔ یہ کتاب بعہد لارڈ کارنوالس ۱۲۰۱ھ ہجری میں لکھی گئی۔ اس میں ۱۱۷۱ھ سے ۱۱۹۹ھ تک کے حالات درج ہیں۔ میجر فلر نے انگریزی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بڑی خوبی سے مرہٹوں کے حالات لکھے گئے ہیں اور پانی پت کی جنگ کا حال ایک ایسے شخص سے لے کر لکھا گیا ہے جس نے اپنی آنکھوں یہ جنگ دیکھی تھی۔

(۴) ایک کتاب میں راجہ چیت سنگھ والی بنارس کے بغاوت کے حالات لکھے ہیں۔ یہ واقعہ خود مصنف کے زمانے کا ہے، مگر چونکہ اس کتاب کے شروع ہی میں یہ فقرہ لکھا ہے کہ "من کہ علی ابراہیم خاں یکے از خیرخواہانِ کمپنی انگریز ام" لہٰذا کسی قدر بدگمانی ہوتی ہے۔

(۵) خطوط، جو برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہیں اور جس سے اُس زمانے کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

بادشاہ رہ گئے تھے، البتہ پورب کی طرف سے ایک جھلکی دکھائی دی۔ دلّی کے اہل کمال اپنے وطن سے منھ موڑ کر اسی طرف ہو لئے۔ یہ قدردانی کے بھوکے تھے، قدر ہوتے جو دیکھی تو وہیں کے ہو رہے۔ سب سے زیادہ شاعری کا ہنگامہ گرم تھا۔ بچہ بچہ شاعری کا دم بھرتا تھا۔ ادھر کے اساتذہ جو پہنچے تو اُنھوں نے وہ رنگ جمایا کہ سب رنگ پھیکے پڑ گئے۔ یہاں تک کہ نواب سعادت علی خاں جیسا عالی دماغ، متین، منتظم اور کام کرنے والا شخص بھی اس کے اثر سے نہ بچا۔ باوجود اس کے انشاء اللہ خاں نے جو ہزار جھگڑوں کا ایک جھگڑ تھا، آخر انھیں اپنی گوں نہ دیکھ کر کہہ ہی دیا۔

"میں ہوں ہنسوڑ اور تو ہی مقطع میرا تیرا میل نہیں"

کہتے ہیں کہ یہ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ بے شک لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جس کے ایک رخ پر عروج اور دوسرے رخ پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی۔ عروج تو اس لئے کہ زبان روز بروز منجھتی جاتی تھی اور صاف اور شستہ ہوتی جاتی تھی اور زوال اس لئے کہ فن شاعری میں صرف فارسی والوں کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص۔ اس کے بعد اور لوگ جو پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پر ہو لئے۔ شاعری بس اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہے قافیے کو اچھی طرح نباہ دیا، ایک آدھ محاورہ آگیا، کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہہ دی، کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارے کا استعمال ہو گیا۔ رہا مضمون، سو خدا کے فضل سے اس میں برکت ہی برکت تھی، اور اب بھی وہی حال ہے۔ مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقررہ ہیں اور اب تک وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں کسی نئی تشبیہ کا لکھنا بڑی بہادری اور جرأت کا کام ہے، کیوں کہ ہمارے نکتہ سنج شاعر اس کے لئے سند طلب کرتے ہیں۔ جیسے کوئی قانون داں کسی فوجداری جرم میں تعزیرات ہند کی دفعہ تلاش کرتا ہے اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان شعرا کی محنت سے زبان صاف ہو گئی، لیکن اپنی شاعری کی طرح

ٹھٹھر کے رہ گئی اور جو حصار کہ ہمارے نغز گو شعرا نے اس کے گرد باندھ دیا تھا اس سے آگے قدم نہ رکھ سکی۔ اس سے بڑھ کر محدود ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ شاعری کا دعویٰ ہے اُردو کے اُستاد ہیں۔ مگر خط و کتابت فارسی میں کرتے ہیں، دیوان اُردو ہے، مگر مقدمہ فارسی میں لکھا ہے۔ کوئی معاملہ آ پڑا اظہار مطلب فارسی میں ہوتا ہے اُردو میں نہیں، کسی طبیب کے پاس جائیے نسخہ فارسی میں ہے (اور یہ اب تک رائج ہے) سرکاری دفاتر میں فارسی رائج ہے، یہاں تک کہ خط کی مشق کے لئے بھی شعر لکھے جاتے ہیں تو فارسی، اب اُردو کو وسعت ہو تو کیوں کر۔

لیکن ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی اور جس کا تسلط اس وقت ہندوستان پر اس طرح بڑھتا چلا جاتا تھا، جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے، اس نے اُردو کی دستگیری کی اور وہ اس لئے کہ ہندوستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے کے لئے اس کا جاننا ضروری تھا۔ دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی، جہاں جہاں اُس وقت بھی مغلیہ حکومت کے آثار تھے، اسی کا دور دورہ تھا۔ علاوہ اس کے ہندوستان کی جدید زبانوں میں سب سے زیادہ ہونہار نظر آئی۔ اس لئے اُنھوں نے اس کی سرپرستی کی سب سے بڑا احسان ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا ہے جس نے انیسویں صدی کے شروع میں، بمقام فورٹ ولیم کلکتہ اس کا ایک محکمہ قائم کیا، جس کا ابتدائی اور اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں ان کی تعلیم کے لئے اُردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں، اور غالباً اسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اُردو زبان دفتر کی زبان قرار پائی۔ یہ عجب واقعہ ہے اور یاد رکھنے کی بات ہے کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی، ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل کی کوشش سے دفاتر میں داخل ہوئی، اور دوسرے دور میں اُردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی۔ اس شخص نے اس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اُردو نثر کا لکھنا اسی وقت سے شروع ہوا، اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ جو احسان وَلی نے اُردو نظم پر کیا تھا، اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گلگرسٹ نے اُردو نثر پر کیا ہے۔

چوں کہ یہ تذکرہ بھی اسی نامور اور قابل شخص کی تحریک سے لکھا گیا تھا، لہٰذا اس مقام پر مختصراً یہ بیان کرنا کہ اس کی نگرانی میں یا اور انگریزوں کی سعی سے کیا کیا کام ہوا، اور اُردو زبان میں کس قدر اضافہ ہوا، نامناسب نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے اول سید محمد حیدر بخش حیدری قابل ذکر ہیں۔ اُنھوں نے ۱۸۰۱ء میں توتا کہانی لکھی، جو اصل میں اُنھوں نے طوطی نامہ کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ طوطی نامہ ابن نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانے میں، دکنی زبان میں لکھا تھا، مگر ماخذ اس کا ایک سنسکرت کتاب ہے۔ آرایش محفل یعنی مشہور قصۂ حاتم، بھی جو اب تک عوام میں دل چسپی سے پڑھا جاتا ہے، انھیں کا لکھا ہوا ہے۔ ایک کتاب گلِ مغفرت یا دہ مجلس مسلمانوں کے اولیاء اللہ کے حالات میں بھی لکھی ہے۔ فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش کا بھی اُردو ترجمہ کیا ہے۔ جس کا نام گلزار دانش ہے۔ ایک اور کتاب تاریخ نادری اُردو میں لکھی، یہ کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے۔

دوسرے صاحب میر بہادر علی حسینی ہیں اُنھوں نے میر حسن دہلوی کی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان (قصہ بدر منیر و بے نظیر) کو اُردو نثر میں کیا ہے اور اس کا نام نثر بے نظیر رکھا ہے، اور ایک کتاب اخلاق ہندی کے نام سے لکھی ہے، اس کتاب کا ماخذ فارسی کتاب مفرح القلوب ہے جو اصل میں سنسکرت سے لی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی تھیں۔

میر امّن دہلوی سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ احمد شاہ دُرّانی کے زمانے میں جو دلّی پر آفت آئی تو یہ وطن کو چھوڑ کر پٹنہ میں آ رہے، یہاں سے ۱۸۰۱ء میں کلکتہ پہنچے۔ باغ و بہار کی وجہ سے

ان کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء-۱۸۰۲ء میں لکھی گئی ہے اور انیسویں صدی کے آغاز میں دلّی کی جو زبان تھی اُس کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کتاب کا ماخذ امیر خسرو کی چہار درویش ہے۔ میر امّن نے امیر خسرو کی تصنیف سے ترجمہ نہیں کیا، بلکہ اس سے پیشتر ایک صاحب تحسین نامی ساکن اٹاوہ نے اسے امیر خسرو کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا اور اس کا نام نوطرز مرصع رکھا تھا؛ میر امّن نے اخلاق محسنی کے تتبع میں ایک کتاب گنج خوبی بھی اسی زمانے میں لکھی۔ حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج میں پروفیسر تھے۔ ۱۸۰۳ء میں انھوں نے علامی ابوالفضل کی کتاب عیار دانش کا ترجمہ اُردو میں کیا اور خرد افروز اس کا نام رکھا۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے اور عربی میں کلیلہ دمنہ کے نام سے مشہور ہے۔

میر شیر علی افسوس بھی اسی سلسلے میں ممتاز شخص ہیں۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ گیارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ بہت سے انقلابات کے بعد نواب سالار جنگ اور پھر ان کے بیٹے نوازش علی خاں کے ہاں ملازم رہے اور جب یہ شیرازہ بکھر گیا تو صاحب عالم و عالمیاں مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کے متوسل ہو گئے۔ مگر جب شہزادہ عالم کا کوچ شاہ جہان آباد کی طرف ہوا تو یہ ساتھ نہ جا سکے اور نواب سرفراز الدولہ بہادر کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرنے لگے۔ تلمذ اُن کو میر حیدر علی حیراں سے ہے اور بعض کا قول ہے کہ میر درد اور میر سوز کے شاگرد ہیں۔ اتنے میں صاحب عالی شان بارلو صاحب نے مسٹر گلکرسٹ کے مشورے سے، زباں دانانِ ریختہ کو لکھنؤ سے طلب فرمایا، چناں چہ لکھنؤ کے رزیڈنٹ مسٹر اسکاٹ نے میر شیر علی افسوس کو انتخاب کیا اور دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کر کے پانسو روپے خرچ راہ دیا اور کلکتہ روانہ کیا۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے اور نو برس بعد انتقال کر گئے۔ یہاں انھوں نے ایک قابل قدر کتاب آرائش محفل لکھی، جس میں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں۔ اس کتاب کا ماخذ

ن رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے اور مرنے سے سال بھر پہلے یعنی ۱۸۰۸ء میں سعدی
لستاں کا ترجمہ باغ اُردو کے نام سے اُردو میں کیا۔

نہال چند نے ۱۸۰۴ء میں مثنوی گل بکاولی کو اُردو نثر میں لکھا اور نام اس کا مذہب عشق رکھا۔

کاظم علی جوان بھی دہلی کے تھے، بعدازاں لکھنؤ میں آئے، اور وہاں سے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ
ے فورٹ ولیم کالج میں آئے۔ اُنھوں نے ۱۸۰۲ء میں شکنتلا کا قصہ اُردو میں لکھا۔ نواز کبیشر نے
برج بھاکا میں (۱۷۱۶ء) شکنتلا کی کہانی لکھی تھی، اس کا یہ ترجمہ ہے۔ انھوں نے ایک بارہ ما
ی لکھا ہے اور اس میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے، جس کا نام دستور ہند ہے اور جو
۱۸۱۲ء میں چھپا۔

اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالے کا ترجمہ عربی سے
اُردو میں کیا، جس میں شاہ اجنّہ کے سامنے انسان و حیوان کا جھگڑا پیش ہے کہ ہم دونوں
میں کون افضل ہے۔ یہ من جملہ اُن رسائل کے ہے جو بغداد کی مشہور سوسائٹی اخوان الصفا کے
اہتمام سے لکھے گئے تھے۔

سری لالو گجرات کا برہمن تھا جو شمالی ہند میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ اس نے فورٹ ولیم کالج
کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں مثلاً پریم ساگر، راج نیتی و لطائف ہندی ترجمہ یا
تالیف کیں۔ سنگھاسن بتیسی، سری لالو اور جوان نے مل کر ۱۸۰۱ء میں لکھی جو آدھی اُردو
آدھی ہندی ہے۔

مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی، جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے
مثل ہے۔ اور نیز ولا کی مدد سے قصہ مادھونال کو برج بھاکا سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

علاوہ اس کے خود گلگرسٹ نے ۱۸۱۰ء میں اُردو کی ایک لغت لکھی۔ زبان کے بعض

قواعد لکھے اور مختلف طرح سے اُردو زبان کی خدمت کی معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گلگرسٹ سے اول بھی ایک شخص فرگسن نامی نے اُردو کی ایک لغت لکھی تھی جو لندن میں ۱۷۷۳ء میں طبع ہوئی مگر چوں کہ وہ بالکل ناکافی تھی، جنرل ولیم کرک پیاٹرک نے ایک ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا، جس کے اُنھوں نے تین حصے کئے، مگر اس کا ایک ہی حصہ طبع ہونے پایا۔ اس حصے میں اُنھوں نے وہ الفاظ لئے ہیں جو عربی فارسی سے ہندی میں آگئے ہیں۔ باقی دو حصوں کے طبع کرنے کے لئے انھیں ناگری ٹائپ کا انتظار تھا وہ جلد تیار نہ ہوسکا اور کتاب ناقص رہ گئی۔ یہ ایک حصہ لندن میں ۱۷۸۵ء میں طبع ہوا۔ لندن سے جب یہ واپس آئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر گلگرسٹ بھی اسی کام میں لگے ہوئے ہیں، تو چاہا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں، مگر چونکہ ان کو اور بہت سے کام کرنے تھے، اس لئے تھوڑے دنوں کے بعد وہ الگ ہوگئے اور ڈاکٹر گلگرسٹ تنہا یہ کام کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک حصہ انگریزی ہندوستانی لغت کا تیار کرکے ۱۷۹۸ء میں چھاپ دیا۔ مگر دوسری جلد ہندوستانی انگریزی لغت ختم نہ کرسکے۔ علاوہ اُن تمام دقتوں کے جن سے وہ گھبرا گئے تھے، ایک دقت یہ بھی تھی کہ خریدار بہم نہ پہنچے۔ صرف ستّر صاحبوں نے خریداری منظور کی۔ حالاں کہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار روپیہ کا کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو نہایت حسرت کے ساتھ خیرباد کہا۔ اس کے بعد میجر ڈیوڈ تامسن رچرڈسن سپرنٹنڈنٹ و کمانڈنٹ ملٹری اکاڈمی نے اُردو لغت لکھنی شروع کی، مگر افسوس کہ اس کا بھی وہی حشر ہوا اور طبع ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس کے بعد ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ٹیلر نے ایک ہندوستانی انگریزی لغت طبع کرائی۔ اسی کتاب کو پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے دیسی ادیبوں کی امداد سے نظرثانی کرکے چھپوایا۔

گلیڈون نے ایک لغت فارسی اور ہندوستانی زبان کی دو جلدوں میں لکھی، جو کلکتہ

میں ۱۸۰۹ء میں چھپی۔ مسٹر جان شیکسپیر نے ایک اردو لغت ۱۸۱۷ء میں طبع کرائی، یہ کتاب زیادہ تر ٹیلر کی لغت سے ماخوذ ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اسی کتاب کو دوسرے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ فوربس کی لغت ۱۸۴۷ء میں لندن میں چھپی۔ ایک فرانسیسی برٹرینڈ نے بھی ایک لغت لکھی جو پیرس میں ۱۸۵۸ء میں طبع ہوئی۔ براٹس کی لغت ۱۸۶۴ء میں لندن میں چھپی۔ پلیٹ نے بھی ایک لغت لکھی ہے، جس کے طبع ہونے کا سن مجھے معلوم نہیں ہوا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر فیلن نے اردو کی کئی لغات لکھیں، ان کی ہندوستانی انگریزی لغت درحقیقت سب سے بہتر ہے، یہاں تک کہ اہل زبان نے بھی جو دو ایک لغت لکھے ہیں ان میں بھی زیادہ تر فیلن کا تتبع کیا گیا ہے، بلکہ اسی سے ماخوذ ہیں۔

اس مقدمے میں جو انگریزوں کے احسان کا ذکر کیا گیا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس تذکرے سے بھی بعض باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اس زبان سے خاص دلچسپی تھی اور اس کی ترقی دینے میں انھوں نے حتی الامکان کوشش کی۔ میر شیر علی افسوس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے، اور وہ ہم نے اسی تذکرے سے لیا ہے۔ میر کے حال میں لکھا ہے:-

"جن ایام میں کہ درخواست صاحبانِ عالی شان کی زبان دانانِ ریختہ کے مقدمہ میں کلکتہ سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے سامنے تقریب میر کی ہوئی لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے، اور جوانانِ نومشق مربی گری سے قوتِ بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبعوں سے کبھی نہیں خالی ہے اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتہ میں شاعری کی جا درخواست حمالی ہے۔"

غالباً اس جگہ کے لئے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا، کاش میر صاحب کا انتخاب ہوتا

چوں کہ ان کی نظم میں انتہا درجے کی فصاحت و شیرینی اور سلاست اور گھلاوٹ موجود ہے اس لئے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جا کر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اس زبان ان کی نظم کی طرح اسے سر اور آنکھوں پر رکھتے اور اردو زبان میں ایک عجیب اور قابل قدر اضافہ ہوتا۔

نواب محبت خاں محبت خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ذکر میں لکھا ہے کہ :-

"انھوں نے نواب ممتاز یار الدولہ مسٹر جانسین کی فرمائش سے قصہ سسی پنوں کا اردو میں نظم کیا اور نام اس کا اسرار محبت رکھا۔"

میر قمر الدین کے حال میں درج ہے کہ :-

"انھوں نے میر محمد حسین (فرنگی لقب) کے توسل سے ممتاز الدولہ مسٹر جانسین کی سرکار میں توسل حاصل کیا، اور ان کی رفاقت میں کلکتہ آکر عماد الدولہ گورنر مسٹر ہستین (ہسٹنگز) جلادت جنگ بہادر کی اعانت سے پیشگاہ نظامت صوبہ بنگ سے ملک الشعرا کا خطاب لیا۔"

اس زمانے میں علاوہ ڈاکٹر فیلن کے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، کرنل ہال رائڈ سابق ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب نے بھی اردو زبان کی ترقی میں بیش بہا مدد دی، سلسلۂ تعلیم کے لئے عمدہ عمدہ کتابیں لکھوائیں، انگریزی سے بھی بعض چیزیں ترجمہ کرائیں اور اس میں مفید اور نیک مشورہ دیا۔ کتابت اور چھپائی میں بھی خاص اہتمام کیا، اور اس میں کارآمد اصلاحیں کیں۔ اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ لاہور میں ایک انجمن قائم کی جس میں نیچرل مضامین پر عمدہ عمدہ نظمیں لکھوائیں۔ شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی، اور شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی بعض نظمیں انھیں کی تحریک سے لکھی گئیں اور وہیں پڑھی گئیں۔ کرنل ہالرائڈ کا یہ کام بہت

قابل قدر اور قابل تعریف ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو نثر کی طرح اردو نچرل شاعری کی بنا بھی ایک حد تک انگریزوں ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ آج کل مسٹر ہل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب نے جو انجمن ترقی اردو کی صدارت قبول فرماکر اردو کی سرپرستی فرمائی ہے وہ بھی کچھ کم قابل شکریہ نہیں۔ اسی سلسلے میں جو ایک اور قابل قدر کام انگریزوں کے ہاتھوں ہوا ہے اور جس کا ذکر میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ سب سے اول اردو کتابیں بھی انھوں ہی نے چھپوائیں؛ اوّل اوّل فورٹ ولیم کالج ہی کے پریس میں اردو کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں اور جتنی کتابیں کہ ڈاکٹر گلگرسٹ اور اس کے جانشینوں کی نگرانی اور مشورے سے تیار ہوتی تھیں وہیں چھپتی تھیں اس کے بعد لتھوگراف پریس سب سے پہلے دہلی میں ۱۸۳۷ء میں استعمال ہوا؛ اور اس کے بعد سے روز بروز کتابوں کے چھپنے میں ترقی ہوتی رہی۔

وہ انگریز حاکم جس نے اس ملک میں بیٹھ کر جو اردو کا جنم بھوم اور وطن مالوفہ ہے، اسے دفاتر سے نکال کر ذلیل کرنا چاہتا تھا، وہ سخت غلطی پر تھا۔ اگر وہ اس زبان کی تاریخ سے واقف ہوتا اور یہ جانتا کہ اس کے واجب التعظیم بزرگوں نے اس کے حاصل کرنے اور اسے وسعت دینے میں کیسی کیسی مشقتیں جھیلی ہیں اور اس عجیب و غریب سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ہی اس عجیب زبان کی بنیاد بھی مستحکم کی ہے، تو ضرور اپنی حرکت پر نادم ہوتا۔ یہ زبان کسی خاص فرقے یا خاص ملت کی نہیں ہے۔ اس پر دنیا کی تین بڑی قوموں نے عرق ریزی کی ہے: ہندو اس کی ماں ہیں، مسلمان اس کے باوا ہیں اور انگریز اس کے گاڈ فادر ہیں۔ جو لوگ اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں جو تینوں کے اتحاد کی یادگار ہے۔ وہ غلطی پر ہیں، جب تک ہندو اور مسلمان اور انگریز دنیا میں قائم ہیں، کم از کم اس وقت تک یہ زبان ضرور قائم رہے گی۔

افسوس ہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنے حالات کچھ نہیں لکھے؛ دیباچے میں تو ذکر ہی نہیں، شعرا کے سلسلے میں جہاں اپنا حال لکھا ہے وہ بھی برائے نام ہے؛ بلکہ دوسرے شعرا کے مقابلے میں بالکل کم اور ناکافی ہے، البتہ اپنا کلام بڑے شوق سے نقل کیا ہے اور شاید اس موقع کو غنیمت سمجھ کر سب کا سب درج تذکرہ کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم نے کچھ ان کے کلام سے اور کچھ ادھر اُدھر سے تھوڑا بہت حال بہم پہنچایا ہے۔

نام میرزا علی تخلص لطف تھا، ان کے والد کاظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے، ۱۱۵۴ھ ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہ جہان آباد تشریف لائے اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا، فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں میرزا علی لطف باپ ہی کے شاگرد تھے۔ میرزا لطف دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"میرا ارادہ سیر حیدرآباد کا تھا مگر چوں کہ مسٹر گلگرسٹ نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھ سے اس تذکرے کے لکھنے کی خواہش کی لہٰذا میں نے اسے بسر و چشم قبول کیا۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

"آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ ہجری اور ۱۸۰۱ء کے ہیں، عہد سلطنت قائم ہے اُسی بادشاہ روشن دل خدا پرست سے . . . ."

پھر اس کے بعد نواب سعادت علی خاں بہادر کا ذکر کیا ہے اور بعد ازاں مارکوئیس آف ولزلی کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:۔

"موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے کہ نام نامی[1] اور اسم گرامی اُس کا اوپر مذکور ہوا ہے اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا۔"

---

[1] ڈاکٹر جان گلگرسٹ ۱۲

اس سے صاف ظاہر ہی کہ یہ تذکرہ مؤلف نے ۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا؛ اس کے مادۂ تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہی کہ کتاب ۱۲۱۵ھ ہجری میں لکھی گئی۔

"حیراں پھریں ہیں بے سروپا بہمن اور دے

تاریخ اس کی جب سے کہ رشکِ بہشت ہے

۱۲ - ۱۲۲۷ = ۱۲۱۵ھ ہجری

اور غالباً یہی سال اختتام تذکرہ کا بھی ہی۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہی کہ اس فرمائش کے بعد نہیں، تو اول ضرور حیدر آباد میں تشریف رکھتے تھے، کیوں کہ ان کے کلام میں وہ قصائد درج ہیں جو انھوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ، اور میر عالم کی مدح میں لکھے تھے۔ اعظم الامرا مرہٹوں کی قید سے نجات پانے کے بعد دوبارہ ۱۷۹۷ء میں وزیر مقرر ہوئے اور مئی ۱۸۰۴ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد اسی سال میر عالم وزیر ہوئے، اور ۱۸۰۸ء میں وفات پائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اس زمانے میں حیدر آباد چلے گئے تھے۔ چوں کہ ان کو زیادہ تر یا تو انگریزوں سے سابقہ رہا، یا اہل حیدر آباد سے، اس لئے انھوں نے ایک شعر میں اس تعلق کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہی کہتے ہیں :-

"ہوا آوارہ ہندستاں سے لطف آگے خدا جانے

دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے"

جو قصیدہ انھوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا ہی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی وہ فراغ بال اور خوش حال تھے اور دکن میں جاکر ارسطو جاہ کے ہاں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے ملازم ہو گئے تھے، مگر اس تنخواہ سے خوش نہیں تھے، اضافے کی درخواست کرتے ہیں اور بڑے زور سے کرتے ہیں :-

"کل ہی کی بات ہے، یہ مسافر وطن میں تھا — سو دو سو آشنا کا حقِ بندگی گزار

شکرِ خدا کہ آج بیک پنی و دو گوش — گرچہ دکن میں ہے، نہیں ہر در پہ خوار و زار

ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکوں — لازم وگرنہ تھا بشریّت کو اضطرار

اس سامعہ خراشی سے مجھ کو جو ہے غرض — سو یہ ہے اے امیرِ فلک قدر و کے تبار!

سرکار سے تری جو زراہِ تفضّلات — ہے ڈیڑھ سو روپے ترے خادم کا ماہوار

ہر چند جائے شکر ہے پر عرض کیا کروں — جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل او نہار

بے گفتگو پچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے — ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار

خلقِ خدا کا بار اٹھاتی ہے پالکی — میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار

باقی جو سو رہے کئی دن میں زباں پہ پھر — مثلِ مجرّدات فقط ان کا ہے شمار

تجھ سا ہو قدردانِ نکات اور نکتہ سنج — یوں ہو اسیر پنجۂ چرخِ ستم شعار

فضل و ہنر جو مجھ میں ہے وہ سب بہ یک طرف — اور قدردانیاں بھی تری سب بہ یک کنار

ہے ہمّتِ بلند کا تیری جو اقتضا — اس امر میں تو ہے تجھے آئندہ اختیار

ازبس کہ کم دماغ ہوں ضیقِ معاش سے — بالفعل تو اضافے کا ہوں گا امیدوار

لیکن نہ وہ اضافہ جو ہو وے برائے نام — کافر ہوں سو پچاس میں گر ہو کشودِ کار

تضعیفِ اصل چاہتا ہے تجھ سے یہ ضعیف — کیوں کر یہ بے حیائی نہیں ہوتی بار بار

غالب ہے تجھ پہ شائق نہ ہوں میرے تین سو — چھ سو جب آمیوں کو تو دے بلکہ چھ ہزار"

جو شکایت شاعر نے اخیر شعر میں کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں قدیم سے چلی آ رہی ہے اور اب تک باقی ہے۔

اس قصیدے میں شاعر نے تعلّی کی لی ہے اور ناصر علی کا ذکر کیا ہے کہ ذوالفقار خاں کی

اس نے قصیدہ کہا اور صرف اس کے اس مطلع پر :

"اے شانِ حیدری ز جبینِ تو آشکار
نامِ تو در نبرد کند کارِ ذوالفقار"

امیرالامرا نے زر و سیم نثار کیا۔ پھر اس مطلع کو پڑھ کر کہتا ہے کہ اس میں کیا رکھا ہے :-

"جز لفظِ ذوالفقار نہیں اس میں کوئی بات | ایسی کہ ڈال دیویں سپر جس کے آگے یار
آئینِ قدر دانی میں لیکن برائے نام | لازم یہی ہے کر گیا جو خانِ باوقار"

اور پھر خود اس مطلع کا جواب لکھتا ہے :

"کہتی ہے فارسی میں مجھے طبع مطلعے | ہاں در جوابِ مطلعِ ناصر علی بیار
اے ذرہا ز نامِ تو خورشید اعتبار | تاثیرِ اسمِ اعظم از اسمِ تو آشکار

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس میں بھی سوائے لفظ اعظم کے اور کیا رکھا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کے یہ مطلع ناصر علی کے مطلع کو نہیں پہنچتا۔

میر عالم بہادر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں بھی یہی رونا رویا ہے :

"پر اتنی عرض اے حاجت روائے خلق ہے تجھ سے | کہ میں خواہاں نہیں کچھ ملک و کوس و طبل و لشکر کا
توجہ اتنی فرما تو کہ مایحتاج کی رو سے | نہ ہوں محتاج عندالوقت سیم و زر و گوہر کا"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرۂ شعرا گلشنِ بیخار میں لکھتے ہیں کہ :-

"میرزا لطف کچھ دنوں نواح عظیم آباد میں بھی رہے ہیں اور نسبت شاگردی میر تقی سے رکھتے ہیں۔"

لیکن خود میرزا لطف اپنے حال میں یہ لکھتے ہیں :

"اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے"

اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہیئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ میر تقی کے بہت بڑے مدّاح اور ماننے والے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے وہ ان کی شاگردی سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔

لطف ایک معمولی شاعر ہیں، غزل و قصیدہ و مثنوی سب کچھ لکھا ہے، مگر کلام میں لطف نہیں۔ البتہ یہ تذکرہ اُن کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جو اُردو زبان میں قابل یادگار ہے۔ چوں کہ ایک انگریز با اقتدار کی فرمائش سے لکھا ہے، زبان صاف اور سادہ ہے، تاہم قافئے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تذکرے اگرچہ اور بھی لکھے گئے ہیں مگر اس میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں کہ جس سے یہ درحقیقت قابل قدر ہے۔

۱۔ اوّل تو سو برس پہلے کی زبان ہے، جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتا لگ سکتا ہے اور محقق علم اللسان کو اور نیز اُن لوگوں کو جنھیں زبان کا چسکا ہے بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک ظاہر بات جو ہمیں عام طور پر اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوئی، وہ یہ ہے کہ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرہ بول چال میں آتے ہیں اور ہندوستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں، وہ درحقیقت پُرانی زبان کی یادگار ہیں۔ مثلاً:۔ ''کر کے'' کا خاص استعمال جو ہم یہاں ہر روز سنتے ہیں، اس تذکرے میں بھی جا بجا پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:۔

''شورش تخلص، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر پھنا 'کر کے' تھے۔''

اسی طرح میر قمر الدین منت کے حال میں لکھا ہے:۔

''چنانچہ شکرستان 'کر کے'، ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بطور گلستان کے مشہور ہے۔''

دکن میں بعض لوگ ''بعد میں'' کی جگہ ''بعد از'' بولتے ہیں، سوز نے ایک شعر میں یہی لفظ لکھا ہے:۔

''ہے جیتے جی تو مجھے کوئے یار میں رونا ۔۔۔ رہے گا مرگ کے 'بعد از' مزار میں رونا''

فعل کے بعض استعمال بھی بعض اوقات بالکل ایسے ہیں جو ہم حیدرآباد میں اکثر سنتے ہیں۔
مثلاً :۔ فعل متعدی میں فعل بہ لحاظ مفعول کے آتا ہی، مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے
لحاظ سے آیا ہی۔ دکن میں عموماً اسی طرح بولتے ہیں۔ ضیا کے حال میں لکھا ہے :۔

"دلّی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا وہیں ٹھیرائے۔"

فقیر کے تذکرے میں لکھتے ہیں :۔

"بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے۔"

دکن میں عام طور پر "میں کہا" بولتے ہیں، قائم کہتے ہیں :۔

"میں کہا، عہد کیا کیا تھا رات،
ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں"

۲۔ دوسرے علاوہ اس کے کہ مؤلف ایسے زمانے میں تھا جب کہ اُردو زبان عروج پر تھی اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے، مؤلف ان کا ہم عصر تھا اور ان میں سے اکثر سے ان کی شناسائی اور دوستی تھی اور اس لئے جس وثوق اور صحت کے ساتھ اُن کے حالات یہ لکھ سکتا ہی دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ اور بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں جو کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ مثلاً :۔ رزیڈنٹ لکھنؤ کا میر تقی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبان ریختہ میں تالیف و تصنیف کے لئے طلب کرنا اور بوجہ پیرانہ سالی اُن کا منتخب نہ ہونا۔ یا میر صاحب ہی کے حال میں ایک ایسا فقرہ لکھا ہی جس کا دل پر بہت اثر ہوتا ہی، اور جو صرف اس تذکرے کا مؤلف ہی لکھ سکتا تھا، کیوں کہ وہ ان کا دیکھنے والا تھا اور خاص ارادت رکھتا تھا۔ علاوہ اس کے اس سے میر صاحب کی اس خاص وضع اور طبیعت کا اندازہ بھی ہوتا ہی، جو اُنھوں نے عمر بھر نباہی۔ وہ لکھتا ہی :۔

"ناقدردانی سے اغنیا کی اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہی اور ہوائے شہرستان معنی طراز اس مرتبہ فاسد کہ میر سا شاعر، جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہی خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہی مقال کا، وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہی اور بات کوئی نہیں پوچھتا اُس کی آج ہی"

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنی کتاب آب حیات میں لکھتے ہیں کہ :-

"جب میر صاحب لکھنؤ آئے تو نواب آصف الدولہ نے دو سو روپیہ مہینہ کر دیا۔ مگر چوں کہ بدمزاج انتہا درجے کے تھے نواب سے بگاڑ کر لیا اور گھر بیٹھ رہے اور زندگی فقر و فاقے میں گزار دی"

مگر اس تذکرے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ صحیح نہیں کیوں کہ اس میں لکھا ہی کہ :-

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے روزِ ملازمت خلعت فاخرہ دیا اور تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کر دیا، اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہ ہوا اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ ہجری ہیں وہی حال ہی جو اوپر مذکور ہوا"

مگر صاحب تذکرہ کا چند سطر اوپر یہ لکھنا کہ وہ نان شبینہ کا محتاج ہی یا تو مبالغہ ہی یا یہ ہی کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں اُن کے کمال کی پوری قدر نہ ہوئی۔ غرض یہ کہ بعض باتیں اس میں نئی نظر آتی ہیں۔

۳۔ تیسرے صاحب تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہی کہ جن لوگوں کو تھوڑا یا بہت یا کسی قدر تعلق سلطنت سے رہا ہی، ان کے تذکرے میں تاریخی حالات بھی خوب خوب

لکھے ہیں چنانچہ شاہ عالم المتخلص بہ آفتاب کے حال میں ان کا بزمانۂ ولی عہدی عماد الملک کے خوف سے دلی چھوڑنا، باپ کا دھوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا اور ان کا سنہ ۱۱۷۳ھ میں تخت نشین ہونا، رام نراین سے جنگ، دلیر خاں کی دلیری اور جاں نثاری، فتح و نصرت کا حاصل ہونا وغیرہ وغیرہ، بالتفصیل لکھا ہے اور اخیر میں کورنمک سنگدل غلام قادر خاں روہیلے کا دردناک واقعہ بھی درج کیا ہے؛ اور بادشاہ کی دردناک غزل بھی نقل کر دی ہے جس میں یہ واقعہ منظوم ہے اور خود اردو نظم میں ترجمہ کر کے متن میں درج کی ہے، اس لئے کہ تذکرہ اردو کا اور اصل غزل حاشئے پر لکھ دی ہے البتہ اتنا تکلف کیا ہے۔ اسی طرح تانا شاہ، آصف الدولہ اور مرزا محمد رضا امید کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات اور قصص لکھے ہیں خصوصاً میرزا محمد رضا امید کے تذکرے میں، امیر الامرا حسین علی خاں اور ان کے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کئے ہیں۔

۴۔ چوتھے اس کتاب سے زمانے کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بات تو صاف صاف نظر آتی ہے کہ ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بے فکرا تھا اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ اخیر میں جب ہمارے بادشاہ نواب اور امرا اس طرف جھکے، تو وہ بھی ایسے ہی ہو گئے۔ ان لوگوں نے رہا سہا انھیں اور کھو دیا۔ ملک گیری اور ملک داری کبھی کی جا چکی تھی، اس لئے اولوالعزمی اور ہمت بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی جسمانی اور دماغی قویٰ میں انحطاط پیدا ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں حقیقی مسرت کہاں! البتہ عارضی خوش حالی اور جھوٹی زندہ دلی موجود تھی، شعر و شاعری نے اس کا سامان اور مہیا کر دیا، دیوانہ را ہوئے بس ست، شاعروں کی بن آئی، وہ تو اس شغل میں رہے، اور یہاں کام تمام ہو گیا۔ اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے، جن کے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے تھے، اس کے

خاص خاص آداب تھے، بڑے بوڑھے، نوجوان، بچے سب ہی شریک ہوتے تھے، باکمال سخن وروں کو دل کھول کے داد دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے، اور دھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ نوجوان ان مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنے کانوں سے تحسین و آفرین کے نعرے سنتے تھے، جو شعرا کے لیے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا، تو ان کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوتی تھی کسی اُستاد کے پاس حاضر ہوئے، شاگرد ہو گئے اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ گویا شعر کہنے کے لئے صرف کسی اُستاد کا شاگرد ہو جانا کافی ہے۔ یہ مشاعرے درحقیقت "شاعر گر" تھے۔ میں ان مشاعروں کو بُرا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور ادبی مجالس ہوں تو ایسی سوسائٹی کی حالت کیا ہوگی؟

علاوہ اس عام حالت کے، تذکرے میں جو بعض باتیں ضمناً بیان کر دی ہیں، وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ایک واقعہ جس کا مجھ پر بھی اثر ہوا، یہ ہے کہ نواب وزیر اودھ اُس زمانے میں جب کہ ان کا عروج اقبال تھا اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، تب بھی شاہانِ دہلی اور ان کے گھرانے کی بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے اور تعظیم بھی ایسی کہ آج کل کے نوجوانوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ چنانچہ میرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ۱۱۹۸ھ ہجری میں دلّی سے لکھنؤ چلے آئے تھے:۔

> "نواب آصف الدولہ مرحوم نے جو مراتب آداب و خدمت گزاری کے تھے، سب ادا کئے خواصی میں بیٹھنے کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے، باوصف اس نازپروری کے کہ کبھی پیادہ قدم کاہے کو چلے تھے پانچوں ہتھیار باندھے ہوئے ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ مجرا گاہ پر سے جا کر آداب بجا لاتے تھے۔"

۵-پانچویں، بعض ایسے لوگوں کا حال بھی دیا ہی جس کی نسبت اُردو کی شاعری کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کوئی کہہ سکتا ہی کہ شاہ ولی اللہ اُردو کے شاعر تھے اور اُن کا تخلص اشتیاق تھا۔ یا عبدالقادر بیدل بھی اُردو میں شعر کہتے تھے یا تاناشاہ سے بھی ایک شعر منسوب ہے جو آدھا اُردو اور آدھا ہندی ہی۔ بعض ایسے شعرا کا بھی کلام درج ہی کہ جن کا نام تو بہت مشہور ہے مگر کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنے تذکرہ آبِ حیات میں لکھتے ہیں کہ:-

"ایک موقع پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مطابق پڑا، چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے قالب میں ڈھالا ہی، اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو کی ہی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی اور چھڑیوں والوں کے جزئیات رسوم کیا کیا تھے۔ میں نے یہ مثنوی دلّی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی، اب نہیں ملتی، لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں"

حسن اتفاق سے صاحب تذکرہ نے اس مثنوی کا وہ حصّہ جس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو ہی۔ میر حسن کے حالات میں نقل کر دیا ہی۔ ناظرین کو لکھنؤ کی ہجو میں یہ شعر دیکھ کر بہت تعجب ہوگا:-

"زبس کوفہ سے یہ شہر ہم عدد ہے   اگر شیعہ کہئے نیک اس کو بد ہے"

اس مثنوی کا نام غالباً گلزارِ ارم تھا۔ میر حسن کے دوسرے کلام کا بھی انتخاب کیا ہے، درحقیقت کلام سب اچھا ہی، مگر افسوس آج کل نہیں ملتا۔

خواجہ میر درد کے بھائی، میاں سید محمد میر اثر کی مثنوی خواب و خیال اب تک سُنی ہی سُنی تھی اس کے چند شعر اثر کے حالات میں درج ہیں۔ شمس العلما مولوی شبلی نے اس پر مفصلۂ ذیل

نوٹ لکھا ہے[1] جو کتاب کے صفحہ ۳۲ پر درج ہے:-

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چوں کہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے"

ہمیں تعجب ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف "اعتراف" کا لفظ لکھا ہے حالاں کہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بے حد تعریف کی ہے، سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ "لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے" بلکہ میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف و ثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر و انیس میں انھیں اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کو جن کی نظر ظاہر بیں ہے اور سطح ہی پر رہتی ہے، مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے، حالاں کہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی عام شاعری پر، یا اردو شاعری کے نشو و نما اور اس کے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے، تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا ذکر آ گیا ہے اور اس میں دلی لکھنؤ والے دونوں ہیں، اس پر سے لوگوں نے ایسا گمان کر لیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے شائق ہیں،

---

[1] شمس العلما مولوی شبلی نے از راہ نوازش اس تذکرہ پر جا بجا نوٹ تحریر فرمائے ہیں۔

تنقید کے روادار نہیں۔ مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے، وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں، بلکہ اُردو میں فنِ تنقید کا پہلا مقدمہ ہے۔ اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے جو صرف ذوقِ سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہو سکتی ہیں، تو لوگوں کے عام (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا اور وہ بت جنھیں وہ مدت سے پوجتے چلے آرہے تھے، یکایک متزلزل ہو گئے اور ڈھ گئے۔ زیادہ تر یہ خیال گلزارِ نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا نے اس پر خواہ مخواہ اس لیے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے بلکہ درحقیقت وہ اُس رتبے کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے ناسمجھی سے اُسے دے رکھا ہے۔ مجھے تو اُلٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے، جو اگرچہ صریح اور بیّن ہیں، مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اُس کی پوری قلعی کھل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اُردو زبان سے کچھ تعلق ہی نہیں، مولانا کا اگر اس میں قصور ہے تو صرف اتنا کہ اُنھوں نے دن کو دن اور رات کو رات کہدیا ہے۔ اب ہم خواجہ اثرؔ کی مثنوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اوّل تو اس مثنوی کی تعریف سب کرتے چلے آتے ہیں، چنانچہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سا سخن فہم اپنے تذکرۂ گلشنِ بےخار میں لکھتا ہے:-

"مثنوی ایشاں شہرت تمام دارد کہ بنائے آں بر محاورہ بحت ست و ازیں جہت مرغوبِ عام۔"

مولوی محمد حسین آزاد آبِ حیات میں کہتے ہیں کہ:-

"ایک مثنوی خواب و خیال ان کی مشہور ہے اور بہت اچھی لکھی ہے۔"

دوسرے ان کے کلام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں درد،

زبان کی صفائی، شستگی اور لطافت بدرجۂ کمال موجود ہی اور یہ سب باتیں مثنوی کے لئے خاص طور پر مناسب ہیں۔ مگر صاحب تذکرہ نے غضب یہ کیا ہی کہ مثنوی کا وہ حصہ منتخب کیا، جس سے کسی طرح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ سراپا کا مضمون اس قدر متبذل ہی کہ اس میں کوئی نیا مضمون پیدا کرنا، یا اس میں زبان کی فصاحت و سلاست دکھانا بہت مشکل ہے اور چوں کہ اس مثنوی کی تعریف زیادہ تر زبان کی ہی، اس لئے صرف سراپا کے چند اشعار پر سے حکم لگانا درست نہیں ہی۔ صاحب تذکرہ نے اپنے اس ذوق کا ثبوت اور بھی ایک آدھ جگہ دیا ہی، مثلاً :-

جو شش کے کلام کو پسند نہیں کرتا، مگر انتخابی اشعار بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح مصحفی کی تعریف کی ہی، لیکن انتخاب اس قدر خراب دیا ہی کہ اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کوئی اچھا شاعر ہی لیکن اس کا کیا جواب ہی کہ جو شعر خواجہ اثر کا بہ تبدیل لفظ شوق نے اپنا کر لیا ہی یعنی:

اثر	ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا	کھلتے جاتے ہیں ڈھانپتے جانا
شوق	ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا	چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہی کہ ایسا شعر یا خواجہ اثر کہہ سکتے ہیں یا ان کے بعد نواب میرزا شوق اگر یہ شعر ان کا ہی تو یہ کہنے کی پوری وجہ ہی کہ شوق کی نظر سے یہ مثنوی گزری ہے، تو اس طرز کا اثر ضرور اس پر پڑا ہوگا۔ مولانا حالی فرماتے ہیں :-

"خواب و خیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے بہار عشق میں موجود ہیں"

یہ ایک مزید ثبوت ہی۔

دوسرے یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ مثنوی اُس زمانے میں لکھی گئی جب کہ اُردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی۔ باوجود اس کے مولانا حالی نے صاف لکھ دیا ہے :-

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں خواب و خیال کو بہارِ عشق سے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی۔"

اخیر اس میں تو ظاہرا ایک حد تک کچھ گنجائش بھی نظر آتی ہے، مگر ہمیں افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھ کر ایک ریمارک مولانا حالی کی تنقید گلزارِ نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جسے پنڈت چکبست صاحب نے اپنے دیباچہ گلزارِ نسیم میں بطور سند کے درج فرمایا ہے تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوقِ سلیم سے کوسوں دور ہیں اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں، سیکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پُر ہے۔ ہم اس موقع پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے اور اس بحث کے لئے بھی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں، موقع آ پڑا تھا اس لئے یہ چند الفاظ لکھے گئے۔

۶۔ چھٹے۔ صاحب تذکرہ نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں، جن میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً: شاہ ولی اللہ[۱] صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"قرۃ العین فی ابطال شہادت الحسنین اور جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ ان کی تصانیف سے ہیں۔"

حالاں کہ ان مباحث میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ نہ شہادت حسنین کا ابطال کیا ہے نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہے، یہ محض اتہام ہے۔ اس کے بعد یہ کہہ کر کہ "یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے" خوب ہجو ملیح کی ہے، اور آخر میں یہ لکھا ہے:۔

---

[۱] صاحب تذکرہ کو نام سے دھوکا ہوا ہے۔ یہ شاہ ولی اللہ دوسرے صاحب ہیں جن تخلص اشتیاق ہے۔ بعد کی تحقیقات سے یہ حقیقت معلوم ہوئی ہے (دیکھو نکات الشعرا صفحہ ۶ مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

"کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے۔ فی الواقع کہ عالی مقداروں کے عالی مقدار ہی ہوتے ہیں اور نابکاروں کے نابکار۔ بقول شاعر کے ؎

شیر کے بچّے میں غرّش شیر سے افزود ہے
بھونک میں کتّے کی بلّی کی سگی موجود ہے"

یا مظہر جان جاناں کے حالات میں لکھتے ہیں :۔

"۱۱۹۴ھ ہجری تھے کہ اس روشن سازِ مسائل صدیقی نے اور اس مصقلہ پرداز احکام فاروقی نے، اس آئینہ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا اور سفر خلفائے راشدین کی منازل کے طریق پر کیا۔"

یا تانا شاہ کے حالات میں مؤلف عالمگیر کی نسبت یوں گوہر فشانی کرتا ہے کہ :

"خلد مکاں نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا اور مکّہ مسجد کو کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے۔"

مکّہ مسجد کا کھدوانا نرا بہتان اور صریح جھوٹ ہے۔ تعجب ہے کہ مؤلف نے جو خود حیدرآباد میں رہا ہے، اس کذب کا لکھنا کیوں کر گوارا کیا۔ ہمیں شاید ناظرین کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں، کہ مکّہ مسجد موجود ہے اور اب تک نظر بد سے محفوظ ہے۔

لیکن قطع نظر ان امور کے وہ بعض وقت سچ کہنے سے بھی درگزر نہیں کرتا، مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں، ان کی داد و دہش اور مروّت کی بے انتہا بہتیتی کی ہے لیکن آخر میں صاف لکھ دیا ہے :

"افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی، نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ سیر و شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا

اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا"

یا سراج الدین علی خاں آرزو نے جو نکتہ چینی شیخ علی حزیں کے کلام پر کی ہے اُس کی نسبت لکھتے ہیں کہ :

"عوام کی طبیعت توان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے۔ نہیں صاف نزاع

معلوم ہوتی ہے، جب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے"

اس تذکرے کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اور خصوصاً نامور اور مشہور اساتذہ سب کے سب دلّی کے تھے۔ دلّی کو جہاں یہ فخر ہے کہ اُردو نے اس میں جنم لیا، وہاں اس کا یہ فخر بھی بجا ہے کہ جتنے اعلیٰ شاعر ہوئے ہیں وہ یہیں کے تھے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے یہ شہر بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے، زمانۂ قدیم سے محسودِ آفاق اور مرجع خلائق رہا، کبھی راجاؤں اور مہاراجاؤں کی راج دھانی، کبھی سلاطین اسلام کا دارالخلافت، کبھی طغیانی کی بدولت بہ کر خراب ہوا اور رفتہ رفتہ پھر آباد ہوا، کبھی معرکۂ جنگ و جدل و قتل عام ہے اور کبھی گھر گھر دن عید اور رات شب برات ہے، کبھی تخت گاہ شاہاں اور مرجع کمال ہے اور کبھی ایک مطلق العنان سودائی کی لٹک سے خاصہ کھنڈر ہے، کبھی موردِ بلیات و آفات ہے اور کبھی منزل حسنات و برکات؛ غرض یہ نگری یوہیں اُجڑتی اور بستی، بگڑتی اور بنتی رہی؛ مگر باوجود اس کے اس کے حسن عالم فروز میں نئی ادا پیدا ہوتی رہی اور ہر حادثے کے بعد فوراً سنبھل گئی۔ لیکن اخیر زمانے میں جب سلطنت مغلیہ میں انحطاط اور زوال کی علامات پیدا ہو گئیں، تو دو ایک دھچکے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال ہو گیا۔

سب سے اوّل نادر شاہ کا ایسا تھپیڑا لگا کہ اس نے بٹھا ہی تو دیا، اس کے سترہ برس بعد ہی احمد شاہ درّانی کی چڑھائی ہوئی، پھر مرہٹوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہا سہا سب

خاک میں ملا دیا۔ اب تک جو باکمال دلّی میں پڑے وضعداری نباہ رہے تھے۔ ان حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹک سکے سوائے ایک میر درد کے، جن کی نسبت صاحب تذکرہ لکھتے ہیں :-

”جن ایّام میں معمورہ شاہ جہان آباد کا اور ہر ایک کوچہ اُس خجستہ بنیاد کا مجمع اہل کمال سے اور کثرت منتجبان عدیم المثال سے، رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا، تو معمورے پر شہر کے عرصہ ربع مسکون کا تنگ، اور اس خراب آباد کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا۔ جب کہ متواتر نزول آفات کے باعث اور مکرر ورود بلیات کے سبب خراب ہوا، اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا، تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے اور ہر ایک صابر زاویہ گزین نے اور ہر ایک تونگر مال دار نے اور ہر امیر عالی مقدار نے، فرار کو غنیمت جانا اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا، مگر وہ سید والا تبار کہ نام نامی اُس کا خواجہ میر تھا، اس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا متحمل بلاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہوئے اور شاہجہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنے کنج عزلت سے نہ گئے“۔

ایسے وقت میں شاعر بیچارے تو کس گنتی میں ہیں، بڑے بڑے وضعداروں اور متوکلوں کی ٹیک نکل جاتی ہے۔ دلّی کے اُجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا۔ اقبال نے کچھ دنوں اس کا ساتھ دیا۔ اب لے دے کے صرف یہی ایک ٹھکانا اور آسرا مسلمانوں کا رہ گیا تھا: آصف الدولہ سا لکھ لٹ نواب تھا، اہل کمال کی قدر ہونے لگی، پھر تو جو اُٹھا وہیں پہنچا اور پہنچ کر وہیں کا ہو رہا۔ غالباً سب سے پہلے نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو پہنچے۔ اس کے بعد سودا تشریف لے گئے، سودا کے انتقال کے بعد میر تقی نے ۱۷۸۲ء میں دلّی سے لکھنؤ کو کوچ فرمایا۔ میر صاحب کے جاتے ہی دلّی سونی ہو گئی اور میر حسن، میر سوز، جراُت۔ سب لکھنؤ میں جا بسے، اور دلّی کی رونق لکھنؤ میں آ گئی۔ اس طرح لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی،

اب یہ امر کہ لکھنؤ کی سوسائٹی کا اُردو زبان اور اُردو شاعری پر کیا اثر ہوا اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے۔

مجھے خیال تھا کہ اس تذکرے سے میر انشاء اللہ خاں کے متعلق کوئی نئی بات معلوم ہوگی اور کم سے کم اُس قصّے کی تحقیق ہوجائے گی جو شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے ان کے اخیر زندگی کے متعلق لکھا ہے، مگر یہ تذکرہ ۱۲۱۵ھ ہجری میں لکھا گیا، اور ۱۲۱۵ھ تک میر انشاء اللہ خاں میرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے یا اُسی سال نواب سعادت علی خاں کے ہاں رسائی ہوئی، کیوں کہ میرزا سلیمان شکوہ اس سال (۱۲۱۵ھ) لکھنؤ سے واپس دلّی چلے گئے۔ یہ واقعہ آزاد نے سعادت یار خاں رنگیں کی زبانی بیان کیا ہے، صرف یہ لکھ کر تمام واقعہ بیان کر دیا ہے کہ: "سعادت یار خاں رنگیں کہا کرتے تھے" مگر یہ نہ معلوم ہوا کس سے کہتے تھے اور آزاد نے کس سے سنا۔ آب حیات میں بعض بعض جگہ وہ مجالس رنگیں کا حوالہ دیتے ہیں مگر مجالس رنگیں میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اتفاق سے مجالس رنگیں بھی ۱۲۱۵ھ میں لکھی گئی۔ میر انشاء اللہ خاں اور سعادت یار خاں رنگیں دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے اور چوں کہ یہ واقعہ بہت بعد کا ہے اس لئے یوں بھی اس میں نہیں ہو سکتا۔ کیا اچھا ہوتا اگر مولوی محمد حسین آزاد اس روایت کا سلسلہ بیان کر دیتے۔

مؤلف نے اپنے دیباچہ میں بیان کیا ہے:۔

"یہ کتاب ہم نے دو حصّوں میں لکھی ہے، یہ پہلا حصّہ ہے جس میں سلاطین نامدار، امرائے عالی مقدار، اور شعرائے صاحب وقار کے حالات لکھے گئے ہیں، دوسری جلد میں غیر مشہور شعرا کا تذکرہ ہوگا۔"

اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں کہ لکھی گئی تھی یا نہیں۔

مؤلف نے شعرا کا کلام جو بطور انتخاب کے درج کیا ہے اُس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے۔ صرف اعلیٰ درجہ کے اشعار رکھے ہیں، مگر جن شعرا کا کلام نہیں چھپا ان کے کلام کو بجنسہ ویسا ہی رہنے دیا ہے۔ خود مولّف نے اپنے کلام سے صفحہ کے صفحے رنگ دیئے تھے، اس میں بھی انتخاب کر دیا گیا ہے۔ اب مجھے اس تذکرے کے متعلق اس قدر اور کہنا باقی ہے کہ اس کے طبع ہونے سے اُردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا، اور جو لوگ اُردو زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اس کی اشاعت میں کوشش فرمائیں گے۔

عبدالحق بی اے (پرنسپل مدرسۂ آصفیہ)
حیدرآباد دکن، اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء

مقدمہ

بر تذکرۂ گلزارِ ابراہیم

(از ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری صاحب "زور" ایم اے پی ایچ ڈی)

گلزارِ ابراہیم اُردو شاعروں کے اُن تذکروں میں سے ہے، جو معلومات کی وسعت اور صحت دونوں کے لحاظ سے درجۂ اوّل کے تذکرے کہے جاسکتے ہیں خصوصاً صحت حالات کے مدّنظر شاید ہی کوئی تذکرہ اس پر فوقیت رکھتا ہو۔

اُردو شاعروں کے جس قدر تذکرے اس وقت تک لکھے گئے ہیں ان میں بعض تو وہ ہیں، جو کسی بڑے شاعر کے نتیجۂ قلم ہیں، اکثر وہ ہیں، جن کے مصنف خود بڑے شاعر نہیں، لیکن کسی بڑے شاعر کے گرویدہ شاگرد تھے اور چند وہ ہیں جن کے مصنفوں کو سخن گو نہیں، بلکہ سخن فہم کہا جاسکتا ہے۔

ان تینوں قسم کے تذکروں میں چند خاص خاص نوعیتوں کے اصولی نقایص ہیں:۔

قسمِ اول کے مصنف چوں کہ خود بڑے شاعر ہیں۔ اس لئے اُن میں زیادہ تر مشہور شاعروں ہی کا تذکرہ کیا گیا ہے، معمولی شاعر بالکل نظرانداز کردیئے گئے ہیں، جن شاعروں کو مصنف نے قابلِ ذکر سمجھا بھی اُن کے ذاتی حالات کی طرف توجہ کرنے کی جگہ صرف اُن کی شعر شاعری پر تنقید کرنے کی کوشش کی ہے

اس طرح سے یہ تذکرے بجائے تذکرے بننے کے ادبی تنقیدیں بن کر رہ گئے۔

دوسری قسم کے تذکرے اگرچہ چھوٹے بڑے سب شاعروں کو فراخ دلی سے پیش کرتے ہیں، لیکن اُن میں ان سب پر جس حیثیت سے نظر ڈالی جاتی ہے وہ نہایت گمراہ کُن ہوتی ہے۔ اُن کی تحریر کا سب سے اہم مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے اُستاد اور اُن کے دوستوں، یا اپنے استاد بھائیوں یا دوست شاعروں کو روشنی میں لایا جائے۔ اس مقصد کے مدنظر انھیں بے جا مبالغوں اور طرف داریوں سے بھی کام لینا پڑتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن جن کو وہ اپنے تذکرے میں پیش کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے صحیح خط و خال کے ساتھ نہیں دکھائی دیتے بلکہ ایک ہی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ ان پر مصنوعی رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں اور جب اس طرح مصنف کا اعتبار کم ہو جاتا ہے تو یہ معلوم کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے کہ اس کی کس بات کو صحیح سمجھا جائے اور کس کو غلط۔

تیسری قسم کے تذکرے بہت کم ہیں۔ لیکن جو بھی ہیں اُن سے زیادہ تر شاعروں کا اصلی رتبہ اور ان کی شاعری کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے نہ کہ اُن کی زندگی کے حالات کا۔ کیوں کہ اُن کا مقصدِ تحریر ادبی تنقید کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔

یہ واقعی اُردو شاعروں کی بدقسمتی ہے کہ کسی نے بھی ایک ٹھیٹ مورّخ بن کر اُن کے حالات کو قلم بند نہیں کیا۔ لیکن اگر اس طرح کی کوئی کوشش ملتی ہے تو وہ صرف علی ابراہیم کا زیرِ بحث تذکرہ ہے جو اگرچہ ٹھیٹ تاریخی نقطۂ نظر سے نہیں لکھا گیا ہے، تاہم اس لحاظ سے اُردو کے سب تذکروں سے بہتر ہے۔

(ب) گلزارِ ابراہیم تیسری قسم کے تذکروں میں شامل ہے۔ اس میں نہ تو شاعرانہ ترنگوں کے مدِنظر معمولی شاعروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور نہ کسی خاص شاعر یا اُن

کے دبستان شاعری کی وکالت یا مخالفت کی گئی ہے۔ علی ابراہیم یوں بھی طبعاً منصف مزاج تھے، اُن کو شاعری کا صحیح ذوق تھا، اور نہ صرف یہی بلکہ اُن کی ان فطری مناسبتوں کو اُن کے پیشے، منصب اور ماحول نے اور بھی پختہ اور راسخ کر دیا تھا۔ اُن کے متعلق اُن کے حکام دوستوں اور دوسرے معاصروں کی جو خانگی تحریریں اس وقت موجود ہیں اُن کے دیکھنے سے اُن کے اعلیٰ کردار کے متعلق نہایت اچھا خیال پیدا ہوتا ہے خصوصاً اس زمانہ کی تمام مشہور شخصیتوں کے جو حالات سدا سکھ دہلوی کے ایک غیر جانبدار قلم سے لکھے گئے ہیں اور جو اس وقت برٹش میوزیم کے مخطوطوں میں محفوظ ہیں، صرف ان ہی کا مطالعہ علی ابراہیم کے ان عمدہ صفات کی شہادت کے لئے کافی ہے۔

غرض گلزار ابراہیم میں طرف داری یا رنگ آمیزی کا کوئی شائبہ نہیں، اس کے علاوہ علی ابراہیم اُردو کے وہ واحد تذکرہ نویس ہیں، جنھوں نے شاعری کے حالات اور اُن کے متعلق تاریخیں جمع کرنے کی حتی الامکان کوششیں کیں، اور خوبی یہ ہے کہ اُن کی کوششیں جس حد تک بار آور ہو سکتی تھیں اور ہوئیں اتنی کسی اور تذکرہ نویس کی نہیں ہو سکتی تھیں اور نہ ہو سکیں۔

(ج) اُردو کے دوسرے (خصوصاً ۱۲۰۰ ہجری سے قبل کے) تذکرہ نویسوں نے شاعروں کی پیدائش، وفات یا دوسرے اہم واقعات کی تاریخیں لکھنے کا بالکل خیال نہ کیا۔ یہ چیزیں یوں بھی اُن کے مذاق شعری کے لئے بار گراں تھی، لیکن اگر کوئی اُن کی طرف توجہ بھی کرتا تو وہ علی ابراہیم کے برابر کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

علی ابراہیم انگریزی سرکار کے ملازم تھے، وہ مغربی طرز کی تحریروں اور مغربی مذاق سے روشناس ہو گئے تھے اور چوں کہ وہ ایک ذی اقتدار حاکم تھے، اپنے مذاق اور مرضی کے مطابق مواد فراہم کرنے میں انھیں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے علاوہ اپنے ماتحتوں اور

ملازمین سے بھی مدد ملی، جو اپنے حاکم کو خوش رکھنے کی خاطر اس کام کی طرف فطرتاً زیادہ سے زیادہ توجہ کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ چوں کہ وہ صاحب ثروت اور ذی اثر آدمی تھے اُنھوں نے دور دور کے شاعروں سے بھی اُن کے یہاں آدمی روانہ کر کے یا ڈاک کے ذریعہ سے حالات طلب کئے۔

ان چند اہم امور کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اور گلزار ابراہیم کی خصوصیات پر نظر ڈالنے سے پہلے اس کے اس نقص کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہی کہ وہ ٹھیٹ پُرانے طریقے پر لکھا گیا ہے، اگر علی ابراہیم شاعروں کے حالات اُن کے تخلصوں کے حروف تہجی کے لحاظ سے نہ لکھتے بلکہ اُن کے زمانوں کے لحاظ سے لکھتے تو یہ تذکرہ غالباً اُردو کا ایک بہترین تذکرہ بن جاتا۔

(۲)

گلزار ابراہیم اُردو کے اُن چند تذکروں میں سے ہی جو ۱۲۰۰ھ سے پہلے لکھے گئے تھے اگرچہ اس سے بیس پچیس سال قبل ہی میر، گردیزی اور قائم وغیرہ کے تذکرے لکھے جا چکے تھے حیرت ہے کہ علی ابراہیم نے اپنے دیباچے میں ان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ انھیں اس کا علم نہ تھا، کیوں کہ اُنھوں نے صاف صاف یہ تو نہیں لکھا کہ اس وقت تک اُردو شاعروں کا کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا ہے اس کے برخلاف خود اُن کے تذکرے میں ایک دو ایسے تذکروں کا بھی ذکر ہے (دیکھو ذکر 'ذہین' اور 'فخر') جو اس وقت غالباً موجود نہیں ہیں۔

یہ معلوم نہیں ہوتا کہ علی ابراہیم نے اس تذکرے کو ٹھیک کس تاریخ سے لکھنا شروع کیا وہ اس سے پہلے فارسی کے دو تذکرے لکھ چکے تھے۔ چنانچہ دیباچے میں گلزار ابراہیم کی وجہ تصنیف اور تاریخ تحریر وغیرہ کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"آشنائے درد و خاکپائے سخن سنجان علی ابراہیم خاں باوصف تالیف دو تذکرۂ اشعار فارسی باستدعائے بعضے محبّان یک دل ویک رو موزوں طبعان ریختہ گو بخاطر آورد کہ برخے از اشعار ریختہ' باضبط احوال واوصاف گویندگان بسلک تحریر پیوند دہد - الحمد لواہب العطایا کہ در زمان سلطنت .... شاہ عالم .... وآوان وزارت .... آصف الدولہ .... و در عہد حکومت .... وارن ہشتن (وارن ہسٹنگز) .... این ماموں بحصول انجامید وبسال یک ہزار وہفت صد وہشتاد وچہار عیسوی ویک ہزار ویک صد و نود وہشت ہجری از تسوید آں فراغ حاصل شد ....."

اگرچہ اس عبارت سے تاریخ اختتام ۱۱۹۸ھ ہجری معلوم ہوتی ہے لیکن کتاب کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ وہ بعد میں بھی اضافے کرتے رہے - نیز یہ کہ اس سے کئی سال پیشتر ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا - انھوں نے یہ کام بڑا اچھا کیا کہ اکثر جگہ شاعروں کے حال کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ذکر فلاں سن میں لکھا جا رہا ہے - اس کی وجہ سے آئندہ بہت سی تاریخی غلط فہمیوں اور شبہوں کے دور ہونے کی امید ہے -

(ب) گلزار ابراہیم کے صرف ایک سرسری مطالعے ہی سے کوئی شخص اس کی اس عدیم المثال خصوصیت سے واقف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں شاعروں کے حالات لکھتے وقت نہایت ہی معتبر اور مستند ذریعوں سے مدد لی گئی ہے - علی ابراہیم نے دوسرے تذکرہ نویسوں کی طرح صرف سُنی سنائی باتیں نہیں لکھ دیں بلکہ اکثر شاعروں سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے کئی ایسے شاعر ہیں جو خود اُن کے عزیز تھے - بعض عزیزوں کے دوست تھے - بعض بچپن کے ملاقاتی تھے' بعضے اُن کے ماتحت دفتروں میں ملازم تھے اور بعضوں کے مقدمے

اور کارروائیاں اُن ہی کے ہاتھوں سرانجام پائی تھیں۔

اس قسم کے شاعروں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ یہاں اُن کی فہرست پیش کرنا باعث طوالت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جن سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے اُن کے حالات وہ اپنی ہی یاد اور معلومات کی بنا پر لکھ سکتے تھے یا خود اُن کے دوست ان کو لکھ کر دے سکتے تھے مثلاً :-

۱۔ شیخ محمد عابد۔ دل۔ بسبب محبتے کہ با راقم آثم دارند، ہنگام تالیف ایں مجموعہ مشارٌ الیہا خلاصۂ دیوان خود را در مرشدآباد ۱۲۹۳ھ ہجریہ فرستادند.....‘‘

۲۔ مرزا محمد علی فدوی دہلوی ’’با راقم آشناست۔ اشعار منتخبۂ خود را بنا بریں کہ در تذکرہ اثبات یابد فرستادہ بود.....‘‘

۳۔ غلام محمد، دوست، بہاری ’’..... با راقم حقیر در مرشدآباد ملاقات کردہ ..... از اشعار خود قریب صدبیت وانمود.......‘‘

۴۔ شیخ فضل علی۔ شاہ دانا۔ دہلوی ’’..... ہنگام تدوین ایں تذکرہ اشعار خود را بمؤلف فقیر داد کہ در تذکرہ ارتسام یابد......‘‘

۵۔ شیخ غلام یحییٰ حضور، عظیم آبادی ’’........ ہنگام تدوین ایں تذکرہ منتخب کلام خود را دادہ کہ دریں صحیفہ انضمام یابد........‘‘ وغیرہ

لیکن جن سے ذاتی طور پر واقف نہ تھے اُن کے حالات بھی علی ابراہیم نے نہایت کدوکاوش سے جمع کیے۔ جو شاعر وفات پا چکے تھے اُن کے متعلق اُن کی اولاد اور عزیزوں سے معلومات حاصل کیں اور جو زندہ تھے اُن سے اشعار اور حالات لینے کا ہر ممکنہ ذریعہ اختیار کیا مثلاً :-

۱۔ رستم علی خاں، احتشام الدولہ، نواب بہادر۔ رستم ’’ ... ہر چند راقم حقیر را تا تحریر ایں

اوراق بامشارٌ الیہما اتفاق ملاقات ظاہر نیست اما بہ سماعت صفات حمیدہ الیشان تعارفی بہم رسانیدہ در بنارس سنہ ۱۱۹۶ ہجریہ برسم اخلاص، اشعار مشارٌ الیہما طلبیدہ در حرف الرأ و حرف المیم ترقیم نمود......"

۲ - بہاری داس - عزیز "...... والحال کہ سال...... (۱۱۹۶) احوال و پارۂ اشعار خود را از الہ آباد بایں خاکسار فرستادہ......"

۳ - نواب محبت خاں - محبت "..... در لکھنؤ اقامت و مراسلہ با راقم دارد چنانچہ در کمال محبت اشعار خود را با مثنوی موسوم باسرار محبت، کہ حکایت..... فرستادہ....."

۴ - موتی لال صیف "..... اشعارش در سال مذکور از آنجا طلبیدہ تحریر یافت....."

۵ - خواجہ برہان الدین - آثمی - دہلوی "...... ایں چند بیت از میر حاجی خلف خواجہ مذکور بدست آمدہ......"

اس سلسلے میں اس امر کا اظہار بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ علی ابراہیم نے بعض شاعروں کی روانہ کردہ عبارتیں بھی بعینہٖ نقل کر دی ہیں جن میں سے میر سوز اور میر حسن کے حسب ذیل بیانات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

۱ - میر سوز "....... میر سوز شخصے است کہ ہیچ کس را از و حلاوتے جز سکوت و اکراہ حاصل نشود - ایں نیز از قدرت کمال الٰہی است کہ ہر یکے بلکہ خار و خسے نیست کہ بکار چند نیاید - پس اگر منکرے سوال کند کہ ناکارۂ محض نیفتادہ است این است کہ نامش سوختنی است"

۲ - میر حسن "...... از سائر اقسام اشعار، ابیات مدونۂ من قریب ہشت ہزار بیت است و تذکرۂ در ریختہ نوشتہ و اصلاح سخن از میر ضیا گرفتہ ام - و مدتیست از دہلی وارد لکھنؤ گشتہ با نواب سالار جنگ و خلف الصدق الشان ملقب بمرزا نوازش علی خاں بہادر

سرفراز جنگ می گزرانم"۔

ساتھ ہی گلزار ابراہیم کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ جہاں کسی کے متعلق معلومات نہ ہو سکیں اس کا بھی موقع بموقعہ ذکر کر دیا ہے مثلاً:۔

۱۔ رضا "...... تا تحریر ایں اوراق احوالش معلوم نیست، شعر بسیارے از وے دیدہ شد......"

۲۔ میر امام الدین دہلوی رسید "...... راقم حقیر او را ندیدہ۔ اما زبانی بعضے از دوستان شنیدہ کہ سنجیدہ اطوار بود......"

۳۔ رسا ے "...... احوالش ہنگام تحریر ایں اوراق معلوم نشد......" وغیرہ

(ج) اردو تذکروں میں ایک عام خامی یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعہ سے شاعروں کے خانگی حالات اور کردار و معاشرت پر بہت کم روشنی پڑتی ہے اور گلزار ابراہیم کی یہ خصوصیت بھی آیندہ ادب اردو کے طالب علموں کی تحقیق و تفتیش میں بہت مفید ثابت ہو گی کہ اس میں ایسی ایسی معلومات بھی ہیں جو بالعموم قلمبند نہیں کی جاتیں مثلاً:۔

۱۔ میر مظفر علی۔ آزاد دہلوی "راقم حقیر میر مذکور را در مرشد آباد دیدہ۔ در ہنگامے کہ بہ نزاکت نام کنیزے عاشق و منازعہ با پنا بیگم داشت، معاملۂ او مرجوع با حقیر بود۔"

۲۔ مرزا علی رضا۔ رضا "...... و بر وہب علی نامی عاشق است، و مثنوی در بیان عاشقی او دارد......"

۳۔ مہتاب رائے۔ رسوا "...... بر منوں نامی عاشق شدہ از افراط محبت کاوش برائے ہوائے کشیدہ عریاں می گشت و با ہر کہ دو چار شد میاں می گفت و می گریست......"

۴۔ میر عبد الحی۔ تاباں "جوان رعنائے، منظور ناظراں، خاصۂ مقتول سلیمان نامی بود

زیبائی او روشن تر از سخن سرائی او بود......"

۵ - محمد افضل "....... بر گوپال نامی عشق ورزیده حسب حال خود بارہ ماسہ مشہور بکیکنٹھ کہانی منظوم نمودہ......."

۶ - محمد چاند - رخشاں "....... بر زعفران نامی عاشق شدہ......" وغیرہ

(د) ان خانگی باتوں کے علاوہ بعض ایسے امور بھی اس تذکرے میں ملتے ہیں جو اُردو شاعری کی تاریخ میں ضرور اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے جہاں خاص خاص شاعروں کی شعری پیداوار کے متعلق علم ہوتا ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۰۰ھ ہجری سے قبل ہی شمال میں اُردو شاعری کہاں تک ترقی حاصل کر چکی تھی، اس میں کون کون سی اصناف شاعری کس حد تک رائج تھیں اور شاعروں کا خزانہ کہاں تک وسیع ہو گیا تھا۔

یہ بات ضرور قابل ذکر ہے کہ اس وقت تک اُردو میں مرثیہ گوئی کو خاص ترقی ہو چکی تھی۔ اس امر کے جس قدر ثبوت گلزار ابراہیم سے حاصل ہوتے ہیں اُس زمانے کے شاید ہی کسی اور تذکرے سے مل سکیں۔ حسب ذیل چند مثالوں سے معلوم ہو گا کہ اُس وقت مرثیہ گوئی کس قدر عام ہو گئی تھی اور کون کون سے شاعر اس میں مشغول تھے:-

۱ - خواجہ برہان الدین - امثی - دہلوی "....... از مشاہیر مرثیہ گویان دہلوی است....."

۲ - اسدیار خاں - انسان دہلوی "......... بیشتر بمرثیہ گفتن رغبت دارد....."

۳ - مرزا ظہور علی - خلیق دہلوی "....... در موسیقی ہندی و مرثیہ خواندن بغایت مہارت دارد........"

۴ - خلیفہ سکندر - سکندر "...... در مرثیہ گفتن کمال اقتدار و سلیقہ درستی دارد۔ اکثر در زبان پوربی و مارواڑی و پنجابی مرثیہ گفتہ......"

۵ - شاہ قلی خاں۔ شاہی "...... بیشتر مرثیہ می گفت "

۶ - میر محمد علی، صبر فیض آبادی "...... بیشتر مرثیہ می گوید......" وغیرہ

مرثیہ کے علاوہ مثنویوں اور دیگر نظموں کے متعلق بھی گلزار ابراہیم سے کافی معلومات ہوتی ہیں مثلاً :-

۱ - میر سعادت علی - سعادت - امروہی "...... مثنوی سیلی سجنوں کہ در زبان نواب قمر الدین خاں وزیر دو عاشق و معشوق در دہلی گذشتہ اند، گفتہ و در اشعار رعایت ایہام می کرد۔"

۲ - میر محمد سلیم - سلیم عظیم آبادی "...... مثنوی در ریختہ مشتمل بر سانحۂ عجیب واقعہ ناحیۂ عظیم آباد ترتیب دادہ کہ خالی از حالتے نیست ......"

۳ - افضل الدین خاں فیضی - دکنی "...... در تعریف یکے از شاہزاد ہائے دکن - مثنوی بمحاورۂ دکن گفتہ ......"

۴ - فدوی - لاہوری "...... یوسف زلیخا بہ زبان ریختہ گفتہ و میر فتح علی شیدا، در ہجو او قصہ بوم بقال ضبط نمودہ ......"

۵ - کمترین - دہلوی "...... شہر آشوبے در ہجو ہر قوم گفتہ ......"

۶ - حمایت علی مجنون "...... ساقی نامہ محکم ...... گفتہ ......"

۷ - حافظ فضل علی - ممتاز دہلوی "مثنوی در تعریف لاٹھی بہ بحر مخزن اسرار گفتہ ....."

۸ - محمد اشرف "اشرف "...... ٹیر نامہ بوے منسوب است ......"

۹ - گدا علی بیگ بسمل "...... مثنوی وبدک نامہ از وے شہرتے دارو ....." وغیرہ

(۵) گلزار ابراہیم کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہی کہ اس وقت اودھ کے مغرب میں اردو شعر و شاعری نے جو ترقی حاصل کی تھی اس کا یہ کم و بیش ایک مکمل تذکرہ ہے

مرشد آباد اور عظیم آباد کے رہنے والے شاعروں کے علاوہ ان اہل کمالوں کا بھی اس میں ضمناً ذکر آگیا ہے، جو ہندوستان کے متفرق حصّوں سے وہاں پہنچے۔
عظیم آباد اور مرشد آباد کے علم وفضل یا شعر وسخن پر جو کچھ بھی آئندہ لکھا جائے گا اس کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکے گی جب تک گلزار ابراہیم کے مواد سے مدد نہ لی جائے۔

(۳)

گلزار ابراہیم کی خصوصیتوں کے متعلق چند نوٹ پیش کر دینے کے بعد غالباً یہ ضروری ہے کہ اس کے ترجمے گلشن ہند کے متعلق بھی کچھ لکھا جائے۔
علی لطف نے اس پوری کتاب کا ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن انھوں نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلے حصہ میں "سلاطین نامدار" وزرائے والا تبار، امرائے عالی مقدار اور شعرائے صاحب وقار" کے حالات جمع کئے ہیں جو اتفاق سے حیدرآباد دکن میں ہاتھ لگ گیا اور چند صاحب قدروں کی متفقہ کوشش سے اشاعت بھی پا گیا۔ لیکن دوسرا حصہ جس میں نومشق اور گم نام شاعروں کے حالات تھے، نہ معلوم مرتب بھی ہوا تھا یا نہیں۔
گلزار ابراہیم میں کل ۳۲۰ شاعروں کا ذکر ہے جس میں سے علی لطف نے اپنے ترجمے کے پہلے حصہ کے لئے صرف ۶۸ شاعروں کا انتخاب کیا تھا۔ مطبوعہ گلشن ہند کے ۶۸ شاعروں کے علاوہ گلزار ابراہیم میں جن جن شعراء کا تذکرہ ہے ان کی ایک فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے، تاکہ اس امر کا علم ہو سکے کہ اگر علی لطف نے دوسرا حصہ لکھا بھی تھا تو اس میں کون کون سے شاعر شامل تھے یہ بھی کہ سنہ ۱۲۰۰ھ سے قبل اردو کے کون کون سے شاعر ایسے تھے جن کا علی ابراہیم جیسے مصنف نے بھی ذکر لکھنا ضروری سمجھا نیز یہ کہ وہ کون ہیں جو علی لطف کی نظروں میں نومشق یا گم نام قرار

پائے تھے:۔

۱- افضل - محمد افضل
۲- احمد گجراتی
۳- امجد
۴- انصاف
۵- اشرف
۶- اشرف - محمد اشرف
۷- آزاد - خواجہ زین العابدین
۸- آزاد - میر مظفر علی دہلوی
۹- افصح - شاہ فصیح
۱۰- آثمی - خواجہ برہان الدین دہلوی
۱۱- انسان - اسد یار خاں
۱۲- احسن - احسن اللہ
۱۳- آشنا - میر زین العابدین دہلوی
۱۴- آشنا
۱۵- الہام - فضائل بیگ
۱۶- آگاہ - محمد صلاح دہلوی
۱۷- آگاہ - نور خاں
۱۸- افغان - الف خاں
۱۹- انگار - میر حیون
۲۰- امیر - محمد یار خاں
۲۱- اکرم - خواجہ محمد اکرم دہلوی
۲۲- اسد - میر امانی دہلوی
۲۳- اولاد - میر اولاد علی
۲۴- انور - غلام علی
۲۵- اجمل - شاہ محمد اجمل الہ آبادی
۲۶- اعظم - محمد اعظم
۲۷- اعلیٰ - میر اعلیٰ علی
۲۸- اظہر - میر غلام علی دہلوی
۲۹- امامی - خواجہ امام بخش عظیم آبادی
۳۰- اولیا - میر اولیا مہانی
۳۱- احمدی - شیخ احمد وارث
۳۲- انتظار - علی نقی خاں دہلوی
۳۳- آہ - میر مہدی
۳۴- احسان - میر شمس الدین
۳۵- بہار - ٹیک چند
۳۶- بے نوا
۳۷- شاہ بیچا
۳۸- بے قید - سید فضائل علی خاں۔

۴۰۔ پیام۔ شرف الدین علی خاں۔
۴۰۔ بھکاری لال
۴۱۔ بیرنگ۔ دلاور خاں
۴۲۔ بےکل۔ عبدالوہاب اورنگ آبادی
۴۳۔ بیتاب۔ محمد اسمعیل
۴۴۔ بیتاب۔ سنتوکھ سنگھ
۴۵۔ بیتاب۔ شاہ محمد علیم
۴۶۔ پاک باز۔ میر صلاح الدین
۴۷۔ پروانہ۔ سید پروان علی مرادآبادی
۴۸۔ پروانہ۔ راجہ جسونت سنگھ
۴۹۔ بسمل
۵۰۔ بسمل۔ گدا علی بیگ
۵۱۔ تاباں۔ میر عبدالحی
۵۲۔ تمکین۔ میر صلاح الدین دہلوی
۵۳۔ تقی۔ سید محمد تقی دہلوی
۵۴۔ قصور
۵۵۔ تصویر۔ شاہ جواد علی مرادآبادی
۵۶۔ تمنا۔ خواجہ محمد علی عظیم آبادی
۵۷۔ ثاقب۔ شہاب الدین
۵۸۔ ثابت۔ شجاعت اللہ خاں
۵۹۔ ثابت۔ اصالت خاں
۶۰۔ جواب۔ کاظم علی دہلوی
۶۱۔ جوہر۔ مرزا احمد علی دہلوی
۶۲۔ جودت۔ ہردے رام مرشدآبادی
۶۳۔ جرأت۔ میر شیر علی
۶۴۔ جولاں۔ میر رمضان علی
۶۵۔ میاں جگنو
۶۶۔ جان عالم خاں
۶۷۔ جنون
۶۸۔ جنون۔ شیخ غلام مرتضیٰ الہ آبادی
۶۹۔ حشمت۔ میر محتشم خاں
۷۰۔ حشمت۔ محمد علی
۷۱۔ حیدر۔ غلام حیدر
۷۲۔ حیدر۔ علی شاہ دکنی
۷۳۔ حبیب اللہ
۷۴۔ حیرت۔ مراد علی۔ مرادآبادی
۷۵۔ حیدری۔ شیخ غلام علی
۷۶۔ میر عابد

۷۷ - حضور - دہلوی
۷۸ - حضور - شیخ غلام یحییٰ
۷۹ - حسن میر محمد حسن دہلوی
۸۰ - حسن - میر محمد حسن
۸۱ - حیف موتی لال
۸۲ - خلیق - مرزا ظہور علی دہلوی
۸۳ - خادم - خادم حسین خاں عظیم آبادی
۸۴ - دانا - شیخ فضل علی شاہ
۸۵ - درد - میر کرم اللہ خاں
۸۶ - دوست غلام محمد
۸۷ - داؤد - داؤد بیگ
۸۸ - دل - شاہ فتح محمد
۸۹ - درخشاں - منگو بیگ
۹۰ - ذہین - میر مستعد
۹۱ - ذاکر - حسین دوست مرادآبادی
۹۲ - رند - شاہ حمزہ علی دہلوی
۹۳ - راغب - محمد جعفر خاں دہلوی
۹۴ - رفعت - شیخ محمد رفیع الہ آبادی
۹۵ - رسوا - مہتاب رئے
۹۶ - رسائی
۹۷ - رخشاں - محمد چاند
۹۸ - رضا - میر رضا عظیم آبادی
۹۹ - رضا - مرزا علی رضا
۱۰۰ - رضا -
۱۰۱ - راقم - بندرابن
۱۰۲ - رنگین
۱۰۳ - رنگین مرزا امان بیگ -
۱۰۴ - رشید
۱۰۵ - رضی - سید رضی خاں
۱۰۶ - رستم - رستم علی خاں احتشام الدولہ
۱۰۷ - رخصت - میر قدرت اللہ دہلوی
۱۰۸ - رند - مہربان خاں -
۱۰۹ - زکی - جعفر علی خاں دہلوی
۱۱۰ - زار - مغل بیگ
۱۱۱ - زار - میر مظہر علی دہلوی -
۱۱۲ - سوزاں - احمد علی خاں شوکت جنگ
۱۱۳ - سراج میر سراج الدین اورنگ آبادی
۱۱۴ - سلیمان

۱۱۵ - سامان - میر ناصر جونپوری
۱۱۶ - سعادت - میر سعادت علی خاں
۱۱۷ - سیّد - میر امام الدین دہلوی
۱۱۸ - سیّد - میر یادگار علی
۱۱۹ - ساقی - میر حسین علی
۱۲۰ - سکندر - خلیفہ سکندر
۱۲۱ - سلیم - میر محمد سلیم عظیم آبادی
۱۲۲ - شاہی - شاہ قلی خاں دکنی
۱۲۳ - شاکر - محمد شاکر
۱۲۴ - میر شاہ علی خاں دہلوی
۱۲۵ - شفار - حکیم یار علی
۱۲۶ - شاعر - میر کلو -
۱۲۷ - شیدا - میر فتح علی -
۱۲۸ - شوق - حسین (حسن) علی
۱۲۹ - شاداب - لالہ خوش وقت رائے
۱۳۰ - شہرت - مرزا محمد علی دہلوی
۱۳۱ - شافی - امین الدین خاں
۱۳۲ - شہید - غلام حسین
۱۳۳ - شرف - میر محمدی
۱۳۴ - شفیع - میر محمد شفیع
۱۳۵ - صمصام الدولہ - خواجہ محمد عالم
۱۳۶ - صنعت - مغل خاں
۱۳۷ - صفدری حیدر آبادی
۱۳۸ - صادق - میر جعفر خاں
۱۳۹ - صبر - محمد علی فیض آبادی
۱۴۰ - ضمیر - سید ہدایت علی خاں
۱۴۱ - ضاحک - میر غلام حسین
۱۴۲ - طپش - دہلوی
۱۴۳ - طالع - شمس الدین
۱۴۴ - طرز - گردھاری لال
۱۴۵ - ظاہر - خواجہ محمد خاں
۱۴۶ - ظہور - لالہ شیو سنگھ
۱۴۷ - عارف - محمد عارف
۱۴۸ - عمدہ - سیتا رام
۱۴۹ - عاصی - نور محمد - برہان پوری
۱۵۰ - عاجز - عارف علی خاں
۱۵۱ - عمرہ - معتبر خاں دکنی
۱۵۲ - عزیز - بھکاری داس

۱۵۳ - عظیم - محمد عظیم
۱۵۴ - عاشق - میر یحییٰ دکنی
۱۵۵ - عاشق - علی اعظم خاں
۱۵۶ - عاشق - میر برہان الدین
۱۵۷ - عاشق - منشی عجائب رائے
۱۵۸ - غالب - سید الملک اسد اللہ خاں
۱۵۹ - غریب - میر تقی دہلوی
۱۶۰ - فارغ - دہلوی
۱۶۱ - فضل - شاہ فضل علی دکنی
۱۶۲ - فضلی - افضل الدین خاں دکنی
۱۶۳ - فرخ - میر فرخ علی
۱۶۴ - فراق - مرتضیٰ قلی خاں دکنی
۱۶۵ - فراق - ثناء اللہ دکنی
۱۶۶ - فدا - سید ناصر الدین
۱۶۷ - فرحت - مرزا الف بیگ
۱۶۸ - فدوی - لاہوری
۱۶۹ - فخر - میر فخر الدین
۱۷۰ - فروغ - میر علی اکبر
۱۷۱ - فیض - میر فیض علی
۱۷۲ - فریاد - لالہ صاحب رائے
۱۷۳ - قبول - عبد الغنی بیگ
۱۷۴ - قدر - محمد قدر علی
۱۷۵ - قسمت
۱۷۶ - قلندر - لالہ بدھ سنگھ
۱۷۷ - قربان - میر حسین
۱۷۸ - قناعت - مرزا محمد بیگ
۱۷۹ - کمترین - دہلوی
۱۸۰ - شاہ کاکل دہلوی
۱۸۱ - کافر - میر علی نقی دہلوی
۱۸۲ - گریاں - میر علی امجد
۱۸۳ - گمان - نظر علی خاں
۱۸۴ - لطفی - دکنی
۱۸۵ - لسان - میر کلیم اللہ
۱۸۶ - محقق - دکنی
۱۸۷ - مزل - محمد مزل
۱۸۸ - مخلص - رائے انند رام
۱۸۹ - موزوں - راجہ رام نراین
۱۹۰ - منعم

۱۹۱- میر مدد اللہ
۱۹۲ - محزوں - سید محمد حسین
۱۹۳- محسن - محمد محسن
۱۹۴- مستمند دہلوی
۱۹۵- مائل - محمدی دہلوی
۱۹۶- مائل - میر ہدایت علی
۱۹۷- مسکین - لالہ بخت مل
۱۹۸- منتظر - خواجہ بخش اللہ
۱۹۹- مرزائی - محمد علی خاں
۲۰۰ - مخلص - بدیع الزماں خاں
۲۰۱ - محشر کشمیری
۲۰۲ - مفتوں - کاظم علی
۲۰۳ - محترم - خواجہ محمد محترم
۲۰۴ - مضمون - سید امام الدین خاں
۲۰۵ - محب - شیخ ولی اللہ
۲۰۶ - منشی - غلام احمد
۲۰۷ - مجروح - منشی کشن چند
۲۰۸ - محنت - مرزا حسین علی بیگ
۲۰۹ - مروت سنبھلی
۲۱۰ - مرزا - نواب مرزا دہلوی
۲۱۱ - مرزا - مرزا علی رضا
۲۱۲ - مجنوں - شاہ محبوں
۲۱۳ - مجنوں - حمایت علی
۲۱۴ - معین - شیخ معین الدین
۲۱۵ - مدعا - میر عوض علی
۲۱۶ - مدہوش - میر نبی خاں
۲۱۷ - مصیب - شاہ غلام قطب الدین
۲۱۸- ممتاز - حافظ فضل علی
۲۱۹ - مشتاق - میر حسن دہلوی
۲۲۰ - مشتاق - محمد قلی خاں
۲۲۱ - مغموم - رام جس
۲۲۲ - نظام - غازی الدین خاں
۲۲۳ - میر - غلام نبی بلگرامی
۲۲۴ - نثار - میر عبدالرسول
۲۲۵ - نثار - سدا سکھ
۲۲۶ - ندیم - شیخ علی قلی -
۲۲۷ - نادر - دہلوی
۲۲۸ - نالاں - میر احمد علی -

۲۲۹ - نالاں - میر وارث علی

۲۳۰ - نجات - شیخ حسن رضا

۲۳۱ - نزاد - خواجہ محمد اکرم

۲۳۲ - نالاں - محمد عسکر علی خاں

۲۳۳ - ولایت - میر ولایت اللہ خاں

۲۳۴ - وارث - محمد وارث

۲۳۵ - وفائی - لالہ نول رائے

۲۳۶ - وحشت - میر ابوالحسن

۲۳۷ - وحشت - میر بہادر علی

۲۳۸ - واقف - شاہ واقف

۲۳۹ - وصل - مرزا اسحاق

۲۴۰ - وہم - میر محمد علی

۲۴۱ - والہ - میر مبارک علی

۲۴۲ - ہادی - دہلوی

۲۴۳ - ہویدا - میر محمد اعظم

۲۴۴ - ہدایت - ہدایت علی

۲۴۵ - ہمدم عظیم آبادی

۲۴۶ - میر - ہینگا دہلوی

۲۴۷ - ہاتف - مرزا محمد

۲۴۸ - یونس - حکیم یونس

۲۴۹ - یکرو - عبدالوہاب

۲۵۰ - یار - میر احمد دہلوی

۲۵۱ - یاس - حسن علی خاں -

اس فہرست کے پیش کرنے کے بعد نامناسب نہ ہوگا اگر ان امور کا بھی ایک اجمالی ذکر کر دیا جائے جو گلزار ابراہیم اور گلشن ہند کے ایک سرسری مقابلی مطالعے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

(ب) گلشن ہند میں سب سے نمایاں چیز وہ اضافے ہیں جو لطف کی ذاتی معلومات کی پیداوار ہیں - یہ کئی حیثیتوں سے اہم ہیں ان سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ کون کون سے شاعر ایسے تھے جن میں سنہ ۱۱۹۸ھ سے سنہ ۱۲۱۵ ہجری کے درمیانی زمانے تک (یعنی ۱۷ سال کے عرصے میں) کوئی خاص اہمیت پیدا ہو گئی تھی - یا جن کے حالات میں کوئی تبدیلیاں ہو چلی تھیں - اس کے علاوہ ان سے جہاں علی ابراہیم کی معلومات کی نوعیت کا

پتہ چلتا ہے، لطف کے ذاتی معتقدات اور خیالات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی سلسلے میں شاید اس امر کا اظہار بھی ضروری ہو کہ لطف نے صرف ۳۰ یا ۳۲ شاعروں ہی کے ذکر میں اضافے کئے ہیں۔ نیز یہ کہ بعض ایسے شاعروں میں اضافہ نہیں کیا جن میں وہ یقیناً کر سکتے تھے کیوں کہ یا تو وہ لطف کے زمانے تک زیادہ مشہور ہو گئے تھے، یا اُن کی زندگی کے حالات میں کوئی نہ کوئی تغیر ضرور رہوا تھا۔ جیسا کہ قائم مصحفی، بے جگر، سداسکھ وغیرہ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے۔ جن شاعروں کے ذکر میں لطف اضافے کر سکتے تھے ان میں سے چند یہ ہیں:-

(۱) آبرو (۲) اثر (۳) بیدار (۴) حاتم (۵) سوز (۶) ضیاء (۷) فغاں۔

لطف کے چند قابلِ ذکر اضافوں کا اجمالی بیان یہ ہے۔

۱۔ شاہ عالم آفتاب، ابوالحسن تاناشاہ، آصف الدولہ آصف، عمدۃ الملک امیر خاں انجام، قزلباش خاں امید اور سراج الدین علی خاں آرزو۔ ان پانچوں کے ذکر میں لطف نے بہت زیادہ اور بہت مفید تاریخی حالات کا اضافہ کیا ہے، نمونۂ کلام بھی زیادہ پیش کیا ہے۔ اگرچہ سطروں وغیرہ کی تعداد سے مواد کی کمی یا زیادتی کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ایک دھندلا سا خیال تو قائم کیا جا سکتا ہے اس لئے شاید نامناسب نہیں اگر لکھا جائے کہ ان کا ذکر گلزار ابراہیم میں صرف اس قدر ہے:-

۱۔ آفتاب۔ ۵ سطر ۲ شعر

۲۔ تاناشاہ۔ ۲ " ۱ "

۳۔ آصف۔ ۱۰ " ۱۱ "

۴۔ انجام۔ ۵ " ۲ "

۵ - اُمید - ۴ سطر ۱ شعر

۶ - آرزو ۱ ½ " ۴ "

۲ - آشفتہ - مرزا رضا علی کے ذکر میں علی ابراہیم نے لکھا ہے کہ :-

" تاحین تحریر این اوراق احوالش معلوم نشد - ظاہرا در لکھنؤ می گذارند "
لیکن علی لطف نے بہت کچھ لکھا ہے (دیکھو ذکر آشفتہ)

۳ - مرزا عبدالقادر بیدل کے ذکر میں ابراہیم نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ :-
" احوال آں قادر سخن در تذکرۂ فارسی مسطور " علی لطف نے بہت اچھا مواد پیش کیا ہے (دیکھو ذکر بیدل)

۴ - سودا کا ذکر، اگرچہ بالکل لفظی ترجمہ ہے، لیکن علی لطف کے یہاں " چھ ہزار سالیانہ کی جاگیر" سے لے کر آخر تک کے جملے اضافہ ہیں (علی ابراہیم کے یہاں کل ۱۱ سطریں ہیں اور تقریباً ۱۰۰ شعر مثالاً لکھے گئے ہیں)

۵ - فقیر اور قائم کے ذکر میں بہت زیادہ اور بہت اچھا اضافہ کیا ہے - خصوصاً موخر الذکر کے کلام کی نسبت رائے اور سنہ وفات کا بھی اضافہ لطف ہی کی جانب سے ہے

۶ - میر کے ذکر میں لطف نے بھی اضافہ کیا - پہلے کی صرف آٹھ سطریں ابراہیم سے ماخوذ ہیں - گلزار ابراہیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک (یعنی ۱۱۹۶ ہجری میں) میر دہلی ہی میں تھے (ابراہیم نے میر کے حال میں ۱۴ سطریں لکھیں اور ۴۰۰ ۵ شعر نقل کیے ہیں)

۷ - مجذوب مصحفی اور منت کے ذکر میں بھی بہت اہم اضافے ہیں - علی ابراہیم کے ہاں پہلے دونوں کا ذکر ۳ سطروں میں اور منت کا ۸ سطروں میں ہے -

ان شاعروں کے علاوہ اور جن جن کے حالات میں لطف نے اضافے کئے ہیں ان

میں سے اکثر یہ ہیں :-

(۱) اشتیاق (۲) احسن (۳) الہام (۴) الم (۵) انشا (۶) فسوس (۷) بقا (۸) جرأت (۹) حسرت (۱۰) حیران (۱۱) خاکسار (۱۲) عشق (۱۳) قدرت (۱۴) کلیم (۱۵) مظہر (۱۶) مضمون (۱۷) مخلص (۱۸) محبت

(ج) علی لطف کے بعض غور طلب امور سے خالی نہیں ہیں۔ ان سے ایک تو مترجم کی ذہنیت معلوم ہوتی ہے اور دوسرے خود ترجمے کی بعض خصوصیات بھی ظاہر ہوتی ہیں اس ضمن میں سب سے عام اور معمولی بات ترجموں کی طوالت ہے۔ فارسی عبارتوں کا سادہ اور مختصر سی اُردو میں ترجمہ کرنا (خصوصاً اُس زمانے میں) کوئی آسان کام نہ تھا! ور لطف کے طویل اور دور از کار ترجموں کی مدافعت کے لئے یہ بات ضرور کارگر ہوجاتی، لیکن جب بعض اور معمولی معمولی باتوں کی طرف نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ لطف نے عمداً ترجمے کو طویل بنانے کی کوشش کی ہے مثلاً :-

(۱) گلزار ابراہیم میں جہاں لفظ "دہلوی" لکھا ہوا ہے، اس موقعہ پر گلشن ہند میں ہمیشہ "شاہ جہاں آبادی" لکھا گیا ہے۔ حالاں کہ لفظ دہلوی کے استعمال میں کوئی قباحت نہ تھی۔

(۲) کئی جگہہ سادہ سے سادہ باتوں کو اس طرح توڑ مروڑ کر لکھا ہے کہ عبارت میں خواہ مخواہ پیچیدگی پیدا ہوجاتی ہے۔ ذیل میں مقابلے کے لئے گلزار ابراہیم اور گلشن ہند کی دو تین عبارتیں نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں :-

گلزار ابراہیم	گلشن ہند
"میر غلام حسین شورش میر غلام حسین مشہور بہ ببھینا	"شورش تخلص، میر غلام حسین نام متوطن

خواہرزادہ ملّا میر وحید و شاگرد میر باقر حزیں ہست
باین۔ خاکسار آشنا بود۔ بمحض پندار التفات
بقبائح افکار خود نمی نمود۔ تذکرہ در ریختہ
تالیف نمودہ۔ خالی از درد نے و حالتے نبود
در سنہ یکہزار و یکصد و نود و پنج ہجری
رحلت کردہ۔ اشعارش مدون و ایں اشعار
خلاصۂ دیوان اوست"

(دونوں مخطوطوں میں بعینہ یہی عبارت
ہے)

عظیم آباد کے۔ مشہور میر ٹھینیا کرکے تھے
بھانجے تھے ملا میر وحید کے اور مشورہ
سخن کیا تھا میر باقر حزیں تخلص سے علی ابراہیم
خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ
"میرے آشنا تھے' اور بیماری میں غرور
کی مبتلا تھے۔ فقط اپنے خیال فاسد سے
اُنھوں نے اپنے کلام کی قباحتوں پر التفات
نہیں کیا ہے' اس سبب سے سخن ان کا ہمیشہ
مورد اعتراض سخن گیروں کا رہا ہے۔"
ایک تذکرہ شعرائے ہند کا زبان ریختہ میں
اُنھوں نے لکھا ہے لیکن وہ بھی بہ سبب ان
کی خود پسندی کے خالی خلل اور زلل سے
نہ تھا۔ سنہ ۱۱۹۵ ہجری میں اس سرائے فنا سے
جادہ نورد منزل بقا کے ہوئے۔ دیوان اُن کا
زبان ریختہ میں مرتب ہے۔ یہ اُن کے کلام
کا منتخب ہے۔

(۲) نظام الدین احمد 'صانع' بلگرامی۔

"صانع بلگرامی۔ نظام الدین احمد۔ از
دوستان ایں خاکسار و محبان مرزا محمد رفیع

"صانع تخلص' نظام الدین احمد نام۔
ساکن بلگرام' علی ابراہیم خاں مرحوم نے
لکھا ہے کہ "محبان قدیم سے مرزا محمد رفیع

سوداست۔ اشعار فارسی مدوّن دارد،
و ریختہ کمتر می گوید۔ از خواندن اشعار خوب
بسیار متأثر می شود۔ بعالم اخلاص مستثنیٰ
و ذہنش بفہم اشعار رساست۔ الحال السال
بیست و دویم شاہ عالم بادشاہ در مرشد آباد
و کلکتہ بسر می برد از وست"
(دونوں نسخوں میں یہی عبارت ہے
اور دونوں میں مثال کے شعر نہیں ہیں)

سودا کے اور دوستان صمیم سے اس خاکسار
کے تھے۔ بڑے صاحب درد و تاثیر اور
طبیعت کی گدازی میں بے نظیر۔ اچھا شعر
جب کسی سے سنتے تو گھڑیوں روتے اور
بیچین رہتے۔ عالم اخلاص اور دوستی میں
زمانے کے افتخار، استقامت طبع اور رسائی
ذہن میں مستغنی روزگار تھے۔ سن بائیسویں
یک جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے
ہمیشہ مرشد آباد اور کلکتے میں ایام زندگی
کے بسر کرتے تھے۔ آخر سنہ (چھوڑ
دیا ہے) ہجری میں ملک وجود سے رخت سفر
کا باندھ کے راہی کشور عدم کے ہوئے
فارسی دیوان مرتب ہے ان کا اور ریختہ
کا شوق کمتر تھا۔ یہ اشعار اس نکو کردار
کے ہیں:"

(۳) شیخ فرحت اللہ فرحت

"...... از دہلی بہ مرشد آباد افتادہ روزگارے
بسر بردہ، در فیض احسان رعایت حالش راقم
آثم می نمود۔ تا آں کہ در ہماں بلدہ سنہ ۱۱۹۱

"...... علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے
کہ "یہ عزیز میرا اخلاص مند تھا اور عسرت
کا مورد گزند تھا۔ جب کہ دہلی سے مرشد آباد
میں آیا اور طور سکونت کا وہاں ٹھیرایا۔

از جہاں در گزشت"

مجھ سے ہو سکتا تھا خبر گیران حال گاہ گاہ ہوتا تھا - غرض بہت تنگی معیشت کے ساتھ عزیز کا نباہ ہوتا تھا - آخر الامر ۱۱۹۱ سنہ ہجری میں اسی بلدہ کے اندر انتقال کیا اور اس دار المحن سے خلاف اپنے تخلص کے، بہت مغموم گیا ......"

(د) اسلوب بیان کی پیچیدگی اور بے جا طوالت کے علاوہ علی لطف کے ترجمے میں چند اور نقائص بھی ہیں - اگر علی لطف، علی ابراہیم کا بعینہ ترجمہ کر دیتے تو غالباً اپنے ترجمے کو گلزار ابراہیم کی بعض اصلی خوبیوں سے محروم نہ کر دیتے -

جہاں جہاں علی ابراہیم کے ذاتی حالات اور خیالات کی جھلک نظر آتی تھی، علی لطف نے اس کو بالکل نیست و نابود کر دیا - گلشن ہند سے علی ابراہیم کی دوستیوں اور رشتہ داریوں کا کوئی پتہ نہیں چلتا - مرزا جواں بخت جب بنارس آئے تو علی ابراہیم کا عہدہ دار کی حیثیت سے ان کی خدمت میں حاضر ہونا اور شہزادے کی عنایات وغیرہ کے ذکر سے بھی گلشن ہند محروم ہے - اسی طرح نفقیہ صاحب درد مند اور نواب محبت خاں وغیرہ کے ساتھ خانگی تعلقات کی جو معلومات گلزار ابراہیم میں ہیں، ان سب کا علی لطف نے خون کر دیا ہے -

گلزار ابراہیم میں بعض باتیں ایسی تھیں جو بعینہ پیش کر دینے کے قابل تھیں۔ ان کا ترجمہ کرنا کئی لحاظ سے نامناسب تھا - مثلاً علی ابراہیم نے بعض شاعروں سے حالات طلب کئے تو انھوں نے اپنے متعلق جو تحریریں روانہ کی تھیں - علی ابراہیم نے اُن کو بعینہ

نقل کر دیا ہے - لیکن لطف نے ان کا ترجمہ کر کے اُن کی شان کھو دی - اس قسم کی تحریروں میں میر سوز اور میر حسن کے بیانات قابل ذکر ہیں - جو پیش کیے جا چکے ہیں -

(۵) علی لطف ان امور کے غالباً غیر ارادی طور پر مرتکب ہوئے تھے، لیکن ان کے علاوہ بعض ایسی باتیں بھی نظر آتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے چند حالات و خیالات کا اپنی جانب سے عمداً اضافہ کیا اور جو اس بات کے کافی شاہد ہیں کہ علی لطف اپنے مذہبی معتقدات کو اپنے ترجمے میں جھلکائے بغیر نہیں رہ سکے -

علی ابراہیم کی حسب ذیل عبارتیں جب علی لطف کے ترجموں کے مقابلے میں پڑھی جائیں گی تو معلوم ہوگا کہ علی لطف اپنے بیانات کے کہاں تک ذمہ دار ہیں :-

(۱) شاہ ولی اللہ اشتیاق :-

"اشتیاق تخلص، سرہندی - اسمش ولی اللہ، از سلسلۂ مجدّد الف ثانی است - جدش شاہ محمد گل - در کوٹلۂ فیروز شاہ می ماند - درویشانہ می زیست - کمتر شعر فارسی و بیشتر شعر ہندی می گفت از وست ...."

(۲) مرزا مظہر جانِ جاناں :-

(حالات کے بعد شہادت کے قصّے کو حسب ذیل سادہ طریقہ پر لکھا ہے جو لطف کے بیان سے مقابلہ کرنے کے قابل ہے -

"....... گویند بسبب تعصب مذہب منع تعذیۂ سید الشہدا علیہ السلام می نمود -

بدیں جہت زد ستِ یکے از ساکنان دہلی سنہ یک ہزار و یکصد و نود و چہار ہجری کہ عمرش قریب صد بود مقتول شد......!!

اسی سلسلے میں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ مِلّی لطف نے بعض ایسے امور میں بھی علی ابراہیم سے اختلاف کیا یا اُن کے بیان میں اضافے کیے ہیں۔ جن سے اُن کے ذاتی معتقدات کو بظاہر کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ ان کا ظہور یا تو محض ادبی اور تاریخی نقطۂ نظر سے ہوا ہے یا بہت ممکن ہے کہ ان کے پس پردہ بھی کوئی مقصد ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچۂ گلزارِ ابراہیم

رعنائی کلام بحمد متکلمی ست کہ انحائے سخنان روح پرور را بمنزلہ جان در قالبِ زبان انواع انسان ریختہ۔ و برائے اظہار توحید در کثرت شیونات گفتار محاورہ سنجان دہلی را بہ لغاتِ مختلفہ برآمیختہ وزیبائی تقریر بہ لغت فصیح ست کہ دلہائے سنگین در قبول تاثیر کلامش مانند موم پزیرائی نقش نگین ست و ندائے معجز نمایش سنگریزہ را قوّتِ ناطقہ در آستین۔ علیہ و علیٰ وصیہ و آلہ افضل الصلوٰۃ و اکمل التحیات **امابعد** بر ضمیر نکتہ سنجان سخن پرور و حرف پژوہان دانشور پیدا و ہویدا است کہ اگرچہ زبان تازی و عجمی سامعہ نواز السنۂ امصارِ دیگر ست اما قطع نظر از اعتناق اختلاف طبائع جدیدۂ انصاف معانی گزیدہ را در لغات و اصطلاحات ہر طائفہ آب و رنگِ قبول حاصل می شود چہ محسنات و ممنوعات در سائر کلام موزوں مقبول و مردود ست و چناں کہ بادۂ عشرت فزا را از مقارنت آبگینہ ہائے مختلف الالوان تغیرے در کیفیت نشہ رانمی یابد ہمچنیں شاہدِ مضمون غریب و جمیلہ معنی خاص از اقتباس الفاظِ ردیۃ و محاوراتِ نامرضیہ زشت و نازیبا

نمی گردد۔ ازیں قرار آشنای در سخن و خاک پائے سخن سنجاں علی ابراہیم خاں باوصف تالیف دو تذکرۂ اشعار فارسی باستدعائے بعضے محبانِ یک دل و یک رو و موزوں طبعانِ ریختہ گو بخاطر آورد کہ برخے از اشعار ریختہ با ضبط احوال و اوصاف گویندگان بسلک تحریر پیوند دہد۔ الحمد لواہب العطایا کہ در زمانِ سلطنت، بادشاہ گیتی افروز، روشن ضمیر دانش آموز فروزندۂ مسندِ جہانبانی، چراغ دودمانِ صاحب قرانی، فروغ ناصیہ و انجمن طرازی، شاہ عالم بادشاہ غازی، خلد اللہ ملکہ، د آوانِ وزارت مردمک دیدۂ بیدار دوست، زینت افزائے جاہ و شوکت قوت بازوئے بختیاری، حکم انداز نخچیرگاہ دشمن شکاری، نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ دام اقبالہ، و در عہد حکومت متمم امور ریاست و ایالت، محیٔ مراسم نصفت و عدالت، ظفر پیرائے معارک مخالف ستیزی، رب النوع گروہ خرد پژوہ انگریزی، نواب عماد الدولہ امیر الممالک، گورنر جنرل، وارن ہشتن، جلادت جنگ بہادر، زاد حشمتہ، آنکہ خردمندانِ دانشور از شش جہت روئے توجہ بایوانِ حشمت بنیان او نہادہ و بدلربائی رعایتش غربت را بر وطن رجحان دادہ اند ایں مامول بحصول انجامید و بسال یک ہزار و ہفصد و ہشتاد و چہار عیسوی و یک ہزار و یک صد و نود و ہشت ہجری از تسوید آں فراغ حاصل شد و موسوم بہ گلزار ابراہیم گردید تا میزان گوشہا سنجیدن لآلی سخنان دلکش سرفراز ست، دیدۂ عیب جویان ہنر پوش بہنگام نظارۂ ایں بساط جواہر با خار ترازد انبازد۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف الالف

۱۔ آفتاب۔ شاہ عالم بادشاہ۔ علی لطف نے اپنی طرف سے بہت زیادہ اور مفید تاریخی حالات کا اضافہ کیا اور نمونۂ کلام بھی پیش کیا ہے۔ علی ابراہیم نے صرف پانچ سطریں لکھی ہیں اور نمونۂ کلام کے طور پر دو ہی شعر درج کیے گئے ہیں (ورق ۱۰-ب)

آفتاب تخلص، نورِ نیّرِ جہانبانی، مہرِ سپہرِ صاحب قرانی، شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی شاہزادگی میں گوہرِ صدفِ سلطنت کا نام عالی گوہر تھا۔ اُسی ایام میں عمدۃ الملک کے خوف سے دلّی سے نکلے، اور بعد بہت آوارگی کے نجیب خاں کے یہاں کہ سردار قوم افغان کا تھا اور نجیب الدولہ خطاب رکھتا تھا، منتظرِ عنایت الٰہی کے ہو کر ٹھہرے۔ اس میں بعد ایک مدّت کے محمد قلی خاں، بھتیجے نواب صفدر جنگ کو، کہ ناظم صوبۂ الہ آباد کا تھا، حوصلہ بنگالہ کی تسخیر کا دامن گیر ہوا۔ مشورے سے نواب شجاع الدولہ کے، کہ وہ باطن میں محمد قلی خاں کے برباد کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، خان مذکور نے شاہزادے کو نجیب خاں کے ہاتھ سے بلوا لیے، اور وسیلہ

عزم کا ٹھیرا کے، آپ مع فوج کے رکاب سعادت میں داخل ہوئے، اور الہ آباد سے کوچ کر کے قریب عظیم آباد کے آپڑے۔ اب آگے رام نرائن عظیم آباد کے نائب نظامت کا بے حواس ہو کر محمد قلی خاں کی معرفت حضور میں شاہزادے کے حاضر ہونا مشہور ہے، اور پھر بگڑ کے چند مدت قلعہ میں عظیم آباد کے بند ہو کر لڑنا، یہ بھی تواریخ بینوں کی نگاہ سے نہیں مستور ہے۔

ابھی محمد قلی خاں قلعے کو لگے ہی ہوئے تھے، کہ اس میں بعد ایک چند روز کے شہرہ جعفر علی خاں اور میرن کی آمد آمد کا، واسطے رام نرائن کی کمک کے مع کرنیل کلف بہادر ثابت جنگ کے مشرق کی طرف سے ہوا۔ محمد قلی خاں نے اُن کی لڑائی سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت اپنے بیچ میں نہ پا کے، پیش ازاں کے داخل ہونے کے، کوچ بنارس کی طرف کیا اور شاہزادۂ عالی تبار عالی گوہر نے، کرم نام سی کی ندی[1] سے، کہ صوبۂ عظیم آباد کی سرحد میں ہے، عبور کر کے تھوڑی دُور گئے تھے، کہ باپ کے مارے جانے کا احوال اس طور سے سُنا کہ مہدی قلی خاں کشمیری، علی قلی خاں کے بھائی نے، کہ رفیق عماد الملک کا تھا حسب الارشاد اپنے آقا کے حضور اعلیٰ میں عرض کی کہ "ایک فقیر بہت بڑا صاحبِ کمال فیروز شاہ کے کوٹلے میں آکے اُترا ہے، حضرت کو ملاقات اس سے کرنی ضرور ہے۔" حضرت بیچارے اجل گرفتہ حکم میں تو عماد الملک کے تھے ہی، اپنے پاؤں سے آپ قبر میں تشریف لے گئے۔ وہاں فقیر کہاں تھا، کئی ایک خوں خوار جفاکار، بے شرم اور بے رحم اُس حجرے میں بٹھا رکھے تھے، جاتے ہی اس بے گناہ کو پیش قبضوں سے مار کر لاش کو اوپر سے ریتی کی طرف کر دیا۔ کھٹولے میں پہنچ کر، موافق ضابطۂ خاندانِ بابریہ کے ۱۱۷۳ھ گیارہ سو تہتر ہجری میں القاب "شاہ عالم" کے ساتھ تختِ سلطنت پہ جلوس فرمایا۔ اور قلمدان وزارت کا مع خلعت جلد نواب شجاع الدولہ کے واسطے بھجوایا۔ ساتھ ہی اس کے خلعت امیر الامرائی کا، کہ عبارت میر بخشی گری سے ہے، نجیب الدولہ کے لئے روانہ ہوا۔ اور نواب منیر الدولہ نے اُسی وقت

---

[1] یعنی اس ندی سے جس کا نام کرم تھا ۱۲

نی ارشاد کے ایلچی گری کے طور پر ابدالی کی طرف کوچ کیا۔ اتنے میں کامگار خاں
نچ ہزار سوار سے، اور دلیر خاں، اصالت خاں اپنی تمام جمعیت سے حاضر ہو کر اقرار
فشانی کے ساتھ داخل دائرۂ دولت کے ہوئے۔ چنانچہ کامگار خاں نے اخراجات
روری کا اپنا ذمہ کیا، اور زمینداروں سے اتنے ہی عرصے میں، جس جس ڈھب سے بنا
کچھ روپیا بھی لیا۔ تجویز یہ ٹھہری کہ میرن کے آنے سے آگے ہی رام نرائن سے لڑ لیجے
ور خدا فضل کرے تو قلعے عظیم آباد کے عمل کیجے۔ بادشاہ کو بھی یہ مشورہ پسند آیا اور
سی وقت پیش خیمے کے کوچ کو حکم فرمایا۔ کامگار خاں اور دلیر خاں متصل رام نرائن کے
شکر کے کہ دیو ہانڈی کے کنارے پر پڑا تھا، آ پڑے اور بعد کئی دن کے میدان جنگ
راستہ کر کے کمال جانفشانی اور سر فروشی کے ساتھ لڑے۔

سب سے پہلے دلیر خاں اور اصالت خاں نے گھوڑے چلائے، اور نہایت
بہادری سے رام نرائن کی فوج میں در آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ غول ان کا نشانہ تھا چھروں
کی مار کا اور ہدف تھا بندوقوں کی باڑھ کا، بجلی کی طرح کڑک کر ہر ایک اژدھا توپ کا سا
گرم آتش فشانی تھا، اور گولیوں کی بارش سے ساون بھادوں کا منھ شرمندگی سے
پانی پانی تھا۔ اس میں بندوقوں کی مار سے نشان[1] کے ہاتھی کا منھ پھر گیا۔ کسی نے دلیر خاں
سے پکار کر کہا کہ "نشان کا ہاتھی پھر گھرا ہوا۔" فرمایا "کیا ہوا، ہاتھی پھرا، اور گو کہ
آسمان بھی پھرے دلیر خاں تو نہیں پھرا۔" یہ کہہ کے دونوں بھائیوں نے کود کے گھوڑوں
سے ایک تین سو جوانوں سے کہ وہ رفیق ان کے تھے، ایسی ہی جاں بازی کی کہ ساری
زمین ان کی لاشوں سے بھر دی، اور تمام فوج رام نرائن کی تلے اوپر کر دی، خاطر خواہ
دلاوری اور بہادری سے دل بھر کے، شجاعت اور تہور کا حق ادا کر گئے، دونوں
بھائیوں نے مع رفیقوں کے جان شیریں نثار کی، لیکن رام نرائن کی فوج میں بھی

---

[1] یعنی وہ ہاتھی جس پر نشان سلطنت تھا ۱۲

باقی نہ رہی جلادت گفتار کی۔

اس میں توپ اور بندوق تو بند ہو ہی گئی تھی، کامگار خاں مع اپنی فوج کے جو ایک طرف سے بیٹھا، تو برابر رام نرائن کے جا نکلا۔ لوگ رام نرائن کے، ازبسکہ دلیر خاں کی لڑائی کھائے ہوئے تھے، دوبارہ کامگار خاں کے مقابلہ کی طاقت نہ لا کے پسپا ہوئے۔ رام نرائن نے مقدمہ بے ڈول دیکھا، عین لڑائی میں کپتان کاکری صاحب سے کہلا بھیجا کہ "آدھے لوگ اپنے میری کمک کو بھیجئے"۔ کپتان مذکور نے موافق حکم نائب نظامت کے اپنی فوج کے دو حصّے کئے اور آدھے آدمی اِدھر بھیج دیئے۔ لیکن لوگ ان کے بھی تو لڑائی کی محنت اُٹھا چکے تھے، اور جس قدر چاہیئے تھا جی لڑا چکے تھے، کچھ کام بن نہ آیا کسی طرح سے بندوبست نے لڑائی کے انتظام نہ پایا۔ چنانچہ کامگار خاں نے گھوڑا رام نرائن کے ہاتھی سے ملا دیا، اور اتنے تیر اور نیزے مارے کہ اپنی دانست میں اُنھوں نے مار لیا، لیکن اس مدبر نے زخمی ہو کر حوضے میں لپٹ جانے کو غنیمت جانا اور تختوں کی آڑ کو وسیلہ زندگانی کا گردانا۔ غرض لڑائی بگڑ گئی، بہت سے لوگ رام نرائن کے ساتھ کے مارے گئے، اور کچھ تھوڑے سے لوگ بھاگ بھی بچارے گئے۔ مُرلی دھر مع رحیم خاں اور غلام شاہ کے، کہ ہراول فوج کے تھے، کامگار خاں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے۔ احمد خاں اور مراد خاں، بیٹا بہرام خاں بلوچ کا بھاگ کے رام نرائن کے شریک، عظیم آباد کی طرف قدم گزار ہوئے۔ شاہ عالم بادشاہ غازی نے فتح اور نصرت کے ساتھ کھیت پر ڈیرا کرنے کا حکم دیا، اور بھاگے ہوؤں کا پیچھا مطلق نہ کیا۔ اب آگے بیان ساتھ تفصیل کے موجب طول کلام کا ہے۔

مختصر یہ کہ آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ سنہ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، اور جلوس مبارک کو سنہ بیالیسواں ہے وہ اورنگ نشین بارگاہِ جاہ و جلال تخت پر ساتھ عیش و نشاط کے حکمراں ہے۔

سنہ تیسویں میں عہد سلطنت کے، منظور علی خاں ناظر کی بے بصیرتی سے شیخ غلام قادر خاں رُہیلے نے جو کور نمکی کی ہے، مفصل بیان اس کا غضب ہی اور نہایت ترک ادب ہے لیکن حضرت نے خود اپنی زبان بلاغت بیان سے اس روداد کو اس تفصیل کے ساتھ نظم کیا ہے کہ اور کسی بندۂ آستان دولت کی کیا مجال تھی کہ اس واردات کو اس بے ادبی سے زبان تک لاتا۔ از بسکہ وہ غزل فارسی ہی داخل کرنا اس کا بیچ کتاب کے خلاف آئین نثر ہندی کے معلوم ہوا، اس واسطے تیمناً و تبرکاً اس غزل کو حاشئے[لہ] پر کتاب کے لکھا ہے اور ترجمہ اس کا لفظاً باللفظ کر کے اس طرح داخل کتاب کیا ہے نظم

حادثے کی اُٹھی آندھی جو مری خواری کو　　دم میں برباد کیا میری جہانداری کو

لہ
صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواریِ ما　　داد بر باد سر و برگ جہان داریِ ما
آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودیم　　بُرد در شامِ زوال آہ سیہ کاریِ ما
چشمِ ما کندہ شد از دستِ فلک بہتر شد　　تا نہ بینم کہ کند غیر جہان داریِ ما
داد افغاں بچۂ شوکتِ شاہی برباد　　کیست جز ذاتِ مبرّا کہ کند یاریِ ما
بود جاں کاہ زر و مالِ جہاں ہمچوں مرض　　دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریِ ما
کردہ بودیم گناہے کہ سزا ایش دیدیم　　ہست مصروف کہ بخشند گنہگاریِ ما
کردہ سی سال نظارت کہ مرا داد بباد　　زود تر یافتہ پاداشِ ستمگاریِ ما
عہد و پیماں بہ میاں دادہ نمودند دغا　　مخلصاں خوب نمودند وفاداریِ ما
شیر دادم افعی بچہ را پروردم　　عاقبت گشت مجوّز بہ گرفتاریِ ما
حقِ طفلاں کہ بہ سی سال فراہم کردیم　　کردہ تاراج و نمودند سبک باریِ ما
قومِ مغلیہ و افغاں ہمہ بازی دادند　　بسکہ گشتند مجوّز بہ گرفتاریِ ما

(بقیہ بر صفحۂ آیندہ)

بس کہ خورشید کو لازم ہے طلوع اور غروب
شام یوں پھولی غرض میری سیہ کاری کو

آنکھیں نکلیں، تو ہوا خوب کہ دیکھوں گا نہ میں
غیر کے قبضے میں اورنگ جہانداری کو

مملکت کا بھی خیال ایک مرض تھا جاں کاہ
گردشِ چرخ نے کھویا مری بیماری کو

کی اس افغاں بچے نے شوکتِ شاہی برباد
کون پہنچے گا خدا[۱] چھٹ مری اب یاری کو

جو کئے تھے گُنہ اُن سب کی سزا دیکھی ہیں
شاید اب پوچھیں نہ وہاں میری گنہگاری کو

جو تھا بتیس[۳۲] برس سے مرے گھر کا ناظر
پہلے حکم اُس نے دیا میری دل آزاری کو

بے گناہی نے مری اُس ستم ایجاد کے تئیں
جلد پہنچایا مکافاتِ ستمگاری کو

حقِ طفلاں جو ہوا تیس برس میں تھا جمع
مار کر لے گئے یاں چھوڑ سبک بار[۲] ہی کو

قوم افغان و مغل سب نے مجھے بازی دی
رکھا ہر اک نے روا میری گرفتاری کو

عہد و پیماں کئے اس میں، بھلا حقِ نمک
ان سے سیکھے کوئی آئینِ وفاداری کو

تھا جس افغاں بچے کو دودھ پلا کر پالا
بدلے اس حق کے وہ آیا میری خونخواری کو

(بقیہ صفحہ ۹) ایں گدا زادۂ ہمداں کہ بدوزخ برود
بانیِ جور و ستم شد بہ دلِ افگاریِ ما

گل محمد کہ ز مرداں بہ شرارت کم نیست
چہ قدر کرد و کالت پئے آزاریِ ما

تا مراد و سلیمان و بدل بیگِ لعیں
ہر سہ بستند کمر بہرِ گرفتاریِ ما

شاہِ تیمور کہ دارد سرِ نسبت با من
زود باشد کہ بیاید بہ مددگاریِ ما

مادھوجی سیندھیا فرزندِ جگر بندِ من ست
ہست مصروفِ تلافیِ ستمگاریِ ما

آصف الدولہ و انگریز کہ دستورِ من اند
چہ عجب گر بنمایند مددگاریِ ما

راجہ و راؤ و زمیندار، امیر و چہ فقیر
حیف باشد کہ نہ سازند بہ غمخواریِ ما

نازنینانِ پری چہرہ کہ ہمدم بودند
نیست جز محلِ مبارک بہ پرستاریِ ما

گرچہ ما از فلک امروز حوادث دیدیم
باز فردا دہد ایزد سرِ سرداریِ ما

[۱] یعنی سوائے خدا کے ۱۲ [۲] یعنی یہاں صرف سبکباری اور تہید ستی چھوڑ گئے ۱۲

نازنیں میری ہمدم جو تھیں یاں اک نہیں — جز مبارک محل اس میری پرستاری کو
آصف الدولہ اور انگریز ہیں میرے دل سوز — کیا عجب آویں اگر میری مددگاری کو
مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند کے ہاتھ — ہوگی بے رونقی اس طرز جفاکاری کو
کوئی پہنچادو خبر حال کی میرے کہ نظام — شاید آنکلے محبت سے خبرداری کو
شاہِ تیمور سے ہے اک سرِ نسبت مجھ کو — دُور کیا ہے جو کرے دَرد دلِ آزاری کو
راجہ و راو زمیندار، امیر اور فقیر — چاہیئے سمجھے سعادت میری غمخواری کو
آفتاب آج فلک نے کیا گر بے سروپا — بخشے گا کل تجھے حق پھر تری سرداری کو

حضرت جہاں پناہ کے مزاج مبارک کو نہایت نظم کی طرف التفات ہے اور بیشتر شغل اشعار میں کٹتی اوقات ہے۔ ان شعروں کو اُس جناب کی طرف منسوب کرتے ہیں:

کیجئے ہمدم بھلا کیوں کر نہ شکوہ یار کا — ہم تو بندے اُس کے ہوں وہ یار ہو اغیار کا
خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سے اُس نے آہ — ہو جیو یارب بھلا اس چشمِ آتشبار کا
صاف کل آنکھیں تری کہتی تھیں عاشق سے پکار — کر سکے عیسیٰ مداوا اپنے کب بیمار کا
خون ہووے گا گلوں کا دیکھنا ہرگز صبا — نام مت لینا چمن میں اُس بتِ خونخوار کا
زلف تیری دیکھ کے زاہد رگِ جاں سے بنا — جانتا ہیگا سعادت باندھنا زنّار کا
کب ترے عشاق بیٹھیں حشر میں طوبیٰ تلے — یاد آوے دل میں جب سایہ تری دیوار کا
دیکھ کر کل نبض میری یوں لگا کہنے طبیب — "کوئی بھی جانبر ہوا بیمار اس آزار کا"
صرف کعبہ میں نہ کر اوقات کو ضائع تو شیخ — ڈھونڈھ جا کر ہر طرف نقشِ قدم دلدار کا
اس قدر افسردہ دل کیوں ان دنوں ہے آفتاب — دیکھ کر ہوتا ہے تجھ کو تنگ دل گلزار کا

ولہ

صبح تو جام سے گزرتی ہے — شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے — اب تو آرام سے گزرتی ہے

۲- آصف - نواب آصف الدولہ۔ یہاں بھی مترجم نے نہایت مفید اضافہ

گیا ہے۔ گلزار ابراہیم میں حالات ۱۰ سطر میں ہیں اور گیارہ شعر بطور نمونہ دیئے گئے ہیں
(ورق۔ ۱۰۔ ب اور ۱۱۔ الف د ب)

آصف تخلص، نور کوکب ہمت اور شجاعت کا، خورشید آسمانِ مروت اور سخاوت کا، نواب آصف الدولہ وزیر الممالک آصف جاہ یحییٰ خان بہادر ہزبر جنگ، خلف نواب شجاع الدولہ مغفور کا ہے اور پوتا نواب ابو منصور خان صفدر جنگ کا۔ بعد وفات شجاع الدولہ کے گیارہ سو ستاسی ۱۱۸۷ھ ہجری تھے اور شاہ جہاں پناہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد سلطنت کو پندرھواں سنہ تھا، بلدۂ فیض آباد میں کہ قدیم نام اس کا بنگلا ہے مسند وزارت کو زینت اس عالی تبار نے بخشی ہے۔ از بسکہ رسمِ کہن ہے کہ بادشاہ اور وزیر واسطے نام کے، عہد حکومت اپنے میں، نئے شہر کے آباد کرنے کی تلاش کرتے ہیں، اور وہاں مقرر بود و باش کرتے ہیں۔ بعد چندے ہی اس آب و رنگِ گلشن وزارت نے بنگلے سے کوچ کر کے خارستان لکھنؤ کو بہار قدوم سے اپنے رشک شگوفہ زار کشمیر کا کیا۔ لکھنؤ کے تنِ بے جان میں گویا جان آئی اور چشم بے نور نے بصارت پائی۔ پھر تو آبادی پر شہر کے عرصہ زمین کا تنگ تھا، اور معموری کو اس خراب آباد کی تشبیہ سے ہفت اقلیم کی ننگ تھا۔ بسکہ اس بلند نظر کا اہل کمال کی طرف میلانِ خاطر تھا، ایک ایک کمال کا ہزارہا آدمی وہاں حاضر تھا۔ عمارت کی تعمیر پر طبیعت نہایت مصروف تھی اور خواہش شکار کی مزاج سے بشدّت مالوف تھی۔ ہر روز لازم تھا ایک عمارتِ تازہ کی بنا کا دھرنا، اور ہر سال عین واجب تھا واسطے شکار کے دو مرتبے سفر کرنا۔ بے مبالغہ ہے کہ ہزاروں شیر مانند بکریوں کے مارنے میں آئے، یہاں تک کہ اُن کی کھالوں کے متعدد خیمے عالی شان بنوائے۔ پہلی ہی گولی اس کے ہاتھ کی گینڈے او رارنے کو تھا پیغام اجل کا اور بڑے دانت ہونے ہاتھی کے بس یہی اُس کے واسطے تھا دام اجل کا۔ مستک پر فیلِ مست کی جب اس کا تیر بیٹھا، سوفار کا باہر نام نہ تھا۔ پہاڑ کو تنکے سے ٹالنا اس کے آگے کچھ کام نہ تھا۔ جنگلی ہاتھی دنیتلے اتنے مارے کہ آج دولت خانہ میں ایک عمارتِ

عالی شان ہاتھی دانت کی موجود ہے، جس کے ستون اور کڑیوں میں نام کو کہیں لکڑی کا نہیں وجود ہے۔ شجاعت کے سوائے سخاوت پر جب طبیعت آئی تو ہمت حاتم کی دل سے خلائق کے بھلائی۔ ایک دن میں لاکھ روپیہ سے شریف مکہ کی خدمت گزاری کی اور پانچ لاکھ روپے خرچ کر کے نجف اشرف میں نہر آصفی جاری کی۔ فیاض ایسا کہ جو کوئی سامنے کچھ لے گیا خالی نہیں پھرا ہے۔ بے مبالغہ ہے کہ خاک کی مٹھی کو اکثر اکسیر کی قیمت میں لیا ہے۔ اس میں کوئی گستاخ اگر اس کی قباحت زبان پر لایا، تو وہیں بے مزہ ہو کر اس سے فرمایا کہ "اتنی مروت کرنی اس شخص سے ہم نے مدت سے اپنے دل میں ٹھیرائی، یہ چٹکی خاک کی جو اس سے لی یہ مفت میں پائی"۔ غرض جو کچھ چاہیئے سب کمالوں کی جامعیت تھی۔ افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ فقط سیر اور شکار سے کام رکھا، میسّر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا۔ چھبیس برس کل اس مربع نشینِ مسند وزارت نے حکمرانی کی اور چمن گیتی میں مانندِ گلِ خورشید کے محتاجوں پر زرفشانی کی۔ آخر الامر ازبسکہ بیچ گلشن دنیا کے بہار اور خزاں آپس میں دست و گریباں ہیں، بیماری سے استسقی کی ۱۲۱۲ بارہ سو بارہ ہجری میں کہ سلطنت شاہ عالم بادشاہ غازی کے چالیسواں سنہ تھا، اٹھائیسویں تاریخ ربیع الاول کی، پہر ڈیڑھ ایک دن رہے حکومت عارضی کو ملک فنا کی چھوڑ کر کارفرمائی اقلیم بقا کی اختیار کی۔ راقم آثم صغر سن سے ملازموں میں اس آستانۂ دولت کے مع رسالہ سرفراز تھا اور افراطِ عنایت اور الطاف سے اس کے ہم چشموں میں اپنے مورد امتیاز تھا۔ اس شمع شبستانِ وزارت کی تاریخ وفات کا شعلہ اس جگر کباب کے گلخنِ طبع سے یوں آتش فشاں ہوا ہے

قطعہ

آصف الدولہ جب جہاں سے گیا　　　اک جہاں بے دل و دماغ ہوا

جامِ عمر اس کا بھرتے ہی لبریز
خلق کا[1] عیش کا ایاغ ہوا
دشمنوں کا دل آتشِ غم سے
دوستوں سے زیادہ داغ ہوا
سالِ تاریخ کا خیال کسے
خشک شعر و سخن کا باغ ہوا
بولے یوں دُور کرکے پائے عناد
آج گل ہند کا چراغ ہوا
۱۲ ھ ۱۲

یہ اشعار اُس عالی جناب کے مشہور ہیں:

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے
تیرے کوچہ میں نقشِ پا کی طرح
ایسے بیٹھے کہ پھر نہ وہاں سے گئے
شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم
سینو اک دن کہ جسم و جاں سے گئے
عشق! ہاتوں سے تیرے کیا کہئے
نام سے گزرے اور نشاں سے گئے
ایک دن ہم نے یار سے جو کہا
اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے
ہنس کے بولا کہ "سنتا ہے آصف
یوں ہی کہہ کے لاکھوں یاں سے گئے"

دل ہمارا خانۂ اللہ گر مشہور تھا
سو بتوں کے عشق میں اب وہ بھی بت خانہ ہوا
آباد ملکِ دل وہ یارو کہاں رہے گا
جس جا یہ درد و غم کا نت کارواں رہے گا
آصف نہ چھُٹے عشقِ بتاں دل سے ہمارے
سو بار اگر پھر بھی بناویں اسے گھڑ کر
شوخیِ چشم کی شہرت کو تری سُن سُن کر
شرم سے باغ میں نرگس نے چھپائیں آنکھیں
مرے دل کو زلفوں میں زنجیر کیجو
یہ دیوانہ اپنا ہے تدبیر کیجو
مرے دل نے زلفوں میں مسکن کیا ہے
یہ مہماں ہے اے شانہ، توقیر کیجو

[1] یعنی خلق کے عیش کا ایاغ لبریز ہوا ۱۲

جس جگہ آنسو گرے ہی آبلہ پڑ جائے ہی
آب سے آتش ہوئی کیوں کر ہم کیا جانئے

پوچھتے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو!
میں ہوں اور رات ہی اور بستر تنہائی ہی

آصف نہ چھوڑ دستِ سخاوت کو زنہار
لایا ہے کچھ نہ ساتھ نہ جائے گا تو لئے

یاں تلک داغِ محبت دل نے کھائے ہیں کہ بس
سر سے پا تک ایک گویا صورتِ طاؤس ہے

ہزاروں مردے جیتے دیکھے تیرے بات کرنے سے
لبِ معجز بیاں میں تیرے شاید آبِ حیواں ہے

۴۲- انجام۔

عمدۃ الملک امیر خاں مترجم نے خاصے اضافے کیئے ہیں لیکن قتل کی تاریخ گلزار ابراہیم کے مخطوطہ نمبر ا میں ۱۱۵۹ھ لکھی ہے مترجم نے ۱۱۶۹ھ لکھی۔ گلزار ابراہیم کے مخطوطہ نمبر ب میں تاریخ چھوڑ دی گئی ہے۔ ۵ سطر ۲ شعر (ورق ۱۱-ب)

انجام تخلص، عمدۃ الملک خطاب، نواب امیر خاں نام۔ والد ماجد ان کے عمدۃ الملک نواب امیر خاں ہیں، کہ جو عالمگیر خلد مکان کے عہدِ سلطنت میں زینت بخش مسندِ امارت کے تھے سلسلہ نسب شریف کا اس عالی خاندان کے میر میران نعمت الٰہی کو، کہ سلاطین صفویہ کے ساتھ نسبت اور ناتا رکھتے تھے، پہنچتا ہے۔ بزرگ ان کے ہمیشہ ایران میں صدر نشین تھے محفل عز و وقار کے اور ہندوستان میں بھی ہمیشہ انیس و جلیس رہے ہیں سلاطین نامدار کے اس عالی دودمان کو شاہ عالم پناہ محمد شاہ سے ایسی صحبت برآر ہوئی تھی، کہ رشک تھا ان سب ارکان دولت کو اور اعیان مملکت کو حسد تھا۔ لطیفہ گوئی کی طرف طبیعت ان کی نہایت مصروف تھی اور خوش طبعی سے مزاج بہ شدت مالوف۔ گردشِ چشم کے سمجھنے میں زمانے کے اُستاد تھے اور شیریں کلامی میں اپنے وقت کے فرہاد۔ موجد ناز و انداز کی تہ داریوں کے، اور اختراع کرنے والے چیتون کی جادو کاریوں کے۔ گانے میں دخل ایسا تھا، کہ اُستاد اس فن کے دم شاگردی کا مارتے تھے اور نادید کی باتوں میں بڑے بڑے گیانی ان کے آگے جی ہارتے تھے۔ بادشاہ کو ایسا اپنی طرف مصروف کر لیا تھا

کہ ایک دم کی جدائی ان کی جہاں پناہ کو شاق تھی اور آٹھ پہر طبیعت ان کی طرف مشتاق تھی۔ لیکن موافقت درانداز ی سے بدگویوں کی آخر آخر مبدل بہ غبارِ خاطر ہوئی اور خواہانِ جان نہ بباطن بلکہ بظاہر ہوئی۔ چنانچہ سنہ ۱۱۶۹ گیارہ سو انھتر ہجری میں ایک نمک حرام نے اُن ہی نوکروں میں سے انھیں کے عین صحن دولت خانہ میں بادشاہ کے قہر کیا کہ اس روشن زبان کی زندگی کے چراغ کو ایک ہی جھوکے میں کٹاری سے بجھا دیا، اگرچہ اس نااہل کا بھی اُسی جگہ لگ گیا ٹھکانا۔ لیکن افسوس ہے نواب امیر خاں کا مارے جانا۔ اکثر اربابِ فہم کو گمان تھا کہ یہ اشارہ بادشاہ کا ہے اور امر جہاں پناہ کا ہے۔ جب اس نمک حرام کی لاش کو اُٹھوانے میں بادشاہ نے نہایت کرم فرمایا، پھر تو عوام کو بھی اس گمان کا بے تامل یقین آیا۔

اس عالی طبیعت کو پہیلی اور مکرنی کے کہنے میں مشق حد سے زیادہ تھی اور اشعار فارسی اور ہندی میں بھلی چنگی استعداد تھی۔ یہ اشعار اس ستودہ اطوار کے آویزۂ گوش صغار و کبار ہیں ؎

کیوں بلایا بھیڑ میں کیا مجھ سے نادانی ہوئی
دخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی
کل محیطِ عشق کے صدموں سے پائی تھی نجات
کشتیِ دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی
ہر پری تمثال جوں آئینہ رکھتا تھا عزیز
ٹوٹتے ہی دل کے مجھ کو سخت حیرانی ہوئی
کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو
دوستداروں کی محبت دشمنِ جانی ہوئی
نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے
"کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی"

ٹک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم
منھ ترا تکتے ہیں سب اقلیم حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم
دل تو ہے داغِ غلامی سے ترے طاؤس وار
سامنے قمری کے گو ہیں سرو ساں آزاد ہم

اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا　　عمر مانند شرر جب کر چلے برباد ہم
ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاس تمکنت
شکر ہی، تڑپے نہ زیر خنجر فولاد ہم

۳- اُمید- قزلباش خاں- مترجم نے خاصہ اضافہ کیا ہے۔

۴ سطر- اشعر (ورق ۱۱- ب)

اُمید تخلص، نام اصلی اس معدنِ کمالات کا مرزا محمد رضا ہے۔ رہنے والا ہمدان کا ایام شباب میں وطن سے غربت اختیار کر کے وارد اصفہان کا ہوا ہے اور میرزا طاہر سے کہ وحید جن کا تخلص تھا نسبت شاگردی کی درست کر کے کسب کمالوں کا کیا ہے آخر سلطنت میں خلد مکان[1] کے ہندوستان میں آیا اور اول بادشاہت میں بہادر شاہ کے خطاب قزلباش خاں کے ساتھ رتبہ منصب ہزاری کا پایا، لیکن اس پائے سے ہمیشہ اس ایام میں شکوہ مند رہا ہے اور منصب ہزاری کے مضمون کو ایک بیت میں اس طرح سے موزوں بھی کیا ہے۔

مثل[2] بلبل کے ہوں سدا نالاں　　یہ مرا منصبِ ہزاری ہے

محمد معزالدین کے وقت میں کسی خدمت کی تقریب سے برہان پور گیا اور صوبہ داری میں امیرالامرا سید حسین علی خاں کی اس خدمت سے تغیر ہو کر خجستہ بنیاد میں حاضر ہوا۔ اس جگہ تھوڑا سا احوال مجمل سید حسین علی خاں کی امیرالامرائی کا اور صوبہ داری دکن کی جلوہ فرمائی کا بیان کرنا ضرور ہے، کس واسطے کہ تغیر ہونا قزلباش خاں کا بخوبی معلوم ہو گا۔ جب کہ سنہ ۱۱۳۲ گیارہ سو بتیس ہجری میں محمد فرخ سیر اور محمد معزالدین سے لڑائی ہوئی، تو سادات بارہ نے کمال جانفشانی کی، چنانچہ سید عبداللہ خاں اور

---

[1] یعنی اورنگ زیب عالمگیر ۱۲

[2] مثل بلبل ہمیشہ نالانم　٭　ایں بود منصبِ ہزاری ما

سید حسین علی خاں نے مع اپنے بھانجے بھتیجوں اور رفیقوں کے، حسن بیگ خاں صف شکن اور زین الدین خاں بہادر خاں کے بیٹے کو مع اُن کے رفیقوں کے، شریک کر کے ہلّا جو کیا، تو زنجیر سے توپ خانے کے گھوڑوں کو کُدا کُدا کے مقابل ذوالفقار خاں کے کہ بیٹا اسد خاں وزیر کا تھا، جا پہنچے، اور کُود کُود کے گھوڑوں پر سے جیسی چاہیئے تھی جاں نثاری کی، اور داد مردانگی اور شجاعت کی دی۔ اس میں توپیں بند ہوئی گئیں تھیں، باقی فوج سے بھی تن دہی ہوئی۔ حسن بیگ خاں صف شکن اور زین الدین خاں بیٹا بہادر خاں کا، یہ دونوں سردار مع اپنے رفیقوں کے بہادری کا حق ادا کر کے، کام آئے اور سید حسین علی خاں چور ہو کر کھیت میں بیٹھ گئے اتنے زخم اُٹھائے، بارے سادات کے سر لڑانے سے پانوں طرف ثانی کے اُٹھ گئے جو موئے سو موئے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ محمد معزالدین نے اپنی صورت بدل کر راہ دلّی کی لی، اور محمد فرخ سیر کو اللہ تعالیٰ نے سادات کی نمک حلالی سے سلطنت عطا کی۔ سید عبداللہ خاں، بھائی کو زخمی کھیت میں چھوڑ کر فوج کا تعاقب کیے چلے گئے ہیں اور بادشاہ بعد ایک ہفتہ کے داخل دلّی میں ہوئے ہیں۔ اس جانبازی کے عوض میں بادشاہ نے سید عبداللہ خاں کو وزیر اعظم کیا اور قطب الملک یار وفادار سید عبداللہ خاں بہادر ظفر جنگ خطاب دیا۔ اور سید حسین علی خاں کو میر بخشی ہونے کے سوا منصب ہفت ہزاری عنایت ہوا اور امیر الامرا سید حسین علی خاں بہادر فیروز جنگ خطاب ملا۔ بعد اس فتح کے جو خدمتیں کہ ان سے ہوئی ہیں اور جو نمک حلالیاں کہ اُنھوں نے کیں ہیں، مفصل بیان اس کا موجب طول کلام کا ہے اور کچھ متعلق بھی نہیں اس مقام کا ہے۔ غرض توجہ بادشاہ کی ازبسکہ ان پر حد سے زیادہ تھی، حاسدوں کو بس یہی عداوت کی بنیاد تھی۔ تھوڑے ہی سے دنوں میں بدگویوں نے ان کی طرف سے بادشاہ کے دل میں سیکڑوں شبہے ڈال دیئے غضب تو

یہ ہے کہ اس عقل مجسّم نے حاسدوں کے کہنے سے بے تامّل مان لیئے۔ پھر تو دشمنوں نے تدبیران کے توڑنے کی یہ ٹھیرائی کہ پہلے لازم دونوں بھائیوں میں ڈالنی جدائی۔ اس تقریب سے امیر الامرا سید حسین علی خاں کے واسطے تجویز صوبہ داری دکھن کی ہوئی اور رخصت حضور سے ۱۱۲۷ھ گیارہ سو ستائیس ہجری میں اس مروّت کے معدن کی ہوئی۔ ابھی دس کوس بھی دکن کی سمت گو نہیں تھی سواری گئی، کہ ساری دلّی پکارتی تھی "جگ پھوٹا اور خرد ماری گئی"۔ قصّہ مختصر بعد کتنے دنوں کے، اور طے کرنے منزلوں کے، جب نربدا سے عبور ہوا، تو ایک فوج عالی شان نے کر واسطے لڑائی کے سامنے داؤد خاں ناظم برہان پور ہوا کیوں کہ فرمانِ بادشاہی معرفت خان دوران خاں کے اس کو آگے ہی پہنچ چکا ہے، کہ دفعیّہ میں امیر الامرا سید حسین علی خاں کے اگر تجھ سے قصور ہوگا، تو گنہگار حضور کا ہے۔ سبحان اللہ! یہ داؤد خاں وہی ہے کہ اوائل سلطنت میں محمد فرخ سیر کے امیر الامرا نے اس کی جاں بخشی کروائی ہے اور احمد آباد گجرات سے اس کو باہر بھجوا کے سند صوبہ داری برہان پور کی حضور سے اس کے نام بھجوائی ہے۔ وہ حقِ احسان فراموش کر کے جاں بخشی کے عوض میں خواہانِ جان ہوا۔ چنانچہ ۱۱۲۷ھ گیارہ سو ستائیس ہجری میں گیارہویں تاریخ رمضان کی، لڑائی کا آراستہ میدان ہوا۔ بعد بہت سی خونریزی اور کشاکشی کے داؤد خاں نے بندوق کی گولی کھائی۔ بساط ہستی کی گنوائی اور امیر الامرا فیروز جنگ نے ساتھ فتح اور فیروزی کے اورنگ آباد میں داخل ہو کر مسند حکومت کی آرائش فرمائی۔ اس حرکت سے کہ برہان پور کے ناظم سے ہوئی تھی، آتے ہی اہلِ خدمت برہان پور کے سب تغیر کیئے۔ اس تقریب سے قزلباش خاں بھی معزول ہو کر حضور میں حاضر ہوئے۔ ازبسکہ سلیقہ علم مجلس کا اس مجموعۂ کمالات کو بہت بڑا تھا اور مزاج دانی میں امرا کے

بہ شدت دخل رکھتا تھا، طرز خدمت اس کی امیر الامرا کو نہایت پسند آئی اور داروغگی حکومت کرناٹک کی واسطے قزلباش خاں کے قرار پائی۔ اس تقریب سے ارکاٹ کو گیا اور ایک مدت بھر وہیں رہا۔ بعد زوال دولت سادات کے، کہ وہ قصہ مشہور ہے اور یہاں کچھ بیان اس کا نہیں ضرور ہے، قزلباش خاں نے رفاقت مبارز خاں کی کہ ناظم حیدر آباد کا تھا اختیار کی۔

چنانچہ ۱۱۳۷ھ گیارہ سو سینتیس ہجری میں، جب نواب نظام الملک آصف جاہ سے اور مبارز خاں سے میدان میں شکر کھیڑی کے کہ سات کوس اورنگ آباد سے ہے لڑائی ہوئی۔ قزلباش خاں بھی ساتھ تھا۔ مبارز خاں تو صیادِ اجل کا نخچیر ہوا اور قزلباش خاں دامِ ہستی میں پھنس کر دستگیر ہوئے۔ بعد کئی دن کے ایک غزل نواب کی تعریف میں اور اپنے عذر تقصیر میں لکھ کر بھجوائی۔ بندش اس غزل کی نواب آصف جاہ کو پسند آئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں پھر تو ایسی موافقت آئی اسی وقت بموجب حکم قید سے نجات ملی اور جاگیر قدیم بدستور سابق بحال ہوئی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر تو ایسی موافقت آئی کہ قلعہ داری ہنی فرگ کی نواب نے عنایت فرمائی۔ یہ قلعہ ہے علاقہ میں کرناٹک کے، وہاں ہیرے کی کھان تھی۔ چنانچہ کشنا جو ندی ہے، اس کے کنارے سے ہیرا نکال کے وہاں تراشتے ہیں۔ چند مدت اس معدنِ معانی نے ہیرے کی کھان کی داروغگی میں اوقات نہایت آب و تاب سے بسر کی اور اسی عرصہ میں رخصت حج اور زیارت کی لی۔ بعد حاصل کرنے سعادت زیارت کے جو آیا، نواب آصف جاہ کو ویسا ہی توجہ اور عنایت کے ساتھ پایا۔ جب کہ ۱۱۵۰ھ گیارہ سو پچاس ہجری میں نواب آصف جاہ حضور طلب ہوئے اور شاہ جہان آباد آئے، تو قزلباش خاں بھی ہمراہ رکاب کے تھے۔ اس میں کچھ شورش مرہٹوں کی تنبیہ کے لئے مامور ہوئے اور قزلباش خاں

اس سفر میں فقط پاسِ رفاقت کر کے جدا ولی سے مجبور ہوئے۔

میر غلام علی آزاد تخلص، سروِ آزاد جو اُن کا تذکرہ ہے، اُس میں لکھتے ہیں کہ:

جس ایّام میں نواب آصف جاہ کو بھوپال کے سفر کا اتفاق ہوا، تو فقیر بھی عازمِ حج کا تھا۔ اس قافلے کے پہنچنے کو عنایاتِ الٰہی سے سمجھ کر چلنا راہ کا اور اُترنا منزلوں کا باہم اختیار کیا۔ چنانچہ قزلباش خاں سے مکرر اور متواتر ملاقاتیں اس سفر میں ہوئیں۔ عجیب مجمع کمالات نظر آیا۔ باوصف ولایت زائی کے ہندی راگوں کے گانے اور سمجھنے میں نہایت طبع چست اور فہم درست رکھتا تھا اور خوش اختلاطی اور رنگین مزاجی میں بھی کوئی مقام اس سے نہیں چھوٹتا تھا۔ یہ لطیفہ اس کی زبانی ہے کہ:

"ایک دن میں نے کچھ شکایت زمانے کی نواب ذوالفقار خاں بیٹے نواب اسد خاں وزیر جو تھے اُن کے سامنے کی، سُن کر فرمانے لگے کہ "سچ ہے دنیا کو اُمید کے ساتھ بسر کرتے ہیں"۔ میں نے عرض کی کہ "اگر دنیا کو اُمید کے ساتھ بسر کرتے ہیں تو افسوس ہے کہ آپ مجھ بغیر دنیا کو بسر کرتے ہیں کہ میرا تخلص "اُمید" ہے"۔" غرض جب نواب آصف جاہ بھوپال میں پہنچے، تو فوج نے مرہٹے کی شدتیں کیں اور لڑائیاں مکرر ہوئیں۔ اس میں نادر شاہ کے آنے کا غلغلہ ہندوستان کی طرف ہوا۔ نواب آصف جاہ نے اس ایّام میں لڑائی کا طول دینا مناسب نہ سمجھ کے، ساتھ دارو مدا کے مصلحتاً صلح کی اور مع قزلباش خاں کے داخل شاہ جہان آباد میں ہوئے۔ آگے نادر شاہ کا آنا اور دلّی کا لوٹے جانا، مشہور ہے، یہاں کچھ بیان اس کا نہیں ضرور ہے۔ غرض جب والی ایران کا ایران کو گیا اور شہر میں امن و امان ہوا تو آصف جاہ حضور سے رخصت ہو کر پھر دکن کو سدھارے اور قزلباش خاں نوکری چھوڑ کر کمر کھول کر بیٹھ رہے، دلّی کی محبت کے مارے چند روز اور بھی ساتھ عیش و نشاط کے دیکھا جلوہ دم اور قدم کا، آخر سنہ ۱۱۵۹ گیارہ سو اُنسٹھ ہجری میں

سکتے کی بیماری سے لاچار گیا سفر ملک عدم کا۔ قریب آٹھ ہزار بیت کے زبان فارسی میں اس بلند طبع نے فکر کی ہے اور ہندی میں گاہ گاہ بطور اختلاط کے کبھی کوئی غزل کہی ہے۔ یہ اشعار اُس ستودہ اطوار کے ہیں :

بانازِ حور و حسنِ ملک، جلوۂ پری — باہمن کی بیٹی ایک مری آنکھ میں کھڑی[1]
رفتم بہ پیش و گفتم "جانم فدائے تست" — غصہ گیا، وگالی دیا اور دگر لڑی
ایسی نہ سیتا اور نہ بھوانی نہ رادھکا — کرتار[2] نے نہ ایسی کوئی دوسری گھڑی
گفتم کہ "تیرے پانوں پڑم اور بلا لیم" — گفتا کہ "ڈاڑھی جار[3] مغل تجھ کو کیا پڑی"

گفتم "امیدِ وصل پہ ہم تیرے جیتا ہوں"
گفتا کہ "چل پرے دئی مارے سبھے مری"

ولہ

در و دیوار سے اب صحبت ہے — یاربن گھر میں عجب صحبت ہے
دل ہمارا اسے کرتا ہے رات — غیر سے جو سرِ شب صحبت ہے
دردِ دل اس سے جو ہم نے نہ کہا — ایسی حاصل ہوئی کب صحبت ہے
دہر میں پاسِ نفس لازم ہے — شیشہ و سنگ یہ سب صحبت ہے

دستِ اغیار سے زیرِ سرِ یار
آج اُمید کو ڈھب[4] صحبت ہے

۵ - آرزو - سراج الدین علی خاں - مترجم نے خاصہ اضافہ کیا ہے - ۲½ سطر - ۴ شعر (ورق ۱۲ - الف)

آرزو تخلص سے سراج الدین علی خاں نام، متوطن اکبرآباد کے۔ باپ کی طرف سے

---

[1] اور تذکروں میں کھڑی کی بجائے "پڑی" ہے جو "درنظرم افتاد" کا ترجمہ ہے ۱۲
[2] کرتار یعنی خدا ۱۲ [3] یعنی ریش سوختہ ۱۲ [4] یعنی کڈھب ۱۲

سلسلہ اس بزرگوار کا شیخ کمال الدین، بھانجے سے شیخ نصیر الدین کے، کہ چراغ دہلوی جن کا لقب تھا، ملتا ہے اور ماں کی طرف سے شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری کو پہنچتا ہے۔ چھوٹی عمر سے طبیعت اس بزرگ زادے کی پڑھنے لکھنے کی طرف مصروف تھی۔ چنانچہ چودھویں برس شعر کہنا شروع کیا اور چوبیس برس کی عمر تک جتنی کتابیں درسی اور ضروری تھیں پڑھ چکا، فاضلوں سے عصر کے جس قدر کہ فائدہ چاہیئے تھا اٹھایا اور مرتبہ کو استعداد کے نہایت بلندی کو پہنچایا۔ بعد تحصیل علم کے بادشاہی منصب داروں میں داخل ہو کر وطن سے دور ہوا، یعنی اوائلِ سلطنت میں محمد فرخ سیر کی گوالیر کی خدمتوں میں سے ایک خدمت کے ساتھ مامور ہوا۔ ۱۱۳۰ھ گیارہ سو تیس ہجری تھی کہ دار الخلافہ ہندوستان میں آیا، اور زور شور شاعری کا زباں دانوں کو وہاں کے دکھایا۔ چنانچہ ۱۱۴۷ھ گیارہ سو سینتالیس ہجری میں کہ شیخ محمد علی حزیں علیہ الرحمۃ ایران سے شاہ جہان آباد میں تشریف لائے تو اُس یگانۂ روزگار کی ملاقات کو شاہ و گدا سب آئے۔ سراج الدین علی خاں سے جس قدر اخلاق کہ مناسب اُن کے حال کے پایا شیخ نے ادا فرمایا۔ لیکن اس بزرگ زادے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی اور ناحق اپنی طبیعت اُن سے محجوب کی۔ آزردہ خاطر وہاں سے گھر آئے اور دیوان شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعر سقیم ٹھیرائے۔ چنانچہ وہ سب اعتراض جمع کر کے ایک رسالہ لکھا ہے اور نام اُس کا "تنبیہ الغافلین" رکھا ہے[۱]۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے، نہیں تو صاف نزاع معلوم ہوتی ہے، جب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے۔ غرض شاعر زبردست اور صاحب استعداد تھا، اکثر مضمون میں سے مضمون کرتا ایجاد تھا۔ لطیفہ گوئی اور ظرافت میں بہ شدت مشتاق

---

[۱] مولوی امام بخش صہبائی نے ایک رسالہ "قولِ فیصل" نام لکھا ہے، جس میں خان آرزو کے اکثر اعتراضات کے جواب دیئے ہیں ۱۲

خوش طبعی اور رنگین مزاجی میں شہرۂ آفاق تھا۔ اگرچہ سررشتہ ملاقات کا ان کو ایک جہان سے تھا، لیکن توسّل امورات دنیا میں نواب اسحٰق خاں سے تھا۔ بعد خراب ہونے شاہ جہان آباد کے نواب سالار جنگ کے ایما سے لکھنؤ میں آئے، لیکن فلک نیرنگ باز نے نیرنگی ہی کے رنگ دکھائے۔ چنانچہ لکھنؤ میں وصال ہوا ہے اور لاش کو اُن کی، بموجب اُن کی وصیت کے نواب سالار جنگ نے بعد سپردگی شاہ جہان آباد کو بھجوا دیا ہے۔ بہت سی کتابیں اس ماہر فنون نے تالیف کی ہیں۔ اتنی تو نگاہ سے راقم عاصی کے بھی گزری ہیں:۔ فنِ معانی میں ایک رسالہ لکھا ہے کہ نام اُس کا "موہبتِ عظمیٰ[۱]" ہے اور فن بیان میں ایک رسالہ اس کی تصنیف سے مشہور "عطیۂ کبریٰ" ہے اور ایک فرہنگ لکھی ہے، نام اس کا "سراج اللغت" ہے بطور برہان قاطع کے اور سوائے اس کے جال کی اصطلاحات میں ایک نسخہ تالیف کیا ہے کہ مشہور ہے "چراغ ہدایت" کر کے۔ شرح اسکندر نامہ کی اور قصائد عرفی کی لکھی ہے اور گلستان کی شرح کہ نام اُس کا "خیابان" ہے، تالیف کی ہے۔ ایک تذکرہ[۲] فارسی گویوں کا نہایت لطیفوں کے ساتھ لکھا ہے۔ سوائے اس کے اور بھی بہت کچھ تحریر کیا ہے۔

۱۱۶۹ھ گیارہ سو اُنہتر ہجری میں اس فراغ پڑھنے والے مدرسۂ زندگی کے نے کتاب ہستی کو گردان کے اُستاد اجل سے درس فنا کا پڑھا۔ قریب تیس ہزار بیت کے زبان فارسی میں اس کو کہنے کا اتفاق ہوا ہے اور ریختہ کا قصد گاہ گاہ بطریق تفنن کے کیا ہے۔ یہ اشعار ہندی طبع زاد اُس کے مشہور ہیں:

میخانہ بیچ جا کر شیشے تمام توڑے ؎ زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

جان کچھ تجھ پر اعتماد نہیں ولہ زندگانی کا کیا بھروسا ہے

آتا ہے صبح اُٹھ کر تیری برابری کو ؎ کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

دل مارنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیا گری کو

---

[۱] یہ رسالہ چھپ گیا ہے ۱۲ [۲] اس تذکرے کا نام "مجمع النفائس" ہے ۱۲

اس تند خو صنم سے ملنے لگا ہے جب سے — ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو
اپنی فسوں گری سے اب ہم تو ہار بیٹھے — بادِ صبا یہ کہنا اُس دل رُبا پری کو
"اب خواب میں ہم اُس کی صورت کو ہیں ترستے
اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو"

فلک نے رنج تیرِ آہ سے میرے زبس کھینچا — دلہ لبوں تک دل سے شب نالے کو میں نے نیم رس کھینچا
مرے شوخِ خراباتی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو — بہارِ حسن کو دی آب اُس نے جب چرس کھینچا
رہا جوشِ بہار اس فصل گر یوں ہی تو بلبل نے — چمن میں دستِ گلچیں سے عجب رنج اس برس کھینچا
کہا یوں صاحبِ محمل نے سُن کر سوزِ مجنوں کا — "تکلف کیا جو نالہ بے اثر مثلِ جرس کھینچا
نزاکت رشتۂ الفت کی دیکھو سانس دشمن کی
خبردار آرزو ٹک گرم گر تارِ نفس کھینچا"

۲- اشتیاق - ولی اللہ سرہندی۔ گلشنِ ہند میں ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ گلزارِ ابراہیم کے دونو مخطوطوں میں حسب ذیل جملے ہیں جن کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ مترجم نے اپنی طرف سے خاصی ہجو کی ہے:- (ورق ۱۲-الف)

"اشتیاق تخلص - سرہندی - اسمش ولی اللہ از سلسلۂ مجدد الف ثانی ست - وجدش شاہ محمد گل و در کوٹلہ فیروز شاہ می ماند و درویشانہ می زیست - کمتر شعر فارسی و بیشتر شعر ہندی می گفت - از وست" کل ۳ شعر نقل کئے ہیں جو گلشنِ ہند کے شعروں میں سب سے آخر ہیں۔

اشتیاق تخلص، شاہ ولی اللہ نام، متوطن سرہند کے۔ اس رونق بخشِ دینِ احمدی کا سلسلۂ ارادت شیخ احمد کو، کہ مجدد الف ثانی جن کا لقب تھا، پہنچتا ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے

شاہ محمد گل کو جد اِن کا لکھا ہے، لیکن راقم حقیر کے گوش زد یہ مضمون نہیں ہوا ہے۔ فی الحقیقت مرتبہ علم کا اس عالی جناب کے نہایت بلند تھا خصوص علم حدیث اور تفسیر میں بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ اسم گرامی اس برگزیدۂ روزگار کا زبانِ خلائق پر آج کے دن تک شاہ ولی اللہ محدث کر کے جاری ہے۔ اکثر کتابیں تصنیف اس بحر علم کی مشہور ہیں چنانچہ دو نسخے کہ ایک کا نام "قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسینؓ" ہے اور دوسرے کا نام "جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ" کہتے ہیں۔ تصنیفات سے اس محی الدین کی یادگار صفحۂ روزگار پر ہیں۔ والدماجد ہیں یہ اُس رونق بخش کشورِ قناعت کے، کہ جس کا نام نامی مولوی عبدالعزیز ہے۔ آج کے دن تک قدمِ توکل گاڑے ہوئے شاہ جہان آباد میں بیٹھے، باوصفیکہ تفضیل حسین خاں مرحوم نے موجب ایما صاحبانِ عالی شان کے مدرسۂ قدیم کی مدرسی کے واسطے تحریک اس مرکزِ دائرۂ قناعت کی چاہی، لیکن اس قطب آسمانِ ملت و دین نے مطلقاً حرکت جگہ سے نہ فرمائی۔ اس فاروق زماں کی بھی تالیف سے ایک کتاب ہے، کہ نام اُس کا "تحفہ اثنا عشریہ" ہے اور دوسرا نام "رد روافض" شاید کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے دیکھے سے اس کتاب کے استعداد اس بزرگ زادے کی معلوم ہوتی ہے کہ کیا دریا فصاحت کا بہایا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے۔ فی الواقع کہ عالی مقداروں کے عالی مقدار ہی ہوتے ہیں اور نابکاروں کے نابکار، بقول ایک شاعر کے۔

شیر کے بچے میں غرش شیر سے افزود ہے
بھونکنے میں کتے کی بلی کی سگی موجود ہے

لہ دونوں نام غلط ہیں۔ پہلی کتاب تفضیل شیخین میں ہے۔ شہادت امام حسین علیہ السلام کی ابطال سے خدا نخواستہ اس کو کوئی تعلق نہیں اور دوسری کتاب تو بالکل فرضی ہے۔ معاویہ کے مناقب میں ان کی کوئی کتاب نہیں ۱۲

لہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ دونوں کی مصنف نے ہجو ملیح کی ہے اور اس شعر نے تو صاف پردہ اُٹھا دیا ہے ۱۲

الغرض وہ جامع جمیع علوم یعنی شاہ ولی اللہ مرحوم حین حیات میں اپنی کوٹلہ میں فیروز شاہ کے تشریف رکھتے تھے۔ اوقات شریف کو بطور درویشان اہل معنی کے بسر کرتے تھے۔ اشعار فارسی کے فرمانے کا اتفاق کمتر ہوتا تھا اور زبان ریختہ کا مشغلہ اکثر۔ یہ اشعار خلاصۂ افکار اُس حقیقت آگاہ کے ہیں:

خیال دل کو ہے اُس گل سے آشنائی کا
نہیں صبا کو ہے دعویٰ جہاں رسائی کا
کہیں وہ کثرتِ عشاق سے گھمنڈ میں آ
ڈروں ہوں میں کہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا
مجھے تو ڈھو کے تھا زاہد پہ اک نگاہ سے آج
غرور کیا ہوا وہ تیری پارسائی کا
جہاں میں دل نہ لگانے کا نیوے پھر کوئی نام
بیاں کروں میں اگر تیری بے وفائی کا
نہ چھوڑا مار بھی کھا کر گزر گلی کا تری
رقیب کو مرے دعویٰ ہے بے حیائی کا
نہیں خیال میں لاتے وہ سلطنت جم کی
غرور ہے جنھیں در کی تری گدائی کا

جفائے یار سے مت اشتیاق پھیر کے منھ
خیال کیجو کہیں اور جبہہ سائی کا

لڑکوں کے پتھروں سے لگے کیونکہ اس کو چوٹ
ہر ایک گرد باد ہے مجنوں کو ڈھول کوٹ[۱]
جوڑ کر تجھ کو ہمیں غیر سے جو لاگ لگی
نہیں مہندی یہ ترے تلووں سے ہی آگ لگی
دوبالا ہو کے مخموری عبث آنکھوں کو ملتا ہے
پیالہ اور بھی پی پی سجن یہ دَور چلتا ہے

۷- آبرو - شاہ نجم الدین - مترجم نے حالات میں اضافہ نہیں کیا
نمونۂ کلام میں کیا ہے۔ ۳ سطر ۳۴ شعر

(ورق ۱۲، ۱۳ - الف، ب)

آبرو تخلص، شاہ نجم الدین نام، ساکن شاہ جہان آباد۔ اولاد میں شیخ محمد غوث گوالیری کے تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ داران قریب میں اور صاحب دیوان تھے

---

[۱] یعنی طعنہ دیتا تھا ۱۲

زبان ریختہ کے۔ ترکیب میں بیشتر اشعار اُنھوں نے ایہام کے کہے ہیں یعنی اکثر وہ الفاظ شعر میں لائے ہیں کہ جن لفظوں کے دو معنی ہیں۔ اگرچہ بامعنی یا لایعنی۔ محمد شاہ فردوس آرامگاہ کے عہد سلطنت میں اُنھوں نے جہان فانی سے رحلت کی ہے۔ ان شعروں نے آبروان کو دی ہے ؎

خوب رویوں کے ہوا حق میں یہ تب کرنا دوا — تیرگی جاتی رہی چہرے کی اور آئی صفا
کیا سبب تیرے بدن کے گرم ہونے کا سجن — عاشقوں میں کون جلتا تھا گلے کس کے لگا
تو گلے کس کے لگی لیکن کسی بے رحم نے — گرم دیکھا ہوگا تجھ کو بیچ میں آنکھوں کے لا
آہِ سرد اور چشمِ تر عاشق کی سی وسواس کر — بدبہت ہی مختلف جس وقت ہو آب و ہوا
دل مرا تعویذ کر تو لے کے اپنے پاس رکھ — تو طفیلِ حضرت عاشق تجھے ہووے شفا
تُرش روئی چھوڑ دے اور تلخ گوئی ترک کر — اور کھانا جو کہ ہو خوش[۱] کا تری سو کر غذا

بوعلی ہے نبض دانی میں بتاں کے آبرو
کیوں نہ ہووے عاشقی میں اس کا نسخہ کیمیا

بوسہ لبوں کا دینے کہا کہہ کے پھر گیا — پیالہ بھرا شراب کا افسوس گر گیا

قول آبرو کا تھا کہ "نہ جاؤں گا اُس گلی"
ہو کر کے بے قرار دیکھو[۲] آج پھر گیا

وعدے تھے سب خلاف جو اس لب سے ہم سنتی — دلہ — کیا لعل قیمتی دیکھو جھوٹا نکل گیا
یہ سبزہ اور یہ آبِ رواں اور ابر یہ گھرا — دلہ — دوانا نہیں[۳] کہ میں گھر میں رہوں گا چھوڑ کر صحرا

۱؎ "خوش کا تری" یعنی "تیری مرضی کا" "خشکہ" کا ایہام بھی مقصود ہے ۱۲

۲؎ "دیکھو" کو "دِکھو" پڑھنا چاہیئے۔ ورنہ مصرعہ ناموزوں ہوگا ۱۲

۳؎ "نہیں" کو "نہ" کے لہجہ میں پڑھنا چاہیئے ۱۲

چوپڑ کے کھیلنے کا سارا یہ ہے خلاصہ[۱] — شاید کبھو وہ سر کا بیٹھے ہمارے پاسا
تم اور گلرخوں سے اب آنکھ جو لگائے — بادام کو پیارے پھولوں کے بیچ باسا
پی کر شراب جو تم ہم کو ڈراوتے ہو — کیا شوق کو ہمارے جانا ہے اور کا سا

ولہ

جھپٹ آیا میں رقیبوں کو گویا مار دیا — یار نے اپنے گلے کا مجھے جب ہار دیا
رکھے کوئی اس طرح کے لالچی کو کب تلک بہلا — چلی جاتی ہے فرمایش کبھی یہ لا کبھی وہ لا

ولہ

میرے پیارے سے قاصد اپنے دل کی بات جا کہنا — کہ جانے سے تمھارے جان کو مشکل ہے اب بہنا
نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے — کہ اس کو بدنما لگتا ہے جیسے چاند کو گہنا

ولہ

سیج اوپر غیر کے رہتا ہے اب لوٹا ہوا — زر کے لالچ اس قدر وہ سیم تن کھوٹا ہوا
جو لونڈا نام سن امرد پرستی کا چڑھے چنگے — ہیں اس کو پیچ دے باتوں میں لگ جاتا ہوں[۲] لاسا
عاشقوں میں جس کسی کا یار ہو راضی مرا — وہ مرا دشمن ہے لیکن چاہتا ہے جی مرا
جس طرح سے اے نامہ بر آیا ہے چلا جا — جا کر کے یہ کہہ کل نہیں آیا ہے تو آ جا
فرہاد کا دل کوہ کو مے کا بھرا پیالہ ہوا — مستی سے جس کی شوق کی ہر سنگ متوالا ہوا
کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوگی — اس دلِ بے قرار کی صورت
زندگی ہے سراب کی سی طرح — باؤ بندی حباب کی سی طرح
کون چاہے گا گھر بسے تجھ کو — مجھ سے خانہ خراب کی سی طرح
آبرو کے قتل کو حاضر ہوا کس کر کمر — خون کرنے کو چلا عاشق پہ تہمت باندھ کر
جس وقت زخم تیرا لگتا ہے غیر کے تئیں — اس وقت جان سیتی جاتے ہیں جان مرہم
دھمکاوتے ہو ہم کو کمر باندھ باندھ کر — کھولے ابھی تو جائے میاں کا نکل بھرم

---

۱ یعنی چوپڑ کھیلنے سے سارا مقصد یہ ہے ۱۲ ۲ قدما "کوئی" کو "کُئی" کے لہجہ میں ادا کرتے تھے۔ یہاں بھی اسی طرح پڑھنا چاہیے ورنہ مصرعہ ناموزوں ہوگا ۱۲ ۳ اس شعر سے اس زمانے کی اخلاقی حالت ظاہر ہوتی ہے ۱۲

کن نے آ باغ میں حیران کیا نرگس کو
نہیں معلوم کہ یہ دیکھ رہی ہے کس کو

کہتا ہوں میں پکار، سنو کان دھر سجن
جو اور سے ملوگے تو دیکھو گے ہم نہیں

ہرگز ترے لبوں کی سرخی کے تئیں نہ پہنچیں
ہر چند سعی کر کر یاقوت و لعل مرجائیں

اک عرض سب سے چھپ کر کرنی ہی ہم کو تم سے
راضی ہو گر کہو تو خلوت میں آ کے کر جائیں

لٹک چلنا سجن کا بھولتا مجھ کو نہیں اب تک
طرح وہ پاؤں رکھنے کی مری آنکھوں میں پھرتی ہے

زلف کے عقدے کھلے اب اور بھی مشکل ہوئی
دل کے اوپر یہ نئے سر سے بلا نازل ہوئی

میاں[1] کے لوگ کہتے ہیں کمر ہے
کہاں ہے، کس طرح کی ہے، کدھر ہے

دل کب آوارگی کو بھولا ہے
خاک گر ہو گیا بگولا ہے

پھرتے ہی پھرتے دشت دیوانے کدھر گئے
وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

مژگاں تو تیز تر ہے ولیکن جگر کہاں
ترکش تو ہیں بھرے یہ نشانے کدھر گئے

نازک تنی پہ اتنے مغرور ہو رہے ہو
موسی کمر نہیں تو فرعون کر رکھا ہے

اُٹھ چیت کیوں جنوں ستی خاطر نچنت کی
آئی بہار تجھ کو خبر ہے بسنت کی

۸ - **افضل** - محمد افضل - از قدماست برگوپال نامی عشق ورزیدہ حسب حالِ خود بارہ ماسہ مشہور بہ بکٹ کہانی منظوم نمودہ
ایں بیت از انجاست :- (ورق - ۱۳ - ب)

مسافر سے جنھوں نیں دل لگایا
اُنھوں نے سب جنم روتے گنوایا

۹ - **احمد** - گجراتی معاصر ولی دکھنی بود - مہارت بزبان سنسکرت و بھاکا داشت گاہے ریختہ نیز می گفت - از وست :- (ورق ۱۳ - ب)

احمد بتا میں کیا کروں اب راہِ عشق میں
سر پر تو سانجھ پڑ گئی اور پاؤں تھک گئے

---

[1] یہ شعر بہ ادنیٰ تغیر جرأت کی طرف منسوب ہے ۱۲

۱۰- **امجد** - از قدماست - احوالش بنظر نیامدہ از وست (ورق ۱۳، ب)

سنتا تھا جسے کعبہ و بت خانہ میں آخر　　امجد میں اُوسی حضرتِ انسان میں دیکھا

۱۱- **انصاف** - احوالش معلوم نیست - بعہد محمد شاہ فردوس آرام گاہ بود

از وست (ورق، ۱۳، ب)

واقف تھے ہم کہ عشق کے شیوہ میں جس نہیں　　پر کیا کریں کہ دیدہ و دل اپنے بس نہیں

۱۲- **اشرف** - معاصر شاہ نجم الدین آبرو بود از وست (ورق-۱۴، ا)

پی پل میں نیم خواب ہو در بزدی کالیاں　　اس غم سے خاک عاشقاں سیسوں پہ ڈالیاں

۱۳- **اشرف** - اسمش محمد اشرف از موزونانِ عہد شاہ عالم بادشاہ است

نظمے موسوم بہ بٹیر نامہ بوے منسوب ست (ورق ۱۴-ا)

آبیٹھ تو دو باتیں کریں تم سے میاں ہم　　پھر دیکھئے ایک دم میں کہاں تم ہو کہاں ہم

۱۴- **آزاد** - اسمش خواجہ زین العابدین - در زمان محمد شاہ فردوس آرامگاہ

بود - از وست (ورق ۱۴ الف)

جبھی بلبل نے چھوڑی شعلہ آواز کی چنگی　　تبھی گلشن میں سارے جل اٹھے گل اور کنول دھکے

۱۵- **آزاد** - اسمش میر مظفر علی - راقم حقیر میر مذکور را مکرر در مرشد آباد

دیدہ - در ہنگامیکہ بر نزاکت کنیزے عاشق و منازعہ با بتیا بیگم

داشت بمعاملہ او مرجوع با فقیر بود از وست (ورق ۱۴-ا)

پوچھتے کیا ہو کہ بیداد کروں یا نہ کروں　　یہ تو فرماؤ کہ فریاد کروں یا نہ کروں
وعدۂ وصل تو کرتے ہو وے سچ کہیو　　دل کو اس وعدہ سے میں شاد کروں یا نہ کروں
خانہ یک دم کے لئے سیل پہ مانند حباب　　متحیر ہوں کہ بنیاد کروں یا نہ کروں

مرغِ دل تیری جدائی سے پڑا تڑپے ہی   اس کو کیا حکم ہے آزاد کروں یا نہ کروں

۱۶- **افصح** - اسمش شاہ فصیح - از تلامذۂ مرزا بیدل بود - عمرے دراز یافتہ بحال درویشی در لکھنؤ تکیہ ساختہ می گزرانید- بہ سال یک ہزار و یک صد و نود و دو انتقال نمود شعر فارسی و ریختہ می گفت و مشہور بہ شاہ فصیح بود- از وست:-

(ورق ۱۴ اُ، ب)

کر یاد تجھے جدھر گئے ہم   ہمتو نہ رہے کدھر گئے ہم
زاہد سوئے کعبہ ہم سوئے دیر   ایدھر نہ گئے اودھر گئے ہم

جب ہوئے تجھ سے جدا جیتے ہیں کیا مرتے ہیں
زندگانی بھی کہاں ہو کے دن بھرتے ہیں

کیا بلا شوخ کی قامت دیکھی   ہم نے جیتے ہی قیامت دیکھی

۱۷- **آثمی** - دہلوی، اسمش خواجہ برہان الدین از مشاہیر مرثیہ گویانِ دہلی ست و ریختہ بشیوۂ قدما می گفت - این چند بیت از میر حاجی خلف خواجۂ مذکور بدست آمدہ از وست: (ورق ۱۴ ب)

میں وہ بلبل ہوں جو صیاد کے گھر بیچ پیدا ہوا
جہاں میں آنکھ جوں کھولی قفس ہی آشیاں دیکھا

اس طرح شوخ کی مژگاں ہیں میرے دل میں چبھی
جیوں کہ ترکش میں ہو ہیں تیروں کا پیکاں یکجا

چمن کے تخت اوپر جب شہِ گل کا تجمل تھا   ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اور شور تھا غل تھا

خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہیں جز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

صاف دل ہونا بہت دشوار ہے آئینہ بھی عکس سے خالی نہیں

تمہارے سیتلا کے داغ پیارے عجب ہی چاند میں نکلے ہیں تارے

۱۸- **انسان** - دہلوی، نامش اسد یار خاں معروف بہ میر جگنوں، خلف لطف علی مرحوم - از نیکانِ روزگار و منسلکان سرکار احمد شاہ بادشاہ بود - بیشتر بمرثیہ گفتن رغبت دارد

از دست :- (ورق ۱۴ ب)

زمین و آسماں اور مہر و مہ سب تجھ میں ہے انساں
نظر بھر دیکھ مشتِ خاک میں کیا کیا چمکا ہے (؟)

۱۹- **احسن** - نامش احسن اللہ، معاصرِ آبرو بود - بطرزِ او گفتگو می کرد بوارستگی و حسن پرستی اتصاف داشت از دست : (۱۵-ا)

کھول کر بند قبا کو ن ملکِ دل غارت کیا کیا حصار قلب دلبر نے کھلے بند دل لیا

یہی مضمونِ خط ہے احسن اللہ کہ حسنِ خوبرویاں عارضی ہے

۲۰- **احسن** - میرزا احسن علی - مترجم نے اضافہ کیا ہے - ۳ سطر ۲ اشعر (۱۵-ا)

احسن تخلص، میرزا احسن نام، جوان نیک خصلت ہے - ابتدا میں میر رضا سے اتفاق اصلاح کا ان کو ہوا ہے - بعد اس کے میرزا محمد رفیع سودا سے مشورہ سخن کا کیا ہے ریختہ

ان کا خالی کیفیت سے نہیں ہے، اور بندش شعر کی صاف اور شیریں ہے۔ فی الجملہ غربت بھی رکھتے ہیں اور نستعلیق وغیرہ اکثر اکثر خطوط بھلے چنگے لکھتے ہیں۔ ابتدا میں وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کی سرکار میں سررشتہ ملازمت کا رکھتے تھے۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ سنہ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ایک مدّت سے نواب سرفراز الدولہ میرزا احسن رضا خاں بہادر کی رفاقت میں ایام زندگانی کے بسر کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں بود و باش ہے اور یہ ان کا منتخب تلاش ہے۔

ہجر میں کیوں کر نہ ہووے آہ و زاری بیشتر
ہے قرار اس دل میں کم اور بیقراری بیشتر

کیوں تفکر دین و دنیا دل ہمارا بھول جائے
یاد رہتی ہے ہمیں پیارے تمھاری بیشتر

بیشتر تھی ہم کو اُس سے دوستی اک طرح کی
اب تو تبلاوے ہے تلوار و کٹاری بیشتر

روزِ ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روتے ہیں ہم
وصل کی راتیں کٹیں یوں ہی ہماری بیشتر

بن کے خاک اب اُس کے کوچے سے بھلا کیونکر اُٹھے
ہے مزاج اپنے میں احسن خاکساری بیشتر

نہ نالہ ہے دل میں، نہ آہِ حزیں ہے
کوئی دم ہے یاں، سو دمِ واپسیں ہے

گئے دن جو آنکھوں سے بہتے تھے دریا
ادھر دیکھ لو، خشک اب آستیں ہے

گیا دل جو کوچے میں چیں جبیں کے
نہ پھر وہاں سے نکلا عجب سرزمیں ہے

قدم رکھ نہ اپنا مرے دل سے باہر
کہا مان میرا، یہ گھر دل نشیں ہے

نہ کھینچ آسماں پر سر اپنا تو احسن
سمجھ آخرش سب کا مدفن زمیں ہے

یارو وہ صنم کیوں نہ کرے کام خدا کا
رام اُس کا خدا ہے وہ نہیں رام خدا کا

سر اپنے کو جیوں لے گئے ہم اُس کے قدم تک
پہنچا دیا ٹھوکر میں وہیں ملک عدم تک

سجدہ گہ ہے خاکِ احسن اب تو سارے خلق کی
جان دی تھی اُس نے کس کی حسرتِ پابوس میں

دل ہو دیدار سے مایوس تو مسرور نہ ہو
چشم میں روشنیِ طور سے بھی نور نہ ہو
بزم میں اُس کی جو ہوتی ہے کبھی سرگوشی
دل دھڑکتا ہے کہ میرا کہیں مذکور نہ ہو
ہے مجھ میں رمق، دیدہ بجھے تا نگراں ہے
جیوں شمع مرا تارِ نگہ رشتۂ جاں ہے
محروم ہم ہوں، محرمِ اسرار ہو کوئی
خلوت میں ہو کوئی، پسِ دیوار ہو کوئی
راتوں کو اُس کے کوچہ میں جاتا تو ہوں ولے
دھڑکے ہے دل پڑا کہ نہ بیدار ہو کوئی
پہنچی جس وقت مجھے اس کی خبر آنے کی
سدھ رہی مجھ کو نہ اپنے کی نہ بیگانے کی
تم تو دل مانگو ہو، یاں جان تلک حاضر ہے
بات یہ بھی ہے کوئی آپ کے فرمانے کی

۲۱۔ **آشنا**۔ دہلوی اسمش میر زین العابدین۔ معاصر و معاشر
سراج الدین علی خاں آرزو بود ازوست (۱۵۔ ب)

گرہم سے دیوانوں کو تم آزاد کرو گے ٭ ویرانے میاں کتنے ہی آباد کرو گے

۲۲۔ **آشنا**۔ درویشے بود۔ احوالش معلوم نیست۔ ازوست
(۱۵۔ ب)

کبھو تو مہرباں ہو ہم پہ اے بت ٭ کہ آخر ہم بھی ہیں بندے خدا کے

۲۳۔ **الہام**۔ نامش فضائل بیگ۔ از تلامذہ شاہ عبدالولی عزلت سورتی
بعہد احمد شاہ بن محمد شاہ مرحوم بود ازوست (۱۵، ب)

اے عندلیب جاکے چمن میں کرے گی کیا
بادِ خزاں سے سب گل و گلزار جھڑ گئے

(اس شاعر کا ذکر اس مخطوطہ میں حاشیہ پہ کیا گیا ہے لیکن دوسرے مخطوطہ میں
متن ہی میں سلسلہ کے ساتھ ہے (مرتب))

۲۴۔ **الہام**۔ شرف الدین۔ مترجم نے اضافہ کیا ہے۔ ۲½ سطر۔ اشعر (۱۵۔ ب)
الہام تخلص، شیخ شرف الدین نام، لکھنؤ کے شیخ زادوں میں سے ہیں صغر سن سے دیکھتا ہوں

ان کو اسباب دنیا سے قانع بہ یک چادر ہیں اور سر و پا برہنہ بیٹھے رہتے خاک پر ہیں۔ زود گوئی کی مشق اس مرد کو حد سے افزود ہے یہاں تک کہ مصرع نہیں لکھا جا چکتا کہ دوسرا موجود ہے اسی طرح سو سو بیت تک ایک دریا جوشش مارتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس زود گوئی کے باعث اکثر کلام ان کا گفتگو میں بھی آتا ہے۔ دو دیوان فارسی زبان میں رکھتے ہیں اور ہندی میں بھی اکثر کچھ کچھ کہتے ہیں۔ آگے ملول تخلص کرتے تھے۔ اب تخلص الہام ہے۔ بیشتر اہل لکھنو کو شاگردی کے سوائے ان سے اعتقاد تمام ہے۔ یہ غزل ان کی جو لکھی جاتی ہے، البتہ ایک عالم کو اضطرار دل کا دکھاتی ہے۔

دیکھا نہ ہو جس نے کبھو سیماب کا عالم
آ دیکھے وہ میرے دلِ بیتاب کا عالم

ابر مژہ ناصحوں کی ضد سے تو یک بار
سب ارض و سما آوے نظر آب کا عالم

یاقوت کی رنگت پہ کبھی آنکھ نہ جائے
دکھلاؤں اگر چشم کے خوناب کا عالم

گل پرتوِ حسنِ رخِ دلدار کے آگے
پھیکا نظر آیا ہمیں مہتاب کا عالم

مانی ترا واللہ[۱]
ہو بندا
کھینچے تو اگر دل کے تپ و تاب کا عالم

اری بیکسی تیرے قربان ہوں
برے وقت میں ایک تو رہ گئی

۲۵-آگاہ - دہلوی نامش محمد صلاح - بہ عہد محمد شاہ فردوس آرامگاہ۔ در دہلی می گزرانید۔ از وست ع (۱۵، ب)

پیری میں کروں سیر جہاں کا تو بجا ہے
دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزرہی کا

۲۶-آگاہ - اسمش نور خاں - جوانے ست قصہ خواں نسبت شاگردی در فن قصہ خوانی با میر احمد قصہ خوان مشہور و در شعر با میر ضیاء الدین

---

[۱] اصل نسخہ میں سادہ جگہ چھوڑ دی ہے غالباً "یہ الہام" کا لفظ تھا ۱۲

ضیاء دارد ازوست۔ (۱۶۔ ل)

حلقۂ چشم میں کیوں آج ہے دم پا بہ رکاب

ہے کہاں کا ہمیں درپیش سفر دیکھیں تو

۲۷۔ **افغان** ۔ اسمش الف خاں۔ بآئین درویشی عمر می گزرانید

ازوست (۱۶۔ ل)

پہلے قدم میں عشق کے میرا تو جی گیا

مجنوں یہ چند روز بھلا کیونکہ جی گیا

آئینہ خوبی کا اپنی سب مارے تھا لاف

ہو گیا خجلت سے پانی دیکھ وہ رخسار صاف

۲۸۔ **افکار**۔ اسمش میر چون شنیدہ شد کہ بہ شوق مشہد مقدس

بطوس رفت و در روضۂ مبارکہ مجاور است۔ ازوست (۱۶۔ ل)

علی کا بیاہ ایسا جگمگا تھا ، شب معراج جس کا رتجگا تھا

۲۹۔ **امیر**۔ اسمش محمد یار خاں ابن محمد علی خاں روحیلہ [دونو مخطوطوں میں

"روحیلہ" ہی ہجے ہیں (مرتب)] بصفات حمیدہ موصوف بود۔

شنیدہ شد اشعار خود را بہ شیخ محمد قائم قائمؔ تخلص می نمود۔

ازوست (۱۶۔ ل)

اس مونھ سے اللہ کچھ نہ نکلا جز نالہ و آہ کچھ نہ نکلا

دیکھی جو میں سرنوشت اپنی جز روز سیاہ کچھ نہ نکلا

۳۰ - اکرم - دہلوی - اسمش خواجہ محمد اکرم، در تاریخ گفتن مہارت بسیار داشتہ ازوست - (۱۶ - ا)

ایک بار مرے دَیر میں زاہد اگر آوے
میں جانوں جو مسجد کی طرف پھر نظر آوے

۳۱ - اسد - دہلوی - اسمش میر امانی از شاگردانِ مرزا محمد رفیع سودا بود و بہ عہد شاہِ عالم بادشاہ وارد بنگالہ گشتہ در مرشد آباد انتقال نمود، ازوست (۱۶ - ب)

پی کر شراب دُردِ تہِ جام دے گیا
وہ شوخ ہم کو بوسہ پیغام دے گیا
کل آ کہا کہ اور یہ عاشق ہی تو اسد
آیا وہ جب یہاں تب اک الزام دے گیا
کس جنگ جو کی صبح کو باتیں نکالیاں
باہم صبا چمن میں اُلجھتی ہیں ڈالیاں

۳۲ - اولاد تخلص - اسمش میر اولاد علی اصلش از سادات بارہہ است ازوست (۱۶ - ب)

بتاں ہر چند بہلاتے ہیں میرے دل کو پر اولاد
اکس طرح مجھکو اُس پری رخسار کی بھولے

۳۳ - اثر - دہلوی - بہت کم اضافہ ہے ۲ ½ سطر ۳۴ شعر

۱۶ اشعر مثنوی کے حاشیہ پر نقل کئے ہیں (۱۶-ب)

اثر تخلص، میر محمد نام، شاہ جہان آبادی۔ چھوٹے بھائی تھے خواجہ میر درد مرحوم کے، واقف تھے فن تصوف سے اور آگاہ تھے علم معرفت سے۔ بطور درویشان صاحب معنی کے گوشہ نشینی اختیار کی تھی اور درد و اثر کے ساتھ نہایت طبیعت ہموار کی تھی۔ بھائی اپنے سے انھوں نے کسب کمالوں کا کیا ہے، سچ تو یہ ہے کلام ان کا چاشنی سے درد و اثر کی آشنا ہے۔ ایک مثنوی بہت طولانی بیانِ عشق میں ان کی تصنیف سے ہے۔ اگرچہ انتخاب اس کا لکھا گیا بہت تخفیف سے ہے۔

آہ کے ساتھ جی نکل نہ گیا — آہ اے آہ یہ خلل نہ گیا

میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ بتوں سے آہ — پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہو گیا

بس ہو یارب یہ امتحان کہیں — یا نکل جائے اب یہ جان کہیں

وائے غفلت! کہ ایک ہی دم میں — میں کہیں اور کاروان کہیں

بے وفا تجھ سے اب گلا ہی نہیں — تو تو گویا کہ آشنا ہی نہیں

یا خدا پاس، یا بتاں کے پاس — دل کبھی اپنا یاں رہا ہی نہیں

دل سے جو چاہیئے سو باندھئے بات — میں نے واللہ کچھ کہا ہی نہیں

تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں — پر ہمیں آہ کچھ خبر ہی نہیں

دردِ دل چھوڑ جایئے، سو کہاں؟ — اپنے باہر تو یہاں گزر ہی نہیں

حال میرا نہ پوچھئے مجھ سے — بات میری تو معتبر ہی نہیں

کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے
اب جو دیکھا تو وہ **اثر** ہی نہیں

کیا کیجے اختیار نہیں دل کی چاہ میں — ہیں سب وگرنہ یہ تری باتیں نگاہ میں

ہم ہیں بیدل دل اپنے پاس نہیں — آہ اس کا بھی تجھ کو پاس نہیں

پوچھ مت حالِ دل مرا مجھ سے — مضطرب ہوں مجھے حواس نہیں
بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر — مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثرؔ کی تو ہم کو آس نہیں

میں کہاں تو کہاں، یہ کہتے ہیں — کہ یہ آپس میں دونوں رہتے ہیں
جو سزا دیجے، ہے بجا مجھ کو — تم سے کرنی نہ تھی وفا مجھ کو

وہی میں ہوں اثرؔ وہی دل ہے
اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

ایک تنہا خاطرِ محزوں، جسے آزار سو[1] — ایک مجھ بیمار سے وابستہ ہیں آزار سو
کچھ ان روزوں دل اپنا سخت بے آرام رہتا ہے — اسی حالت میں لے کر صبح سے تا شام رہتا ہے
بیاں میں کیا کروں اب اس سے آگے اپنی ناکامی — ترے یہ طور اور مجھ کو تجھی سے کام رہتا ہے

اثرؔ کیجے کیا، کدھر جایئے — مگر آپ ہی سے گزر جایئے
کبھو دوستی اور کبھو دشمنی — تری کون سی بات پر جایئے
صرفِ غم ہم نے زندگانی کی — واہ کیا خوب زندگانی کی!
ناک تیری عجب سجیلی ہے — پتلی اور اونچی اور نکیلی ہے
ناک ہے، یا کہ ایک توتا ہے — چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے

---

[1] مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثرؔ کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے ۱۲

نتھنے ایسے ترے پھڑ کتے ہیں
جانور وحشی جیوں بھڑ کتے ہیں

ذائقہ میں تو جیسے یہ لب ہیں
شہد و شربت جو کچھ کہو سب ہیں

دانت جب مجھکو یاد آتے ہیں
دل کلیجا سبھی چباتے ہیں

دیکھ کر آنکھیں آبدار کو یہاں
لوٹ جاتا ہے گوہرِ غلطاں

گر کبھو اس کے جی میں آوے ہے
مسّی دو انگلیاں لگاوے ہے

دانت پھر یوں چمکتے ہیں سارے
رات اندھیری میں جیسے ہوں تارے

جب خیال آبندھے ہے گردن کا
یہاں ڈھلک جائے ہے مرا منکا

گو کہ شفاف ہے تنِ مینا
یہاں تو جھکتی ہے گردنِ مینا

کیوں نہ کھینچے وہ سب سے آپ کو دور
جس میں ایسا بھرا ہوا ہو غرور

دھیان میں جب وہ بازو آتے ہیں
ہاتھ پاؤں اپنے بھول جاتے ہیں

کیا خوش آیند یہ کلائی ہے
اس کو دل لینے کی کل آئی ہے

۳۴ - الم - دہلوی - کچھ اضافہ ہے ۳ سطر - ۲ شعر (رباعی)
(۱۷ - ب)

الم تخلص، صاحب میر نام، شاہ جہان آبادی - خلف الصدق خواجہ میر درد مرحوم کے - درویش صاحبِ حقیقت اور پہچاننے والے رموز معرفت کے ہیں - ۱۱۹۴ سنہ گیارہ سو چورانوے ہجری میں رونق بخش بلدۂ مرشد آباد کے ہوئے تھے اور دوستی سے راجہ دولہ رام کی چند مدت اس شہر میں رہے تھے - بالفعل کہ ۱۲۱۵ سنہ ہجری ہیں، شاہ جہان آباد میں توکل اور قناعت کے ساتھ اوقات شریف کو بسر کرتے ہیں - یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں ؎

دھمکاتے ہیں بس مجھ کو فقط آپ اکڑ کر
بانکے ہو تو مونڈھا چلو مونڈھے سے رگڑ کر

ہنگامِ فغاں تھا خس و پنبہ قفس و دام
تارِ رگِ گل نے ہے رکھا ہم کو جکڑ کر
جب نامِ خدا دُور سے وہ جلوہ نما ہو
مرجائیں صفوں کی صفیں حیرت سے بچھڑ کر
مندیل کا تو پیچ اُٹھا بیٹھے گا اے شیخ
چھٹ اس کے نہ کچھ پاوے گا رندوں سے جھگڑ کر
آجاتا ہے دُکھ درد بھلانے کو الم یہاں
کیا اس سے عزاتم ہو اُٹھاتے بھلا لڑ کر

(رباعی)
نہ دل کو قرار بے قراری کے سبب
نہ چشم کو خواب اشک باری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھو
جو کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

۳۵- انور۔ غلام علی از سکنۂ کالپی بودہ از وست (ورق ۱۷-ب)

سو نہی دہن پہ تیرے جو شرط ہی مسی کی
تیرے لبوں کا بوسہ مصری ہے کالپی کی

۳۶- اجمل۔ الہ آبادی۔ اسمش شاہ محمد اجمل کہیں برادر شاہ غلام قطب الدین مصیب تخلص۔ مشیخت و نجابت سلسلہ آں بزرگوار اشتہار دارد بنا بر روابط قدیم کہ با حقیر ست۔ الحال کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجری ست بیتے چند کہ از الہ آباد فرستادۂ ایشاں بہ بنارس نزد راقم آثم رسیدہ بود درینجا ثبت افتاد۔ (ورق ۱۷-الف)

شاد تھا دل سب طرف سے بر ہیں جب جانانہ تھا
ہائے کیسی رات تھی جب رات وہ ہمخانہ نہ تھا
ہو گیا تھا کہتے کہتے ان دنوں میں ہوشیار
پھر جو دیکھا کل میں اجمل کو وہی دیوانہ تھا

۳۷ - انشا - انشاء اللہ خاں - علی ابراہیم نے ان کو "درسنِ صبا ہنگام دولت میر محمد قاسم علی خاں عالی جاہ" دیکھا تھا۔ علی لطف نے مفید اضافہ کیا ہے - ۳ سطر، ۴ شعر، (ورق ۱۸، ا)

انشا تخلص، میر انشاء اللہ خاں نام، بیٹے ہیں حکیم میر ماشاء اللہ خاں کے، مصدر جن کا تخلص تھا۔ عجب خوش اختلاط اور صاحب استعداد ہے۔ سوائے قصیدوں کے مثنویاں زبان عربی میں انھوں نے نظم کی ہیں اور ترکی کی غزلیں بھی ان کی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ زبان فارسی میں صاحب دیوان ہیں کشمیری اور مارواڑی کے سوائے اور بھی بہت سی بولیوں کے زبان دان ہیں۔ سال گزشتہ انھوں نے ایک قصیدہ زبان ریختہ میں غیر منقوطہ یعنی جن کے اشعار میں کوئی حرف صاحب نقطہ نہیں ہے، نواب عماد الملک کی مدح میں لکھ کر کالپی بھجوایا اور صلے میں اس کے انعام تحسین اور آفریں کا بہت سا پایا۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ ہیں، مرشد زادۂ آفاق مرزا سلیمان شکوہ کے سایۂ عاطفت میں لکھنؤ کے اندر اوقات ساتھ قناعت اور شکستہ پائی کے بسر کرتے ہیں۔ دیوان ان کا زبان ریختہ میں مشہور ہے اور کلام ان کا ظرافت اور خوش اختلاطی سے معمور۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں:

تم جو کہتے ہو، "مجھے تو نے بہت رسوا کیا" — کیا گنہ، کیا جرم، کیا تقصیر، میں نے کیا کیا

واسطہ، باعث، سبب، موجب، جہت کچھ بات بھی — راز وہ کم بخت کیا تھا، میں نے جو افشا کیا

کیا کہا؟ کن نے کہا؟ کس سے کہا؟ کب؟ کس گھڑی؟ — کس جگہ؟ کس وقت؟ کس دم؟ آپ کا چرچا کیا

کچھ پتا بھی؟ نام اس کا؟ شکل کیسی؟ وضع کیا؟ — جس کسی نے آن کر تم کو اس ڈھب کا کیا

گبر ہے وہ؟ یا مسلماں؟ یا نصارا؟ یا جہود؟ — اس طرح کا تذکرہ جس شخص نے میرا کیا

شیخ ہے وہ؟ یا مغل ہے؟ یا کہ سید؟ یا پٹھان؟ — موچھ ڈاڑھی ہے کہ مولا نے اسے کھوسا کیا

ہے جواں سا؟ یا وہ امرد؟ یا کہ بوڑھا؟ یا ادھیڑ؟ — مرد ہے؟ یا حق تعالیٰ نے اسے خنثا کیا؟

نوکری پیشوں میں ہے؟ یا اہلِ حرفہ وہ عزیز؟ — کون ہے جس نے اجی جا سے تمھیں بیجا کیا؟

کس محلہ میں رہے ہو؟ ہے کہاں کا وہ خبیث؟ کوئی شیطاں ہوئے گا جس نے کہ ذکر ایسا کیا
کذب، بہتان، افترا، طوفان، غلط، بالکل دروغ میں تمھارا نام لے لے کب بھلا رو یا کیا
مرحبا، شاباش، اے رحمت خدا کی آفریں میرے حق میں تم نے باور اور کا کہنا کیا
چودھویں تاریخ اک ابر تنک سا تھا جو رات صحن گلشن میں عجائب سیر ہیں دیکھا کیا
جھلملی سی چادر مہتاب، اوپر برق کا وہ دوپٹا بادلے کا سا جو لہرایا کیا
یوں لگا معلوم ہونے، ہیں یہ دو پریاں بہم ایک نے گویا کہ سایا دوسری پر آ کیا
بوئے گل بولی کہ "آج آپس میں بدلی اوڑھنی چاندنی بائی نے بی خیلا سے بہنا پا کیا"

خود بدولت تو نہ آئے اور **انشا** رات بھر
آپ بن رہا کیا، لوٹا کیا، تڑپا کیا

گالی سہی، ادا سہی، چین جبیں سہی یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی
گر نازنیں کے کہنے سے مانا ہو کچھ برا میری طرف کو دیکھئے! میں نازنیں سہی
آگے بڑھے جو جاتے ہو کیوں کون ہے یہاں جو بات تجھ کو کہنی ہے مجھ سے یہیں سہی

منظور دوستی جو تمھیں ہے ہر ایک سے
اچھا تو کیا مضائقہ **انشا** سے کیں سہی

بندہ اسے جب نظر پڑا ہے بولا ہے "چل اٹھ کدھر پڑا ہے"

ہوئے ہیں خاک سر راہ اس کے ہم **انشا**
بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

۳۸- **اعظم** - شنیدہ شد در لکھنو بدریش شغل عطاری داشت و او در سرکار نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر منسلک بود-

از دست (۱۸- ا- ب)

ہے قد کے سبب عالم بالا پہ تری زلف رکھتی ہے دماغ اپنا یہ زنجیر فلک پر

پیدا ہوئے جب سے آہ و زاری میں رہے | بجلی کی مثال بے قراری میں رہے
ہو خانہ خراب ایسے کافر دل کا | ہم جس کے سبب ہمیشہ خواری میں رہے

۳۹- میر اعلیٰ علی - خلف میر ولایت اللہ خاں مرحوم - از نجبائے دہلی ست ہنگامیکہ نواب شجاع الدولہ وزیر الممالک از فوج انگلشیہ محاربہ داشت راقم حقیر میر مذکور را دیدہ دراں ایام او از منسلکان آں سرکار بود و سرے بعیاشی و عاشقی داشت۔ ۷ اشعر (۱۸ ب - ۱۹ الف)

۴۰- امانی - دہلوی، میر امانی - "با راقم آثم آشنا بود" کوئی اضافہ نہیں - ۲ ½ سطر، ۴۳ شعر (۱۹-۲۰)

امانی تخلص، میر امانی نام، خلف ہیں یہ خواجہ آثمؔ کے، جن کا مذکور اوپر ہوا ہے۔ ۱۱۸۱ھ گیارہ سو اکیاسی ہجری میں وارد مرشد آباد کے ہوئے تھے، اور جناب سید الشہدا کی تعزیہ داری کا شغل ہمیشہ رکھتے تھے۔ مرثیۂ ہندی اپنے کہے ہوئے اکثر ممبر پہ کھڑے ہو کر پڑھتے، اور مومنین کے تئیں سعادتِ گریہ کی دولت سے داخل ثواب کرتے۔ ایک شب جناب سید الشہدا علیہ السلام کی عین تعزیہ داری میں کہ ۱۱۸۷ھ گیارہ سو ستاسی ہجری ہے بیہوش ہو کر سیر کرنے والے روضۂ رضواں کے ہوئے۔ حق سبحانہ تعالیٰ مغفرت کرے۔ عجب مرد خوش اعتقاد اور دیندار تھا۔ نشۂ محبت میں اہل بیت نبوی کے سرشار تھا۔ یہ اشعار یادگار اُس نکو کردار کے ہیں ؎

اُس کے کوچہ ستی غبار اُٹھا | کون ساواں سے خاکسار اُٹھا
عندلیبو بسا لو اب صحرا | باغ سے موسم بہار اُٹھا
ہچکیاں لے گلابیاں روئیں | بزم سے جب یہ مے گسار اُٹھا

عزمِ رخصت ہوا جب ہی اُس کا　　میرے دل سے وہیں قرار اُٹھا
نہیں جو قدرِ اشک عالم سے　　موتیوں کا مگر وقار اُٹھا
شمع سے سوز امانی پوچھا تیرا
اک دھواں اس کے دل سے یار اُٹھا

راہ تکتے تکتے آخر جیسے آیا تنگ دل　　آنکھیں تو پتھرا گئیں، پر وہ نہ آیا سنگدل
ہو چکا ہی غم سے خوں، اب جلد یہ جائے کہیں　　خوف ہی یارب! نہ بدلے اور بھی کچھ رنگ دل
قدر جان اس کی کہ اک عالم سے یہ بیگانہ ہو　　گر رہا ہی تیرے در پر کھو کے نام و ننگ دل
فندقِ پا کس کی دیکھی آہ! جس کے غم سے آج　　قطرۂ خوں ہو بنا رشکِ گُلِ اورنگ دل
اپنی آنکھوں آگے کو اس کی گلی میں ہی پڑا
پر امانی آپ سے ہی سیکڑوں فرسنگ دل

گھیرا ہی مجھے غم نے عجب حال ہے جی کا　　اے نالۂ دل! وقت ہی فریاد رسی کا
سینہ میں جلد بھر رہو ترا پھونک دے اے آہ　　ٹک دل سے خبردار! کہ یہ گھر ہی کسی کا

اُس کے کوچہ سے صبا آج اس طرف آئی نہیں　　دیر ہوئی وہاں مقیموں کی خبر پائی نہیں
وائے اپنی اس بصارت پہ، کہ ہر ذرّہ میں آہ!　　جلوہ گر ہے آفتاب، اور تاب بینائی نہیں

کونسا دن ہی کہ مجھ کو یاد تو آتا نہیں　　کونسا دم ہی، کہ آنکھوں بیچ پھر جاتا نہیں
عشق میں کس کے امانی مبتلا ہی، جس بغیر
تجھ کو نظارہ گلوں کا ان دنوں بھاتا نہیں

چمن سب لہلہاتے ہیں پڑے، بادل برستے ہیں　　شتاب آ! ساقیا! ہم بادہ نوشی کو ترستے ہیں
زمانہ جائے عبرت ہی، چمن کا حال چل دیکھو　　تجمل جن گلوں کا کل تھا سو وے آج جھڑتے ہیں
مساوی جانیو خوش طالعی کو بد نصیبی کو
امانی! منعم و مفلوک سب کے دن گزرتے ہیں

امانی تو ہوا تیغ تغافل ہی سے بسمل ۔۔۔ بھلا بتلائیے کس پر کرم اب آپ کرتے ہیں

ہم ترا نزع تلک جور سہے جاتے ہیں ۔۔۔ یاد آویں گے بہت اتنا کہے جاتے ہیں
لے گیا کون مری تاب و تواں کو یک لخت ۔۔۔ کہ سب ہی عضو میرے آج ڈھے جاتے ہیں
وائے واماندگی اپنی کہ یہ آنکھوں آگے ۔۔۔ کارواں ویں ہے، ہم پیچھے رہے جاتے ہیں

اثر ہو سنگ میں، کیوں کہ ان کو رام کریں ۔۔۔ بتوں کے دل ہو تو یارب یہ آہیں کام کریں
وہ ایک بار بھی تیری نظر پڑے زاہد ۔۔۔ صلاح و زہد رہے یہ تو ہم سلام کریں

کس کے یہ خار مژگاں دل میں کھٹک رہے ہیں ۔۔۔ جو چشم سے لہو کے قطرے ٹپک رہے ہیں

دیکھ تو کیا ہی بت سنگدلی پہ نازاں ۔۔۔ تجھ میں اے نالۂ جانکاہ! اثر ہے کہ نہیں

یارو گر دار پہ منصور نہیں دیکھا ہے ۔۔۔ نوکِ مژگاں پہ مرے لخت جگر کو دیکھو

صفِ مژگانِ آہو چشم کا ہوں کشتہ اے یاراں ۔۔۔ سرِ تربت پہ چن دیجو مرے خارِ بیاباں کو
زباں پہ راز عاشق کا نہ لانا سر کٹا دینا ۔۔۔ سرِ رشتہ کس سے ہاتھ آیا ہے یہ شمع شبستاں کو

میں نے پہلو سے گم کیا تجھ کو ۔۔۔ آہ دل! کن نے لے لیا تجھ کو
اشک آوارگی سے تو نہ تھما ۔۔۔ میں نے آنکھوں میں گھر دیا تجھ کو

جنگوں سے دل پھپھولو کیا سوخت کر رہے ہو ۔۔۔ پھوٹو کہیں، کہاں کی آتش میں بھر رہے ہو

اور میاں خالِ شکر لب پہ تمھارے ۔۔۔ بوسہ میں بھی شاید مزۂ تل شکری ہو

اللہ رے صنم! یہ تری خود نمائیاں ۔۔۔ اس حسن چند روزہ پہ اتنا غرور ہے
دم بدم اس کی خلش سے اب مجھے آزار ہے ۔۔۔ دوستاں یہ دل نہیں پہلو میں میرے خار ہے

چاہ میں کس کے دل ڈبو بیٹھے ۔۔۔ آہ! ہم کیسے دل کو رو بیٹھے
کیوں امانی گیا نہ آخر دل
کفِ افسوس اب ملو بیٹھے

آہ! اب میرے دم کے ساتھ ہوئی ۔۔۔ بادِ پر عمر کی برات ہوئی

ہم سا جو ناتواں عقبِ کارواں رہے — جوں نقشِ پا و ہیں کے ہوئے پھر جہاں رہے

صدمے جو پڑے ہیں دل پہ غم کے — آنسو نہیں تھمتے چشمِ نم کے
خوش خواب ہیں ہیں، مگر جواب تک — جاگے نہیں خفتگاں عدم کے
ہے صبح کو عزمِ رفتنِ یار — ٹک نکلیو آفتاب تھم کے

آنکھیں نہیں مندتی ہیں عجب جی پہ تعب ہے — یارب دلِ حیراں کو مرے کس کی طلب ہے
دم لینے نہیں دیتے ہیں ہیم کے یہ نالے — کیا جانیے کیا دل کو مرے درد کدھب ہے
ہجراں کے شب و روز کا مت پوچھ گزرنا — دن کٹ گیا جوں توں کے تو پھر رات غضب ہے
مدت سے سرد کار غم ہجر ستی ہے — کچھ عیش سے تو کام نہ آگے تھا نہ اب ہے

نامہ بر کہیو زمانے کی تڑپ تھی تجھ بن — شمع شب دیکھ مجھے صبح تلک روئی ہے
بار ہا منع کیا چھوڑ دے بے رحم کی چاہ
باز نہیں آتا امانی بھی عجب کوئی ہے

سیر گلشن کو میں جاتا تھا جو صیاد نے مجھے — دیکھ کر دور سے بولا کہ "شکار آتا ہے"

۱۴۱ - **اظہر** - دہلوی - اسمش میر غلام علی آزاد از شاگرد میر شمس الدین
فقیر مغفور - وبغرور و خودستائی مشہور بود - چندے
در مرشد آباد بسر بردہ - از طبع ناساز خویش بمراد
نرسیدہ بہ عظیم آباد آمد - و در ۱۱۹۲ھ ہجریہ بہ عہد شاہ عالم
بادشاہ وفات یافت - در فارسی سخن رس و معنی یاب بود
دریں اوقات فکر ریختہ می نمود - و با راقم مربوط بود - از دست
شعر (۲۰ - ب)

کرنا تھا جو کچھ نہ کر گئے ہم — افسوس کہ یونہی مر گئے ہم

۴۲- امامی عظیم آبادی۔ اسمش خواجہ امام بخش در زمان نواب سراج الدولہ
ابن ہیبت جنگ روزگارے داشت۔ والحال کہ سال بست و چہار
جلوس شاہ عالم بادشاہ ست در عظیم آباد بغربت میگزراند۔

از وست (۲۱-أ)

اے چشم تو تھام اس کو ہی اشک تو جوش اوپر ‌ ‌ مژگاں نہیں رکھ سکتی اس طفل کو دوش اوپر

۴۳- میر اولیا - از نجبائے قصبہ مہابن توابع لکھنو ست۔ مرد آزادہ و
خلیق و حسن پرست و ذہین ست۔ از مدتے در مرشد آباد
اقامت ورزیدہ۔ با راقم فقیر آشناست۔ بر لغات ہندیہ
اقتدار بسیار دارد و طبعش در ریختہ رسا از وست۔

۱۰ شعر۔ (۲۱-أ-ب)

رخ اپنا بادۂ گلگوں سے تم نے لال کیا ‌ ‌ چراغ حسن کو پانی سے اشتعال کیا

۴۴- احمدی - اسمش شیخ احمد وارث۔ و موطنش قصبہ زمانیہ و نسب آبائیش
بحضرت قاضی شمس الدین ہردی کہ از خلفائے سلطان السالکین
شاہ شرف الدین بہاری بود می پیوندد۔ اما مشار الیہ از
اسلاف خود بہ شیوۂ مالگزاری پرگنہ زمانیہ و رسالہ داری
اتصاف داشتہ۔ از تربیت یافتگان نواب فضل علی خاں
غازی پوری ست۔ در ۱۱۹۶ھ ہجریہ از اشعار بسیار خود
قریب یک صد بیت انتخاب زدہ براقم آثم فرستادہ معلوم
می شود کہ اشعار خود را بہ سخن رساں نرسانیدہ
۱۰ شعر (۲۱-۲۲)

۴۵ - **انتظار** - دہلوی - سمش علی خاں خلف اکبر علی خاں مرحوم تیکباشی ست
درزماں امیر با فرہنگ نواب علی وردیخاں مہابت جنگ
وارد مرشد آباد شدہ دراں بلدہ سکنے اختیار نمودہ - با حکام
آنجا بکام دل می گزراند - جوان فہمیدہ و خوش تقریر و با راقم
حقیر آشنا ست طبعش در ریختہ سلیقۂ نیکو انگیختہ است
۱۱ شعر (۲۲)

۴۶ - **امین** - عظیم آبادی - خواجہ امین الدین - کوئی اضافہ نہیں -
۵ ۱/۴ سطر، ۱۴۸ شعر (۲۳ - ۲۷)

امین تخلص، خواجہ امین الدین نام، عظیم آبادی - عالم دوستی اور اتحاد میں باقرینہ ہیں۔
علی ابراہیم خاں مرحوم کے یار دیرینہ ہیں شعر فہمی اور سخن رسی میں زمانے کے یادگار ہیں -
مضمون تراشی اور ادا بندی میں نادر روزگار ہیں - ذہن کو ان کے بندش کی صفائی
میں نہایت ارجمندی ہے اور طبیعت کو ان کی تلاش معانی میں اپنے ہمعصروں سے
بلندی ہے - چند مدت نواب میر محمد رضا خاں مظفر جنگ بہادر کی رفاقت میں اوقات انھوں نے
بہ کیفیت کاٹی ہے - بعد اس روزگار کے قناعت اور جواں مردی کے ساتھ خانہ نشینی میں
زندگی بسر کی ہے - ایک دیوان چھوٹا سا زبان ریختہ میں ان کی تصنیف سے ہے منتخب اس کا
یہاں لکھا گیا بہت تخفیف سے ہے -

دنیا میں جو آ کر نہ کرے عشق بتاں کا — نزدیک ہمارے ہے یہاں کا نہ وہاں کا
مانند نگیں آپ سے کاوش میں پڑا ہے — مشتاق جو کوئی ہے یہاں نام و نشاں کا

کرتا ہوں امیں میں تو ثنا اُس کی ولیکن
مُنھ لال ہوا جاتا ہے خجلت سے زباں کا

پردے سے جو وہ شہرۂ آفاق نکلتا
تب دیکھتے خورشید کا یہ نام نکلتا

تھا کچھ بھی مناسب کہ نکلوا دیا تو نے
گر صبح نہ نکلا تھا ابھی شام نکلتا

گھر مرے آتا اگر منظور تھا
آئے ہو تو لطف سے کیا دور تھا

گالیاں جو دیں سو دیں، بس کیجئے
سن چکے ہم جب تلک مقدور تھا

یہ دل خالی نہیں کوئی دم رہے گا
تو جاوے گا تری غم رہے گا

جس کا دل آپ نے لیا ہوگا
خاک میں سے ملا دیا ہوگا

ہم کو کیا، گر بہار آتی ہے
دل وہ غنچہ نہیں کہ وا ہوگا

گالیاں غیر سے سناتے ہو
ہاں میاں! تم سے اور کیا ہوگا

مل گیا ہوگا خاک میں جوں اشک
تیری آنکھوں سے جو گرا ہوگا

بتاں کے واسطے گھر بار کو اپنے بہا نکلا
یہ طفلِ اشک میرا عاشقی میں بے بہا نکلا

وہی مقصودِ دل ہی اور وہی منظورِ آنکھوں کا
سرورِ سینہ میں اس کو کہوں یا نورِ آنکھوں کا

کیا ایک مجھ کو بھاتی ہے برسات کی ہوا
کس کو نہیں خوش آتی ہی برسات کی ہوا

جب آہِ سرد بھرتا ہوں کانپے ہی تن ایسے
جوں شاخ کو ہلاتی ہے برسات کی ہوا

خورشید ترا دیکھ کے منہ کانپ کے نکلا
مہ چادرِ مہتاب میں منہ ڈھانپ کے نکلا

شور ہے عالم میں تیرے حسنِ عالم گیر کا
تو ہی ہوگا گر کوئی ہوگا تری تصویر کا

عشق کی دولت سراپا، میں طلا کے رنگ ہوں
اے ہوس دیکھ لے نسخہ ہے یہ اکسیر کا

چوستا ہی جوں سرِ پستاں کو طفلِ شیرخوار
چابتا رہتا ہی دل پیکان اس کے تیر کا

گر ارادہ نہیں ہے آنے کا
فائدہ اس قدر بہانے کا

خط نے مارا ہی حسن پہ شب خوں
کیا ہی جھگڑا ہے ہوائیگا؟

سخت کاوش میں ہوں بہ رنگِ نگیں
ایسی نام آوری کا منہ کالا

دل مرا سینہ سے یوں لیتی ہی وہ زلفِ دوتا
اپنے دیوانوں سے کیا کھنچتی ہیں یہ زنجیر کھینچ

دیکھتی ہے جب مری صورت کو بل کھاتی ہو زلف
جس طرح مجمر سے لے اخگر کو آتش گیر کھینچ

جس طرح شاخ کو ہوتا ہے ثمر سے پیوند
کاش نالے کو مرے ہوئے اثر سے پیوند

یاالٰہی کسی ظالم کے پڑے پنجہ میں
جیسے طرح پٹکہ کو ہے اُس کی کمر سے پیوند

دیکھ بھال اس دلِ صدچاک کو سیتے ہیں تباں
میں نے یہ شیشہ کیا کیا ہی ہنر سے پیوند

مرتے ہیں ہم تو اُس کے لبِ آبدار پر
گر آبِ زندگی ہو تو مارے ہیں دھار پہ

بوسہ دیا تھا، جی میں جو آوے تو پھیر لو
اتنا خفا ہو کس لئے اِس خاکسار پر

اس شمع رو کے سامنے آتا ہے تو پتنگ
بھاری ہوئے ہیں، کیا تجھے اپنے دوچار پر

دب نکلتا ہے اگرچہ سب سے ہے بالا پہاڑ
دیکھتا ہے جب ہماری آہ کا کالا پہاڑ

کھو دیا کوہ کن نے جان شیریں کے لئے
اس کی فرمایش کا اپنے سر سے توڑا لا پہاڑ

آ دیکھے تری زلفِ گرہ گیر ہوا پر
جن نے نہ کبھی دیکھی ہو زنجیر ہوا پر

ڈر سے ترے نالہ بھی نکلتا نہیں لب سے
ظالم ہے ترے ظلم کی تاثیر ہوا پر

اُڑتا ہی ہو کے مضطر جا اس کے بام در پر
نامہ مرا کہاں ہی ہے کاغذی کبوتر

ہی نہیں جوہر نمایاں تیغ تیز یار پر
لکھ رہا ہی نام مقتولوں کا اس تلوار پر

یار کے مژگاں سے گر جاتی ہی یوں تیز نگاہ
جس طرح تلوار کوئی آ لگے تلوار پر

دل خیالِ زلف میں بے خواب بے آرام ہی
رات ہوتی ہی ایسی بھاری ہر اک بیمار پر

آئی بہار ہو گئے ہر خارِ راہ سبز
لیکن ہوئے نہ آہ یہ بختِ سیاہ سبز

شاداب ہی خط اس کے لبِ آبدار پر
رہتا ہے گرد جادہ کے اکثر گیاہِ سبز

دل میں ترے خیال ہی کس نونہال کا
لب سے ایسی نکلتی ہے ہر ایک آہِ سبز

یار آیا ہے اب نہ یہ لے چشم
دیکھنے دے ذرا تو رہ اے چشم

لف "آبِ زندگی" سے "آبِ حیات" مراد ہے جس پر خضر کا قبضہ کہا جاتا ہے ۱۲

کیا کہوں یار سے اپنی سی کئے جاتا ہوں
گالیاں کھاتا ہوں غصہ کو پئے جاتا ہوں
جی نکلتا ہے، یہ لب یاد میں ہلتے ہیں تری
مرتے مرتے بھی ترا نام لئے جاتا ہوں

چاک سینہ کا مرے لوگ عبث سیتے ہیں
ہم تو زخمی ہیں نگاہوں کے، کوئی جیتے ہیں
سیل آتی ہے تو آنے دو مرا کیا لے گی
گھر ہیں ایک میں ہوں پڑا، اور کئی بہتے ہیں
فائدہ کیا ہے بھلا ہم جو کریں فکرِ معاش
غم کو کھاتے ہیں امیں خونِ جگر پیتے ہیں

سر پہ خوباں جو بال رکھتے ہیں
وہ بموجی کا کال رکھتے ہیں
سرو پر اتنا بھول مت قمری
ہم بھی اک نونہال رکھتے ہیں
دل تو کیا ہے، امیں جو آوے یار
جان آگے نکال رکھتے ہیں

بتاں مجھ سے کہتے تھے کیا کچھ نہیں
ولیکن جو دیکھا، تو تھا کچھ نہیں
میں بوسہ جو مانگا، تو جھنجلا کے وہ
لگا کہنے کیا ہے، کہا کچھ نہیں

مجھے بے چین رکھتا ہے دلِ افگار پہلو میں
وہ سوئے کس طرح جس کے رہے بیمار پہلو میں
گرفتاروں کو تیری زلف کے کس طرح خواب آوے
بسانِ شانہ رہتا ہے انھوں کے خار پہلو میں

مجھے تو کبھی عمر بھر غم نہ ہو
ملاقات تیری اگر کم نہ ہو
میں در گزرا صاحب سلامت سے بھی
خدا کے لئے اتنا برہم نہ ہو
ہم آنے کو مانع نہیں غیر کو
پر اتنا بھی خلوت میں ہردم نہ ہو
امیں کی غذا آرہی ہے یہی
الٰہی یہ خونِ جگر کم نہ ہو

ہوئی ہے آشنائی جب سے اس مے نوش سے مجھ کو
جو صاحب عقل ہیں کہتے ہیں اہل ہوش سے مجھ کو
بھلا تو ہی کہہ اے دل کسی کو یہ توقع تھی
لگائے گا وہ صبح عید یوں آغوش سے مجھ کو
جدائی سے سراپا رنگ میرا زعفرانی ہے
کوئی لے کر ملا دے اس بسنتی پوش سے مجھ کو
بھڑکتا ہے جگر میرا دلِ پُر داغ کی دولت
امیں جلنا پڑا اس آتشِ خاموش سے مجھ کو

کیا کہیں دودِ آہ کی تاثیر — گھر کا گھر ہے سیاہ، مت پوچھو
مفت مارا گیا ہزار افسوس — تھا امیں بے گناہ مت پوچھو

جب دکھاتا ہے وہ شرابی آنکھ — وہ نہیں جاتی ہے گلابی آنکھ
لختِ دل گتھ رہیں ہیں مژگاں سے — ہے مگر خانۂ کبابی آنکھ

روشن ہیں شب ہجر میں یہ دیدۂ بیدار — جوں زلفیں چمکنے میں ترے کان کے موتی
دھڑکے ہے مرا دل کہ کہیں کچھ نہ لگادیں — لگتے ہیں ترے کان سے جب آن کے موتی

دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی — عمر کٹنے کو کٹی، پر کیا ہی خواری میں کٹی
صبح گر صبح قیامت ہو، تو کچھ پروا نہیں — ہجر کی جب رات ایسی بے قراری میں کٹی
تیری آنکھوں کی پرستاری میں دل گھبرا گیا — ہائے اس بیمار کی بیمارداری میں کٹی

اس زمانہ میں امیں مت کر کسی سے دوستی
شمع کی گردن، نہ دیکھی دوست داری میں کٹی

دل باندھئے تو یار کے کاکل سے باندھئے — بلبل کو باندھئے تو رگِ گل سے باندھئے
دھڑکے ہے دل کمر کو جو کستے ہو اے میاں — باریک بال سے ہے، تامّل سے باندھئے

جلوہ ترے حسن کا کہاں ہے — یوں کہنے کو آفتاب ہاں ہے

ہم رہیں دیکھتے اور تیری یہ اوقات کٹے — اور تو کیا کہوں اے شانہ ترا ہاتھ کٹے
ایک دم ہو گئی گر اُس سے ملاقات تو کیا — زندگی کا ہے مزا یہ کہ مساوات کٹے

رنگ چہرے کا زعفرانی ہے — عاشقی کی یہی نشانی ہے
کس سے تشبیہ دیں بھلا تجھ کو — دیکھا یوسف تو ترا ثانی ہے
شمع رویاں سے اتنا گرم نہ مل — ان کی جو بات ہے زبانی ہے

رات دن جھینکتے ہی جاتا ہے
کیا امیں ایسی زندگانی ہے

خضر نے ایک دم پیا تھا یے کے آب زندگی — مانگتے ہیں اب تلک اُس سے حسابِ زندگی
کیا بھلا اس میکدے میں جی کسی کا شاد ہو — مرگیا آخر کو پی جن نے شرابِ زندگی
معنیِ آرام کیا ہے، تو نہ کچھ سمجھا امیں — ہم تو مدت سے اُلٹتے ہیں کتابِ زندگی

غیر سے کیوں کہ وہ چھوڑے ملنا — چھوڑتا ہے کوئی اپنے بانے

ہم کھڑے تھے سامنے اُدھر آپ اغیاروں میں تھے — ٹک تو منصف ہو جیے ہم بھی کبھی یاروں میں تھے
جتنے تھے محفل میں، تھا سب سے تپاک اور اختلاط — ایک ہم کم بخت گویا وہاں گنہگاروں میں تھے
ہاتھ اُٹھانا جان سے پیارے بہت دشوار ہے — کیوں نہ دیکھا کل سب ہی تو نازبرداروں میں تھے

بھر عمر گدائی میں بھی کرتے رہے شاہی — دنیا میں جو ٹھانے تھے میاں، ہم نے نباہی
خط کو جو تراشے ہے بھلا فائدہ کیا ہے — اب چڑھ چکی اے یار سپیدی پہ سیاہی
کیا دین سے غافل ہیں امیں مردمِ دنیا — سکّہ کو سمجھتے ہیں سدا اپنا الٰہی

تمھاری آنکھیں جو دیکھتے ہیں، بہت ہی لگتی ہیں پیاری پیاری
پر اس قدر ہیں جو خوں کی پیاسی، یہ کافر آنکھیں ہیں یا کٹاری
تری نگہ کے جو ہوں گے مارے، نہ مانگا ہوگا انھوں نے پانی
نہ ایسی دیکھی ہے تیغ ہم نے، نہ ایسی دیکھی ہے آبداری

رباعیات

اظہار نہیں اگرچہ ہر کا — پر بوجھ اُتاروں ہوں میں اپنے سر کا
سائل کو جوابِ ترش ہرگز مت دے — بھوکا ہے، کیا کرے گا نے کر سرکا

یہ جور و جفا یہ بے وفائی کب تک — بس کیجیے، پاسِ آشنائی کب تک
کرتا ہے کوئی حسن پر اتنا بھی غرور — دیکھیں تو رہے ہے یہ خدائی کب تک

کیا شہر میں آج مچ رہی ہے ہولی
پھرتے ہیں لئے عبیر بھر بھر جھولی

وعدے سے کیا کرو گے دل خوش کب تک
ہولی کا قرار تھا، سو یہ بھی ہو لی

مثنوی

ایک ہیں آشنا مرے غم خوار
پوچ گو بیوقوف بد اطوار

ان کی تعریف کیا کروں میں بیاں
کہتی شرماتی ہے گی منہ میں زباں

دل ہے ان کا کہیں دماغ کہیں
گھر میں ڈھونڈو تو بھونے بھانگ نہیں

منہ کو ان کے خدا نہ دکھلاوے
گر کوئی دیکھے خاک کیا کھاوے

چار پیسے کا سیر بھر ٹھرّا
پی کے رکھتے ہیں جی میں یہ غرّا

آج دنیا میں ہیں جو کچھ ہم ہیں
مالکِ چار دانگِ عالم ہیں

دیکھتا ہوں جو ان کی میں صورت
یاد آتی ہے چین کی مورت

گال جبڑے سے یوں رہے ہیں لپٹ
لگ رہے ہوں کواڑ کے جوں پٹ

تس پہ چیچک نے یوں ہے ماری میخ
جوں جڑی ہوں کواڑ میں گُل میخ

میں تو کرتا نہیں سخن چینی
ناک ہے جوں کواڑ کی بینی

آنکھ گر ہے تو گھر سے باہر ہے
حلقۂ چشم حلقۂ در ہے

کان ایسے پڑے ہیں دونوں طرف
جوں ڈفالی کا ہوئے پھوٹا دف

منہ ہے سنڈاس کی طرح بدبو
لوگ کرتے ہیں دیکھتے اخ تھو

ان کے دھارے کو دیکھ کر فی الحال
جن کے دیکھے نہ ہوویں کالے بال

دیکھ نقاش اس کی پیشانی
کھینچتا دل میں ہے پشیمانی

کھوپڑی سر سے ہے گی یوں اٹکی
جوں کہ چولھے پہ اوندھی ہو مٹکی

توند لٹکے ہے پیٹ سے ایسی
پیٹ تے ہووے پیٹ سے جیسی

صاف کہتا ہوں میں یہ مجبوری
ناف ہے جا ضرور کی موری

کیا کہوں اس کی اور بد حالی
منھ ہے چکنا تو پیٹ ہے خالی

دل لیکے زلف اس کی یوں حلقہ زن ہے مجھ پہ
بیٹھا چمن میں ہووے جوں سانپ من کے آگے

بتاں اٹھاتے نہیں ہاتھ میرے کینہ سے
رہے ہے سنگ کیتیں لاگ آبگینہ سے

ضرور کیا ہے کہ ہوتا ہے تو خجل ناصح
ہماری جیب کو ہے کیا لگائے رہنے سے

نہ اٹھ سکے گا مرے لب سے حرف بوسہ کا
مٹا سکے ہے کوئی نام کو نگینہ سے

اس ضعیف میں اتنا ہوا بقول فغاں
اٹک کے آہ نکلتی ہے میرے سینے سے

کیا برا وقت تھا اس شوخ سے جب آنکھ لگی
جب تلک جیتے رہے روز نہ شب آنکھ لگی

بزم رنداں میں اسے دیکھ کے چھپ جاتے ہیں
کیا مگر شیخ کی ہے بنت عنب آنکھ لگی

میں گزرا یار کے ملنے سے جاوے جس کا جی چاہے
غرض اب شوق سے عاشق کہاوے جس کا جی چاہے

حیاتِ جاوداں بخشے ہے تیغ آبدار اس کی
اگر باور نہ آوے جا کے کھاوے جس کا جی چاہے

یار بھی اب گیا لگا کرنے
یہ بھی اپنے نصیب کی خوبی

ہاتھ میں اپنا سر لئے رہنا
عشق کی پہلی یہ سلامی ہے

دل گرفتار کیوں نہ ہو میرا
بر میں جامہ ترے دو دامی ہے

زاہد کبھو تو گرد نہ پھریو شراب کے
یہاں آگ ہے چھپی ہوئی پردے میں آب کے

کیا چشم منعماں سے رکھیں مفلسانِ دہر
دریا نے تو بھرے نہیں کاسے حباب کے

پھرتا ہے کیوں بھٹکتا اے شیخ ہر طرف تو
کہتا ہے جس کو کعبہ وہ یار کی گلی ہے

کہا کرتے ہو مجھ کو قابل جور و جفا یہ ہے
جو کوئی چاہے کسی کو اے میاں اس کی سزا یہ ہے

برہمن دیر کو پوجے ہے اور کعبہ کے تئیں زاہد
پرستش ہم جسے کرتے ہیں وہ نام خدا یہ ہے

رشک گلزار ہوا داغ سے سینہ میرا
یار کے بھاویں تماشا ہے تماشا یہ ہے

اس ماہ رو کے سامنے آتی ہے چاندنی
اپنے تئیں اب آپ ہنساتی ہے چاندنی

مُنھ دیکھو تیرے سامنے آکر سفید ہو
مانگ میں آبرو کو ملاتی ہے چاندنی

دو دن کی چاندنی ہے پھر آخر اندھیری رات
ساقی پلا شراب کہ جاتی ہے چاندنی

گر آمد آمد اس مہِ تاباں کے تئیں امیں
کیوں چاندنی کا فرش بچھاتی ہے چاندنی

غیروں سے اختلاط ہماری بلا کرے
گر آشنا کرے تو تجھی سے خدا کرے

دنیا میں کہنے کو سب ہی کہلاتے ہیں بھلے
پر ہے وہی بھلا، جو کسی کا بھلا کرے

۷۴ ۔ **افسوس** ۔ میر شیر علی ۔ خاصہ اضافہ کیا ہے ۔

۴ سطر ۱۰ اشعر (۲۴)

افسوس تخلص، میر شیر علی نام، والد ماجد ان کے سید مظفر علی خاں، داروغۂ توپ خانہ نواب میر قاسم خاں عالی جاہ کے تھے۔ سلسلہ سیادت کا ان کی حضرت اسمٰعیل اعرج کو، کہ بڑے بیٹے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے تھے، پہنچتا ہے۔ وطن بزرگوں کا خاف ایک مکان ہے، علاقہ میں عرب کے۔ بزرگوں نے ان کے ہندوستان میں آکے نارنول میں سکونت اختیار کی۔ اس سبب سے وطن ان کا نارنول مشہور رہے۔ میر مذکور کے باپ اور چچا کو، کہ سید مظفر علی خاں اور سید غلام علی خاں نام رکھتے تھے، نواب عمدۃ الملک امیر خاں مرحوم کی رفاقت میں سر رشتۂ ملازمت کا نہایت اقتدار، اور عزّ و وقار کے ساتھ توپ خانہ کی داروغگی کے ساتھ سرفراز تھے، اور رسالہ معقول سے حضور میں مختار تھے۔ بعد شہید ہونے نواب عمدۃ الملک کے سید غلام علی خاں کو نیابت صوبۂ الہ آباد کی بالذات بھی تھوڑے دنوں رہی آخر فالج بیماری سے اُنھوں نے سیر روضۂ رضواں کی کی۔ ان کی وفات کے بعد سید مظفر علی خاں خانہ نشین ہوئے، اور بارہ برس بے روزگار بیٹھے رہے۔ آخر نواب خان عالم بقاء اللہ خاں مرحوم نے لکھنؤ میں اُنھیں بلوایا، اور سرکار وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کے مشاہرہ

میں تین سو روپے کا واسطے ان کے در ماہہ ٹھہرایا۔ ان ایام میں میر شیر علی افسوس کا سن گیارہ برس کا یا کچھ کم زیادہ ہے، لیکن مولد ان کا دار الخلافہ شاہ جہان آباد ہے۔ یہ بھی ہمراہ اپنے والد ماجد کے لکھنؤ میں آئے، اور طور بود و باش کا یہیں ٹھہرائے۔ بعد کئی برس کے حسب الامر نواب صادق علی خاں کے، کہ بڑے بیٹے نواب میر محمد جعفر خاں صوبہ دار بنگالہ کے تھے، سید مظفر علی خاں وارد مرشد آباد ہوئے اور داروغگی توپ خانہ وغیرہ کے ساتھ مورد عنایت و امداد ہوئے۔ آگے بیان ساتھ تفصیل کے موجب طول کلام کا ہے۔ غرض جب وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بہادر مع صوبہ دار بنگالہ صاحبان عالی شان سے معرکہ آرا ہیں، تو سید مظفر علی خاں بھی ہمراہ رکاب کے تھے۔ بعد میر محمد جعفر خاں کی وفات کے روزگار نواب سیف الدولہ کا انھوں نے نہیں کیا، بلکہ لکھنؤ چلے آئے، اور بعد کئی برس کے حیدر آباد کی طرف گئے، وہیں وصال ان کا ہوا۔ اس ایام میں میر شیر علی افسوس کا سن اُنیس برس کا تھا۔ شعر و سخن کے ساتھ موانست ان کو بہ شدت تھی، اور طبیعت کو مناسبت نہایت۔ چنانچہ صغر سن سے شعر کہتے ہیں اور اکثر اس شغل میں رہتے ہیں۔ اصلاح کا اتفاق ان کو میر حیدر علی حیران تخلص سے ہوا ہے، اور علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاگرد ان کو میر حسن حسن تخلص کا لکھا ہے۔ اس کی سند اپنے تئیں نہیں پہنچی، اور یہ خبر اپنے گوش زد نہیں ہوئی۔ ابتدا میں یہ سررشتہ روزگار کا نواب سالار جنگ مرحوم کے ملازموں میں رکھتے تھے۔ اور میرزا نوازش علی خاں، جو نواب مذکور کے بڑے بیٹے ہیں، گیارہ برس ان کے متعینہ رہے۔ بعد برہم ہونے اس سررشتہ کے، صاحب عالم عالمیان میرزا جوان بخت جہاں دار شاہ کی عنایت اور قدر دانی ازبسکہ حد سے زیادہ دیکھی، سعادت توسل کی انھوں نے ملازموں میں اس عالی جناب کے حاصل کی۔ جس ایام میں اس نیّر اوج شہریاری کا خیمہ مغرب کی سمت نکلا، اور کوچ شاہ جہان آباد کو ہوا، تو میر مذکور بہ سبب بعضے بعضے عوارض کے رہ گئے، اور ساتھ نہ جا سکے۔ ایک مدت سے بہ توکل و قناعت ہمراہی میں نواب سرفراز الدولہ بہادر کے دن زندگی کے بسر کر رہے تھے، کہ صاحب والا مناقب

عالی شان، بارلو صاحب نے مشورہ سے عالی قدر سخن آفریں مسٹر گلگرسٹ صاحب، زباندان ریختہ لکھنؤ سے طلب کیے۔ بڑے صاحب نے لکھنؤ کے کہ نام نامی اس معدن رافت کا ہر صاحب ہے، بہ عزت تمام ان کو بلوا کے، اور مشاہرہ دو سو روپیہ کا ٹھیرا کے، پانچ سو روپیہ خرچ راہ دیا، اور کلکتے کی طرف روانہ کیا۔ چنانچہ جب مرشدآباد میں یہ آئے، تو وفور محبت سے اسی دن غریب خانہ میں تشریف لائے، کس واسطے کہ ان کے نکلنے کی تقریب سے دو مہینے آگے راقم حقیر لکھنؤ سے نکلا تھا اور وارد مرشدآباد کا تھا، دیدار سے اپنے انھوں نے نہایت خوش و خرم کیا۔ اور چلتے ہوئے وعدہ کلکتے کی سیر کا اس عاصی سے لیا۔ غرض بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری میں بلدہ کلکتے میں، صاحبان عالی شان کے ساتھ میر مذکور ملاقاتیں بہ عزت تمام رکھتے ہیں اور گلستان کے ترجمہ کا کمپنی کی سرکار سے کام رکھتے ہیں۔ راقم آثم سے ملاقات ایام شباب سے ہے۔ فی الحقیقت کہ ذات ان کی زمانے کے انتخاب سے ہے۔ عجیب جوان خلیق اور اہل دل ہیں۔ فروتنی اور انکساری میں فرد کامل ہیں۔ منطق و معانی کے بیان میں صاحب استعداد ہیں۔ کلیات اور معالجات فن طبابت کے بھی بخوبی یاد ہیں۔ شعر عاشقانہ بہت مزے سے کہتے ہیں۔ اقسام نظم ہیں۔ ؎

کیوں نہ ہو گھمنڈ اس بت پر غرور کو
صبر کسی طرح نہیں اس دل ناصبور کو

اس بت بے حجاب کا دیویں ابھی اٹھا نقاب
دیکھ سکے گا پر اسے تاب ہے اتنی طور کو

باقی نہیں فقط، نہیں ڈوبی ہے سب کی سب زمیں
دیکھنا آج ہم نشیں آنسوؤں کے وفور کو

ہیچ ہیں یہ خود نمائیاں، حق ہیں یہ لن ترانیاں
شعلۂ طور بجھ گیا دیکھ کے اس کے نور کو

ناز بھرا وہ منہ اگر دیکھے جو اک نظر تو پھر
منہ پہ نہ لائے زاہدا بھولے سے ذکر حور کو

دو کسو نہ طعنہ زن مجھے ناکسوں کی خوشامدیں
میں نے ہی کی نہیں فقط، کرتے ہیں سب ضرور کو

تو نے افسوس کیا کیا، دشمن جاں کو دل دیا
یہ تیری عقل جل بجھے، آگ لگے شعور کو

سمند گرم جو یہاں اس سوار کا پہنچا ... غبار تا فلک اس خاکسار کا پہنچا
تو سچ بتا کہ تجھے اتنی کیوں ہی بے چینی ... مگر پیام کسی بے قرار کا پہنچا
ملے ہے پانو سے اپنے وہ لالہ رو ہر دم ... یہ مرتبہ تو دلِ داغدار کا پہنچا
ہے یہاں تلک تو نزاکت گلوں کے گجرے سے ... لچکنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہنچا

قفس سے چھٹنے کی اُمید ہی نہیں افسوس
حصول کیا ہی جو مژدہ بہار کا پہنچا

جب تلک نہ عشقِ یار و، نہ دلِ ناکام تھا ... اپنے میں کیا چین تھا، اور دل کو کیا آرام تھا
بخشیو ہم کو ہمیں ٹوکا ہے ہم نے بھول کر ... دردِ دل تیری بلا ہو وہ ترا ہمنام تھا

اس کے اُٹھتے ہی جی یہ آن بنی ... دیکھیے آگے آگے کیا ہوگا

صبح نت کرتا ہے یہ دل اشکباری بیش تر ... ہو سحر کو خانۂ ماتم میں زاری بیش تر
دل کے تئیں بھی آشنائی کا نہیں کچھ اعتبار ... بے وفاؤں سے رہی ہی تجھ کو یاری بیش تر

ہنسکر کسی سے میں نے نہ کی بات تجھ بغیر ... روتے ہی آہ کٹ گئی یہ رات تجھ بغیر
غیروں سے تو ملے تو ملاکر، وے مجھے ... کرنی نہیں کسی سے ملاقات تجھ بغیر

بزم میں اس کے نہ ہنستے ہیں نہ رو سکتے ہیں ... چپکے بیٹھے ہوئے ہر ایک کا منہ تکتے ہیں

کہا میرا مطلق نہیں مانتا ہے ... تو جیسا ستاتا ہے جی جانتا ہے

کوئی دل۔ مرے پوچھے جیسا ہی وہ اے ناصح ... تجھ کو نہ خوش آیا یہ، پر مجھ کو تو بھاتا ہے

۴۸۔ **آشفتہ** ۔ مرزا رضا قلی۔ "تا حین تحریر ایں اوراق احوالش معلوم نہ شد۔ ظاہرا در لکھنؤ میگزراند۔" علی لطف نے بہت کچھ لکھا ہی۔ ۸ شعر (۲۸۔ ب)

آشفتہ تخلص، حکیم رضا قلی خاں نام، والد ماجد ان کے حکیم محمد شفیع محمد خاں مرحوم تھے

متوطن اکبر آباد کے۔ بڑے بھائی ان کے میرزا ہجو صاحب، خدا مغفرت کرے، ذرہ تخلص کرتے تھے۔ عجب ولولے اور ذوق شوق کے ساتھ کربلائے معلّٰی گئے، اور وہیں خاک ہوئے، روبرو ضریح مقدس کے دفن ہیں۔ حق سبحانہ تعالی حشر بھی ان کا، اور جمیع مومنین کا، جناب سید الشہدا علیہ السّلام کے ساتھ کرے۔ دوسرے بھائی ان کے، میرزا رضی صاحب، وہ بھی ان سے بڑے ہیں، بالفعل لکھنؤ میں داد طبابت اور معالجے کی دے رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جو جو اختراعات فن طبابت میں اُنھوں نے کئے، دیکھنے کا کیا دخل ہے، کسی نے نہیں سُنے۔ حذاقت اور لیاقت ان کے خاندان کی نہیں ہے محتاج تشریح اور بیان کی۔ ہمیشہ بزرگ ان کے معالج سلاطین نامدار کے رہے ہیں، اور امیروں سے بلکہ وزیروں سے سدا ناز و اعزاز کیا کئے ہیں۔ غرض حکیم رضا قلی خاں آشفتہ تخلص راقم آثم کے دوستان قدیم سے۔ جوان آزاد وضع، اور خوش اختلاط وارستہ مزاج، اور مایۂ ارتباط میں محبت، اور یکرنگی میں خلاصے، اور آشنائیوں کے بہت خاصے، حسن پرستی میں خود لیلیٰ و شیریں کی تصویر، اور عشق بازی میں قیس و فرہاد کے پیر ہیں۔ مشورۂ سخن کا اُنھوں نے میر سوز صاحب سے کیا ہے، لیکن شاگردوں میں ان کے اتنا کوئی نہیں ہوا ہے۔ میر صاحب مذکور کے طرز ادائیہ میں اُنھوں نے رنگینی کچھ اور بھی زیادہ کی ہے، سچ تو یہ ہے کہ رنگین ادائی کی داد دی ہے۔ چندے اُنھوں نے رفاقت میرزا محمد تقی خاں کی کی، جو کہ پوتے میرزا یوسف کور کے تھے، اس سبب سے دو اڑھائی برس بود و باش ان کی فیض آباد میں ہوئی تھی، وگرنہ پرورش اُنھوں نے لکھنؤ میں پائی ہے، اور کیفیت زندگی کی وہیں اُٹھائی ہے۔ ۱۲۰۸ھ بارہ سو آٹھ ہجری میں لکھنؤ سے مرشد آباد میں آئے، نواب مبارک الدولہ ناظم صوبۂ بنگالہ مرض الموت میں گرفتار تھے اگرچہ معالجہ میں اُنھوں نے رنگ مسیحائی کے دکھائے، لیکن قضا و قدر سے لاچار تھے۔ بعد نواب مبارک الدولہ کی وفات کے، خلف الصدق سے ان کے، یعنی نواب عضد الدولہ ناصر الملک سید بابر علی خاں بہادر دلیر جنگ سے، نہایت موافقت آئی، اور صحبت نے بہ شدت یکرنگی پائی۔

چناں چہ سات برس کامل ان کی خدمت میں رہے، اور قریب لاکھ روپے کے بنگالہ میں پیدا کئے، لیکن خرچ کرنے والے بھی ایسے ہی بلائے روزگار تھے، کہ جس دن مرشد آباد سے نکلے تو قرض دار تھے۔ غرۂ ذی حجہ کو ۱۲۱۴ھ بارہ سو چودہ ہجری میں، اپنے ہی مزاج نازک سے ناحق روزگار چھوڑ کلکتے میں چلے آئے، اور زمانے کی بے رنگی کو مطلق خیال میں نہ لائے، بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، بہ عزت تمام کلکتے میں اوقات بسر کرتے ہیں اور اک رنگ کی صحبتوں میں دن رات بسر کرتے ہیں طبیعت ان کی موسیقی کی طرف لڑکپن سے ہے، اور ایک مناسبت بھی بھلی چنگی ان کو اس فن سے ہے۔ اپنی آشفتہ مزاجی میں غزلوں کو انتظام نہیں دیا ہے، وگرنہ مدت سے ایک دیوان کا سرانجام ہو چکا ہے۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں ؎

جی تھا آنکھوں میں یار تھا دل میں — یہاں تلک انتظار تھا دل میں
آبلہ ہو کے دم میں پھوٹ بہا — یہ کہاں کا بخار تھا دل میں
مر گئے پر بھی ہم کو خاک نہ دی — آج تک یہ غبار تھا دل میں
کھینچیے ہی ٹک اے کمانِ ابرو — تیر مژگاں وسار تھا دل میں
دمِ آخر جو ہچکی آتی تھی — وہ فراموش گار تھا دل میں
دست و لب نزع میں جو ہلتے تھے — شوقِ بوس و کنار تھا دل میں

دم شماری تک بھی آشفتہ
قدموں کا شمار تھا دل میں

فقط نہ اپنی ہی تم آن دیکھتے جاؤ — اِدھر اُدھر بھی مری جان دیکھتے جاؤ
نہ پیچ و تاب کو بالوں کے طول دو اتنا — ہمارا دل ہی پریشان دیکھتے جاؤ
بجائے اشک نکلتے ہیں پارہائے جگر — تمھارے جی میں تھا ارمان دیکھتے جاؤ
دکھانے آئے تھے دامن کے چاک کی خوبی — ہمارا چاک گریبان دیکھتے جاؤ

کیا خرید زلیخا نے مصر میں یوسف جنابِ عشق کی تم شان دیکھتے جاؤ
اگرچہ ہووینگی تصدیع لیکن آشفتہ
کوئی گھڑی کا ہوں مہمان، دیکھتے جاؤ

وصل اس کا خدا قریب کرے دیکھیں، تب ہم سے کیا رقیب کرے
ہجر سے قتل، وصل سے اچھا جب میں جو آوے سو حبیب کرے
گل کا دیکھا چٹک کے چپ ہونا شور کیوں کر نہ عندلیب کرے
مرگیا ایک صنم پر آشفتہ
موت ایسی خدا نصیب کرے!

یہ خرابی تو پڑی مجھ پہ ترے جانے سے جِن بھی ڈرنے لگے اب مرے ویرانے سے
کس طرح قید کروں، یہ تو ٹھہرتا ہی نہیں کون بر آوے بھلا، اس دلِ دیوانے سے؟
میں سمجھتا ہوں کہ تم جا کے نہیں آنے کے فائدہ کیا ہے بھلا جھوٹ قسم کھانے سے
شعلہ خو! آگے تو اتنا نہ جلاتا تھا مجھے آج تو آگ ہوا غیروں کے بھڑکانے سے

دیکھتے ہی اُسے کل میرے یہ اوسان گئے اپنے بیگانے وہاں جتنے تھے سب جان گئے
اپنے کے ہوتے بھلا غیر کو صدقے تو نہ کر ہم بھی جی رکھتے ہیں پیارے ترے قربان گئے

مجھ کو کہتا ہے صنم، تجھ کو بھی اب بھاگ لگے آنکھ سے آنکھ ملاتا ہے، تجھے آگ لگے
بوسہ کے واسطے چمٹا، تو لگا کہنے مجھے بس کہیں دُور بھی ہو، مُنہ کو ترے آگ لگے

۴۹ - آہ - دہلوی - اسمش میر مہدی خلف الصدق میر سید محمد سوز تخلص
شاگرد والد ماجد خویش ست - اشعر

۵۰ - احسان - اسمش میر شمس الدین خلف میر قمر الدین منت تخلص

نظر آتا ہی ملکِ دل ڈہا، اُجڑا، جلا، پھوٹا خدا جانے کہ اس بستی کو کس بے رحم نے لوٹا

حرف الباء

۵۱ - بیدل - مرزا عبدالقادر۔ "احوال آں قادرِ سخن در تذکرۂ فارسی مسطور" علی لطف نے قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ ۲½ سطر ۲ شعر (۲۹-ل)

بیدل تخلص، میرزا عبدالقادر نام، قوم چغتا، لیکن نشو و نما انھوں نے ہندوستان میں پائی ہے، جودتِ ذہنِ سلیم، اور ذکائے طبعِ مستقیم کے باعث تصویر نازک خیالی کی بہت نگھ سُکھ کی کھینچ کر باریک بینوں کو دکھائی ہے۔ بیشتر اختراعات انھوں نے زبان فارسی میں کئے ہیں، لیکن اہل محاورہ کے مقبول نہیں ہوئے ہیں۔ آسمان جاہ محمد اعظم شاہ کے ساتھ توسل رکھتے تھے اور مورد الطاف و عنایت شاہزادۂ عالم دعالمیاں کے رہتے تھے۔ قوّت جسمانی اور طاقت بدنی قادر توی نے اتنی انھیں عنایت فرمائی تھی، کہ اوران کے معاصرین کے حصہ میں کم آئی تھی۔ چنانچہ اک روز رکاب میں شاہزادے کی عین سواری کے دوا دوش میں ایک شیر نکل آیا، اور کئی بیچاروں اجل کے ماروں کو ذائقہ مرگ کا اس نے چکھایا۔ آخر میرزائے مذکور کے ہاتھ سے بکری کی طرح مارا گیا، اور اپنی جان سے بیچارہ گیا۔ دفعتاً ایسے روئی خلائق سے یہ بیزار ہوئے کہ روزگار یا کشیدہ، اور دنیا داری سے دست بردار ہوئے۔ طریقہ فقر اور گوشہ نشینی کا اختیار کیا۔ دل کو فراغ یاس اور خونِ تمناسے رشک گلزار کیا، لیکن دروازہ ان کا کثرتِ اعتقاد سے مسجود خاص و عام تھا، اور بوسہ گاہ امیران عظام تھا۔ نواب نظام الملک صوبہ دار دکھن کا خط مکرر اور متواتر اس مرکزِ دائرۂ قناعت کی تحریک میں آیا، لیکن قطب آسمانِ توکل نے حرکت کو قبول نہ فرمایا۔ ایک بیت فارسی نظام الملک کے جواب خط میں لکھی ہے، اس سے قناعت اور جواں مردی اس شیر بیشۂ استغنا کی معلوم ہوتی ہے۔ اس بیت کو بہ سبب زبان فارسی کے حاشیہ پر [لہ]

لہ دنیا اگر دہند، نہ جنبم زجائے خویش	من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

لکھا ہے، اور ترجمہ اس کا اس طرح داخل کتاب کیا ہے ؎

کب عوض دنیا کے سر کوں جا سے چھوڑوں ہٹاؤں کو
باندھی ہے مہندی قناعت کی میں اپنے پانو کو

کلیات ان کا از روئے نظم اور نثر کے قریب لاکھ بیت کے مشہور ہے، لیکن اہل دنیا کی تعریف کہیں ایک مصرع میں نہیں مذکور ہے۔ بحر متدارک اور کامل وغیرہ پانچوں وزن، جن کے ناظم مخصوص شعرائے عرب ہیں، اور عجم ان سے احتیاط کرتے سب کے سب ہیں، اکثر میرزا نے غزل ان اوزان میں کہی ہے، اور داد نازک خیالی کی دی ہے۔ از بس کہ مدار دنیائے دوروزہ کا فنا پر ہے، ۱۱۳۳ھ گیارہ سو تینتیس ہجری میں بلدہ شاہ جہان آباد کے اندر اس سرائے فانی سے عالم باقی کی طرف توجہ فرمائی۔ ان دو بیتوں نے، زبان ریختہ میں اس قادر سخن کے نام سے شہرت ہے پائی ؎

مت پوچھ دل کی باتیں، وہ دل کہاں ہے، ہم ہیں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے، ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا، بیدل کہاں ہے، ہم ہیں

۵۲۔ بہار۔ دہلوی۔ نامش رائے ٹیک چند۔ در عربی مناسبت و در فارسی مہارت داشت۔ بطور سیاحت ایران رفتہ و در لغات فارسی کتابے موسوم بہ بہار عجم نوشتہ از یاران سراج الدین علی خاں آرزو بود۔ گاہے ریختہ ہم می گفت۔ ایں ابیات ریختہ قلم اوست ؎

وہی اک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں
کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زنّار کہتے ہیں
اگر جلوہ نہیں ہے کفر کا اسلام میں ظاہر
سلیمانی کے خط کو دیکھ کیوں زنار کہتے ہیں

۵۳- **بینوا** - موطنش قصبہ سنام از موزونان عہد محمد شاہ مرحوم معاصر خان آرزو و شاہ آبرو بود- ایں دو بیت کہ بوے منسوب ست در بیاضے بنام سراج الدین علی خاں آرزو ہم دیدہ شد

تم ہو بوس و کنار کی صورت میں ہوں اُمیدوار کی صورت
بینوا ہوں زکات حسن کی دے او میاں مالدار کی صورت

۵۴- **شاہ بچھا** - دہلوی- درویشے بود از طائفۂ آزاداں- اشعار بسیار می گفت و می نوشت (۳۰- ب)

دل مرا گرد لب یار کے منہ لاتا ہے یہ شکر خور شکر چھوڑ کہاں جاتا ہے

۵۵- **بے قید** - دہلوی- اسمش سید فضائل علی خاں ابن میر محمد علی خاں ست کہ در زمان فردوس آرام گاہ اول بہ نیابت نواب عمدۃ الملک امیر خاں و بعد ازیں بالاصالۃ صوبہ دار ٹھنٹھہ بود- بالجملہ مثنوی خان مذکور قریب پانصد بیت ست کہ بزبان قدما در بیان عشق خود با یکے از ارباب طرب گفتہ- اما بے نمک واقع ست ایں چند بیت برگزیدۂ آں مثنویست- ۱۴ شعر (۳۰-۱)

۵۶- **بیان** - احسن اللہ کوئی اضافہ نہیں کیا- ۳ سطر ۵۵ شعر (۳۲)

بیان تخلص احسان اللہ خاں نام، شاگردوں میں سے مرزا مظہر جان جاناں کے تھا سکونت دلّی میں اختیار کی لیکن متوطن اکبرآباد کا تھا- شاگردوں میں سے میرزائے مذکور کے عاشق مزاج اور شیریں زبان تھا- زبان ریختہ میں صاحب دیوان تھا- یہ اشعار منتخب

دیوان اس سخنور خوش بیان کے ہیں۔

وہ بھی کیا دن تھا کہ ہم آغوش ہم سے یار تھا
در کے باہر مدعی جوں صورتِ دیوار تھا

اس تجاہل پہ پڑا میں دیکھتا ہوں گور میں
وہ کہ جن کی چشم کا میں عمر بھر بیمار تھا

دیکھ کر تابوت کو بیمار داروں سے مرے
پوچھنے لاگا کہ اس مردے کو کیا آزار تھا

کوئی کسی کا بیاںؔ آشنا نہیں دیکھا
سوائے اس کے ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا

آ کر جوں ہی قاصد نے لیا نام کسی کا
اس نام کے سنتے ہی ہوا کام کسی کا

کیوں آج سماتا نہیں اپنے میں خوشی سے
کیا تجھکو بیاںؔ پہنچا ہے پیغام کسی کا

عالم کو تاج و گوہر و تخت دلوا دیا
اے آسماں۔ بتا تو مجھے تو نے کیا دیا

نے دین سے اطلاع ہے، نہ دنیا کی کچھ خبر
اس عشق نے غرض ہمیں سب کچھ بھلا دیا

ایسے ہی میرے بخت جو ماتے تھے نیند کے
خوابِ عدم سے کاہے کو مجھ کو جگا دیا

کب تلک اس کی شکایت ہو نہ لب سے آشنا
ایک بیگانہ ہے مجھ سے اور سب سے آشنا

غیر کے کہنے پہ مت بیگانہ ہو یکبارگی
دیکھ تو اے شوخ! میں تیرا ہوں کب سے آشنا

ہمدم نہ فکر کر کہ مرا کام ہو چکا
گر دل مرا یہی ہے تو آرام ہو چکا

آتا ہے تجھ کو ننگ مرے نام سے عبث
اے شوخ! اب تو شہر میں بدنام ہو چکا

اگر اک صبح دم آتا وہ اٹھ کر خوابِ شیریں سے
ہمارا کیا گریباں، ناصحوں کا پیرہن پھٹتا

جگایا مجھ کو کس کم بخت نے ہائے
مری آنکھوں کے آگے وہ ابھی تھا

تو تو ساقی جام ترسا کر پلاتا تھا مجھے
یار کی آنکھوں نے مجھ کو کر دیا یک بار مست

رو کر اس سے میں کہا، مرتا ہے یہ بیمار حیف
مسکرا کر وہ لگا کہنے کہ اس کا کیا علاج

یہ آرزو ہے کہ وہ نامہ بر سے لے کاغذ
بلا سے پھاڑ کے پھر ہاتھ میں ملے کاغذ

وہ کون دن ہے کہ غیروں کو خط نہیں لکھتا
قلم کے بن کو لگے آگ! اور جلے کاغذ

عرش تک جاتی تھی اب تک بھی آ سکتی نہیں
رحم آتا ہے بیاںؔ اب مجھ کو اپنی آہ پر

اک بار فوجِ عشق پڑے مجھ پہ ٹوٹ کر
لے کے قرار و دین و دل و ہوش لوٹ کر

لینا اگر ہے دل کو تو نے بھی اسے کہیں
سینہ میں اب تلک تو رکھا مارہ کوٹ کر

ہم سرگزشت کیا کہیں اپنی کہ مثلِ خار
پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

کیا ایسے سے دردِ دل کو کہیے
ایدھر تو سنا، اُدھر فراموش

میں بس کہ خاک میں ترے کوچے کی مل گیا
تس پر بھی تیرے دل میں ہے مجھ سے غبار حیف

تمنّا بادشاہی کی کسی سفلہ کو ہووے گی
مرے دل میں خدائی کا بھی خطرہ ہو تو کافر ہو

کافر ہو جس کے دل میں کچھ اور آرزو ہو
اک مختصر سی جا ہو جس میں ہوں اور تو ہو

مت آیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی
جس طرح کٹا روز گزر جائے گی شب بھی

آخر تو شکایت سے مجھے منع کرے ہے
سی دیکھو ٹک ہاتھ سے اپنے مرے لب بھی

جہاں روؤں تمنا میں تری اے شمع رو یارے
اُگے اُس کل زمیں سے حشر تک جوں لالہ انگارے

قمارِ عشق کی بازی بھی کچھ دنیا سے باہر ہے
اُسے کہتے ہیں عاشق جو کوئی یاں نقد جاں ہارے

آنسوؤں تک پونچھنے کی غیر کے تدبیر ہے
مجھ سے اتنا بھی نہیں کہتا کہ کیوں دلگیر ہے

چرخ کی برہم زنی سے یہ تعجب ہے بیاں
لیلی و مجنوں کی یک جا اب تلک تصویر ہے

شبِ فراق کی دہشت سے جان جاتی ہے
یہی ہے صبح سے دھڑکا کہ رات آتی ہے

جا کہو کوئے یار میں کوئی
مر گیا انتظار میں کوئی

وہ بھی کیا رات تھی کہ سوتا تھا
سر رکھے اس کنار میں کوئی

جادو تھا کہ سحر تھی، بلا تھی
ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی

کیدھر ہے کہاں ہے خوشدلی تو
ہم سے بھی کبھو تو آشنا تھی

رسوا ابھی سے کرتی ہو اے چشمِ تر مجھے
آنا ہے اس کی بزم سے بارِ دگر مجھے

آیا ہوں اس گلی سے ابھی دم نہیں لیا
پھرنے چلا ہے یہ دلِ وحشی اُدھر مجھے

کنجِ قفس سوا میری قسمت میں جا نہ تھی
تو کیوں دیئے فلک نے میاں بال و پر مجھے

جھگڑتے تجھ سے پیارے حجاب آتا ہے
دگرنہ بات کا تیری جواب آتا ہے

پیو شراب جوانو! کہ موسم گل ہے
ہمیں بھی یاد وہ عہد شباب آتا ہے

اپنے دل سے بھی عداوت ہو گئی ہے اب مجھے
دشمن جانی ہے میرا جو کوئی چاہے مجھے

کوئی جز قیس نہ دیوانہ ہوا لیلیٰ کا
میں ترے عہد میں دیکھوں ہوں جدھر مجنوں ہے

کیا زلف میں اُس شوخ کے تھی دبکی صبح
یا شام سے پھولی تھی کسی شب کی صبح

ٹک زلف کو میں ہاتھ لگایا کہ ادھر
ہمسایہ پکارا کہ ہوئی کب کی صبح

رباعیات

جس وقت کہ بیدار وہ ہوتا ہیں گا
عالم کے غضب سے جان کھوتا ہیں گا
غنچوں کو صبا کہیو، کہ آہستہ کھلیں
زانو پہ مرے وہ شوخ سوتا ہیں گا

مت کہیو بیاں جام اجل پیتا ہے
یا اُس کے لئے کوئی کفن سیتا ہے
یارو جو مرے حال کو پوچھے وہ شوخ
اتنا کہیو کہ اب تلک جیتا ہے

سو طرح سے یہ عشق لبھاتا ہے مجھے
ہر چیز میں یک جلوہ دکھاتا ہے مجھے
کس ماہ کا یہ عکس پڑا ہے یارب!
ہر چاہ میں یوسف نظر آتا ہے مجھے

کہتا ہوں جناب حق میں ڈرتے ڈرتے
مدت گزری دعا ہی کرتے کرتے
ہے اُس کو یہ قدرت کہ بیاں سا محروم
منہ یار کا دیکھ لیوے مرتے مرتے

---

۵۷ - پیام - دہلوی - اسمش شرف الدین علی خاں - در زمان محمد شاہ فردوس آرام گاہ بود از دست (۳۲ - ۱)

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے　　کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا　　ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

بات منصور کی فضولی ہے　　ورنہ عاشق کی آہ سولی ہے

۵۸ - بکھاری لعل دہلوی - در عصر احمد شاہ بادشاہ ابن

فردوس آرام گاہ بود - از وست - (۳۲)

کہتا نہیں کہ ہجر میں کوئی یار چاہیئے　　ایک نالہ بس ہے گر مجھے غمخوار چاہیئے

۵۹ - بیرنگ - نامش دلاور خاں معاصر مرزا محمد رفیع سودا بود گویند

در دہلی رحلت نمود - از وست (۳۲)

دل کو تجھ عشق میں قرار نہیں　　اب تلک تجھ کو اعتبار نہیں

۶۰ - بیکل - دولت آبادی - نامش سید عبدالوہاب بود - استفادہ از میر عبدالولی

عزلت تخلص صورتے می نمود - راقم حقیر مذکور را در حکومت

نواب سراج الدولہ ناظم بنگالہ دیدہ است - از وست -

مرا دل گلرخاں یہ ساتھ لے گئے　　حنا کی طرح ہاتھوں ہاتھ سے گئے
تری زلفوں نے کئی پیچ دکھلا　　دلِ بے کل کو راتوں رات لے گئے

۶۱ - بیتاب - نامش محمد اسمٰعیل شاگرد یک رنگ بود از وست

نہ ہوتا گر کسی سے مبتلا دل　　تو کیا آرام سے رہتا مرا دل
نجانوں کس پری رو کی نظر ہے　　ابھی تو تھا مرا چنگا بھلا دل

۶۲- **بیتاب** - نامش سنتوکھ رائے۔ معاصر میاں محمد قائم، قائمؔ تخلص
آزادہ مشرب بود۔ ۲ شعر (۳۲-ب)

۶۳- **بیتاب** - شاہ محمد علیم برادر کہتر قاضی مفتخر از سلسلۂ نجبا۔ و با علوم رسمیہ
آشناست۔ ہرچند راقم آثم او را ندیدہ۔ وصفات حمیدہ او
از زبان بعضے شنیدہ۔ از موزونان عہد شاہ عالم بادشاہ است
از وست ؎

رفتہ رفتہ بتِ خوش قدمرا آفت ہوگا — قدم آگے جو رکھے گا تو قیامت ہوگا
نگیں کی طرز یہ کیا مجھکو سخت بھاتی ہی — کہ ایک نام کی خاطر جگر کھداتی ہی

۶۴- **پاکباز** - نامش میر صلاح الدین پسر سید جمال از نبایر سید جلال ست
در دہلی اشعار خود از نظر مصطفےٰ خاں یکرنگ و میر عبد الولی
عزلتؔ تخلص صورتی می گزرانید ؎

مجھے درد و الم رہتا ہی نت گھیرے میاں صاحب — خبر لیتے نہیں کیسے ہو تم میرے میاں صاحب

۶۵- **بقا** - اسمش بقاء اللہ۔ خاصہ اضافہ کیا ہے ۱ $\frac{1}{2}$ سطر ۲ شعر (۲۳-ا)

بقا تخلص، محمد بقا نام، بیٹا حافظ لطف اللہ کا شاگردوں میں سے میرزا فاخر تخلص کے تھا۔ فی الحقیقت عزیز نکتہ سنج و باریک بیں، و معنی بند و سخن آفرین تھا۔ میرزا رفیع سودا تخلص کے مُنھ اکثر چڑھا، اور اس نہنگ بحرِ معانی کے ہجو میں کچھ کچھ واہیات بکر بکا، لیکن میرزائے مرحوم نے مطلق اعتنا نہ کی، اور یہ بات کہی کہ میں نے جس کی

ہجو کی، نام اس کا اسی تقریب سے تمام عالم میں ہوا مشہور رہے، سو تیری ہجو نہ کروں گا، کہ تیرا مشہور کرنا مجھے نہیں منظور ہے۔ غرض اس عزیز سے زمانے نے موافقت کبھی نہ کی اور صورت روزگار کی بیچارے نے آئینے میں خیال کے بھی نہ دیکھی۔ افلاس سے تنگ آکر کسی کے کہے سے کچھ اعمال تسخیر کواکب کے شروع کیے تھے۔ خیال میں اس سودائے خام کے مجنوں ہوئے، اور جب تک جیے سودائی رہے۔ سنہ ۱۲۰۶ بارہ سو چھ ہجری تھی کہ حالت میں سودائی کے یہ بات سوجھی کہ تحصیل دولتِ عقبیٰ کی کیجیے اور خاکِ راہ سے کربلائے معلّا اور نجف اشرف کے دیدۂ دل میں سرمۂ حق نما دیجیے۔ یہ عزم کر کے جہاز پر سوار ہوئے اور منزل مقصود کی طرف قدم گزار ہوئے۔ اثنائے راہ میں اس دار فنا سے، موافق نام اپنے کے، سفر ملک بقا کا کیا۔ خوشا یہ حال کہ انجام تو بہ خیر ہوا۔

یہ چند شعر اس راہ رو جادۂ بقا کے گوشۂ خاطر میں تھے، سو لکھے جاتے ہیں:-

یاد میں تڑپے ہے دل اس ابروئے خمدار کی — آج کچھ ناخن بدل ہے آہ! اس بیمار کی

دیکھیے، ہیں منصب مجنوں پہ یہ لیلیٰ صفتاں — خاک میں ہم کو ملا، کس کو سرفراز کریں

کیا خط لکھیں اُس کو حرکت ہاتھ سے گم ہے — خامہ مرے اب ہاتھ میں انگشتِ ششم ہے

کس نے چمن میں رنجہ کیا عندلیب کو — غنچے رہے ہیں دانتوں میں داب اپنی جیب کو

اس لب سے کچھ نہ چھٹے قدح، اور قدح سے ہم — تو کیوں ٹلے سبو سے قدح، اور قدح سے ہم

پاتے ہیں میکدے میں بقاؔ روز فیضِ مے — خم سے سبو، سبو سے قدح، اور قدح سے ہم

۶۶ - بیدار میر محمدی - کوئی اضافہ نہیں - ۳ سطر ۵۷ شعر

بیدار تخلص میر محمدی نام۔ شاہ جہان آبادی، دوستوں میں سے خواجہ میر درد تخلص کے تھے۔ نزاکت سے معنی کے بخوبی آشنا اور زبان دانانِ دلی سے ہمیشہ ہم نوا رہے ہیں کہتے ہیں کہ کلام اپنا انھوں نے اصلاح کی تقریب سے خواجہ میر درد کو دکھایا ہے اور

اُس نقّادِ بازارِ معانی سے فائدہ بہت سا اُٹھایا ہے۔ زبانِ ریختہ میں صاحبِ دیوان ہیں کچھ اشعار منتخب ان کے دیوان کے لکھے گئے یہاں ہیں،

تو نے جو مدّتوں میں ادھر کو گزر کیا
نالے نے آج کچھ تو ہمارے اثر کیا

غیرت نہ آوے تجھ کو ستمگر ہزار حیف
جس دل میں تو مقیم تھا وہاں غم نے گھر کیا

ہم غافلوں کی آہ نہ اودھر نظر گئی
اُس نے ہزار اپنے تئیں جلوہ گر کیا

اس کھیل سے کہہ اپنی مژہ کو کہ باز آئے
عالم کو نیزہ بازی سے زیر و زبر کیا

دیوانے کو پری سے پھر اب کر دیا دوچار
اے آنکھوں کیا کیا مرے جی کا ضرر کیا

کیدھر ہے تو کہاں ہے اجابت کہ بارہا
میں نے بلند دستِ دعا ہر سحر کیا

بیدار ایسے رونے سے اماں باز آ
دامان و آستیں کو تو لوہو سے تر کیا

آنکھوں میں چھا رہا ہے ازبس کہ نور تیرا
ہر گل میں دیکھتا ہوں رنگِ ظہور تیرا

بیدار وہ تو ہر دم سو سو کرے ہے جلوہ
اُس کو جو تو نہ دیکھے ہیگا قصور تیرا

جب کہا میں نے کہ اے سروِ ریاضِ خوبی
کس کا تو آفتِ جاں ہے تو کہا تجھ کو کیا

کہنے لگا دلِ گم گشتہ ہے تیرا مجھ پاس
جب کہا میں نے کہاں ہے تو کہا تجھ کو کیا

یہ کون پئے شکار نکلا
ہر دل ہو اُمیدوار نکلا

جینے کی نہیں ہے آس مجھ کو
تیر اُس کا جگر کے پار نکلا

ہم خاک بھی ہو گئے پر اب تک
دل سے نہ ترے غبار نکلا

جب بام پہ بے نقاب ہو کر
وہ صبح کو ایک بار نکلا

اُس رو زمقابل اُس کے خورشید
نکلا بھی تو شرمسار نکلا

نالہ ہر چند ہم نے کر دیکھا
آہ اب تک نہ کچھ اثر دیکھا

آج کیا جی میں آ گیا تیرے
متبسّم ہو جو ادھر دیکھا

بہے بیدار کی آنکھوں سے ساقی اشکِ سُرخ ایسے
مے گلگوں کا کوچہ میں گویا تیرے کے سبو ٹوٹا

سبزۂ خط ترے عارض پہ نمودار ہوا
حیف اس آئینۂ صاف پہ زنگار ہوا

آج آتا ہے نظر دن مری آنکھوں میں سیاہ
رات اس زلف میں دل کس کا گرفتار ہوا

کھینچ کر زلف کی تصویر کو خط میں بھیجو ل
تاکہ معلوم کرے حالِ پریشان مرا

اے شانہ کھولیو گرہِ زلف سوچ کر
دل سیکڑوں ہیں اس میں گرفتار دیکھیا

ہم چشمِ ابر دیدۂ تر گرچہ ہو سکا
لیکن غبارِ غم مرے دل سے نہ دھو سکا

جواب کے چھوڑے مجھے غم تری جدائی کا
تمام عمر نہ لوں نام آشنائی کا

اُگے ہے پنجۂ مرجاں مزار سے اُس کے
شہید ہو جو کوئی اُس کفِ حنائی کا

مرے قدم سے ہے سرسبز بوستانِ جنوں
ہر ایک آبلہ گل ہے برہنہ پائی کا

کہو تو کس سے میں پوچھوں نشانِ خانۂ دوست
کہ آشیانۂ عنقا ہے آستانۂ دوست

حال سُن سن کے ہنس دیا میرا
کچھ تو آیا ہے مہربانی پر

آج ساقی دیکھ تو کیا ہے عجب رنگیں ہوا
سرخ نے کالی گھٹا اور سبز ہے مینا کا رنگ

اُس سے دوچار ہو گئے ہم
سوجی سے نثار ہو گئے ہم

فتراک میں باندھ خواہ مت باندھ
اب تیرے شکار ہو گئے ہم

آ تیری گلی میں مر گئے ہم
جی تھا سو نثار ہو گئے ہم

خاکِ عاشق ہے جو ہوتی ہی نثارِ دامن
اے مری جان تو مت جھاڑ غبارِ دامن

خلشِ خارِ رہِ عشق سے اب اے ناصح
نہ رہا ایک بھی ثابت مرا تارِ دامن

ہم ترے اس دلِ نازک سے خطر کرتے ہیں
ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں

شبِ ہجراں میں نہ پوچھو کہ میں کیا کرتا ہوں
صبح تک شمع کی مانند جلا کرتا ہوں

صورت اُس کی سما گئی دل میں
آہ کیا آن بھا گئی دل میں

تم کو کہتے ہیں کہ عاشق کا فغاں سنتے ہیں
یہ تو کہتے ہیں کہ باتیں ہیں کہاں سنتے ہیں

اُٹھ گیا ہم سے گو مکدّر ہو
خوش رہے وہ جہاں ہو جیدھر ہو

اس سے بیدار بات تو معلوم
دیکھنا بھی کہیں میسّر ہو

تعجب ہے کیا ناتوانی ہے میری
کہ فصاد شرمندۂ نشتر ہو

دل کو کرتا ہے نگاہوں میں شکار
واہ واہ ہے تری صیادی کو

دیکھ آ کر مری آنکھوں کی بہار
کر دیا باغ ہر اک وادی کو

تری مجلس میں اگر ہو گزرِ پروانہ
نہ پڑے شمع پہ ہرگز نظرِ پروانہ

ہے زمانہ سے جدا روز و شبِ سوختگاں
شام کہتے ہیں جسے ہے سحرِ پروانہ

بوسۂ شمع کو جلنے کے بہانے آیا
دیکھو اے بزم نشیناں ہنرِ پروانہ

قید سے شمع کی ممکن نہیں چھوٹے بیدار
رشتۂ شمع سے باندھا ہے پرِ پروانہ

دیکھ تجھ کاکلِ مشکیں کی ادائیں شانہ
دونوں ہاتھوں سیتی لیتا ہے بلائیں شانہ

اُس کے بھر آئے تُرے مرہم کاکل سے زخم
ہاتھ اُٹھا کیوں نہ کرے تجھ کو دعائیں شانہ

ایک دن گر نہ ملی تجھ سے تو آشفتہ ہوئی
دیکھے کاکلِ مشکیں کی وفائیں شانہ

تھم گیا اشک شبِ ہجر میں روتے روتے
سحرِ وصل کو مدت ہوئی ہوتے ہوتے

مردمِ چشم سے پوچھ اے مہ تاباں تجھ بن
کون سی شب کہ نہ گزری مجھے روتے روتے

کیوں کر عاشق سے بھلا کوچۂ جاناں چھوٹے
بلبلِ زار سے کیوں کر کہ گلستاں چھوٹے

کس کے آگے میں کروں چاک گریباں کہ تو
جو ترے ہاتھ سے ناصح مرا داماں چھوٹے

عاشق کا اگر دیدۂ خوں بار نہ ہووے
تو رشکِ چمن کوچۂ دلدار نہ ہووے

بخشی ہے جسے تجھ نگہِ چشم نے مستی
وہ مست قیامت کو بھی ہشیار نہ ہووے

بیجا ہے شکایت ستم یار کی بیدار
ممکن ہے کہ معشوق دل آزار نہ ہووے

نہ وفا ہے نہ مہر و اُلفت ہے
اے ستمگر یہ کیا قیامت ہے

گلِ صد برگ دیکھو اس کے ہاتھ
دلِ صد چاک کی کنایت ہے

جس دن تم آکے ہم سے ہم آغوش ہوگئے
شکوے جو دل میں تھے سو فراموش ہوگئے

کہاں ہے تو کہ میں کھینچوں ہوں راہ میں تیری
بزنگ نقشِ قدم انتظار آنکھوں سے

اب تک مرے احوال سے وہاں بیخبری ہے
اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے

فولاد دلاں چھوڑیو زنہار نہ مجھ کو
چھاتی مری جوں سنگ شراروں سے بھری ہے

کس باغ سے آتی ہے بتا مجھ کو کہ یہ آج
کچھ اور ہی بو تجھ میں نسیم سحری ہے

لبِ رنگیں ہیں ترے رشکِ عقیقِ یمنی
زیب دیتی ہے تجھے نام خدا کم سخنی

ہار پہنے تھے جو پھولوں کے نشاں ہیں اب تک
ختم ہے گلبدنوں میں تری نازک بدنی

نشہ میں جی چاہتا ہے بوسہ بازی کیجئے
اتنی رخصت دیجئے بندہ نوازی کیجئے

زاہد اس راہ نہ آمست ہیں میخوار کئی
ابھی یہاں چھین لئے جبہ و دستار کئی

کف پا ہیں ترے صحرا کی نشانی بیدار
مرگیا تو بھی پھپولوں میں رہے خار کئی

میر مجلسِ رنداں آج وہ شرابی ہے
خون دل جس سے مرا بادۂ گلابی ہے

ترے اے پری پیکر سینہ پر نہیں پستاں
طاق حسن پہ گویا شیشۂ حبابی ہے

دوستو جانے دو اب ہاتھ اٹھاؤ ہم سے
یہ ہے وہ زخم کہ بہ ہو نہ کسی مرہم سے

مہرباں خیر تو ہے کس پہ یہ غصہ کیجے
آج آتے ہو نظر کچھ تو مجھے برہم سے

جو کچھ چاہیے آپ فرمائیے
یہ غیروں کی باتیں نہ سنوائیے

ڈراتے ہو کیا قتل کرنے سے ہم کو
اگر یوں ہی جی میں ہے آجائیے

رباعی

بیدار رواں ہے اشک دریا دریا
بتلا تو کہ ہے دیدۂ تر دریا دریا
رونے سے ترے تمام خانہ ہے خراب
حیراں ہوں میں اس میں ہے گھر یا دریا

---

۶۷ - پروانہ - مراد آبادی - اسمش سید پروان علی درین زماں کہ عہد
عالم شاہ است شنیندہ شد ترک دنیاداری کردہ لباسِ فقر
پوشیدہ از وست ؎

الفت جو کی ہے تم نے میاں اس کا ساتھ دو
یا دل جو لے گئے ہو مرا میرے ہاتھ دو

اپنا تو دل زمانہ سے اب اتنا تنگ ہے جو دم ہے زندگی کا سو شیشہ پہ سنگ ہے

۶۸ - پروانہ - اسمش راجہ جسونت سنگہ پسر مہاراجہ بینی بہادر و شاگرد
لالہ سرب سکھہ دیوانہ تخلص ست - الحال کہ سال بست و چہارم
جلوس شاہ عالم بادشاہ است در لکھنؤ می گزراند - و موزونی
طبع شعر فارسی و ہندی می گوید -

یوں آگ دی جگر کو میں اس دل کے داغ سے کرتے ہیں جوں چراغ کو روشن چراغ سے
بلبل زرا تو دیکھ کہ گلچیں چمن میں آج بو کر رہا ہی گل کے تئیں کس دماغ سے

۶۹ - بسمل - - حالش معلوم نیست (۳۲ - ل) ؎

باللہ نام عشق کا ہر گز نہ لیجئے
سب کیجئے پہ ایک محبت نہ کیجئے

۷۰ - بسمل - اسمش گدا علی بیگ - دریں زماں کہ عہد شاہ عالم بادشاہ است
شنیندہ شد در فیض آباد میگزراند مثنوی دیوک نامہ

از وے شہرتے دارد از وست۔ ۵ شعر

۱۷۔ بسمل۔ سید جبار علی۔ کوئی اضافہ نہیں۔ ۴ سطر ۴۳ شعر (۳۷ب)

بسمل تخلص، سید جبار علی نام، متوطن جبار کھڑکی۔ چند مدت انھوں نے عظیم آباد میں گزر گئے ہیں اور تھوڑے سے دن مہاراجہ جیت سنگھ، بنارس کے راجہ، کی وکالت میں اوقات بسر کی ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ سنہ ۱۱۹۶ھ گیارہ سو چھیانوے ہجری میں میر مذکور سے بلدۂ محمد آباد بنارس میں مکرر اتفاق ملاقات کا ہوا ہے۔ جوان سلیم الطبع اور سخن فہم نظر پڑا، آزاد وضع اور وارستہ مزاج دکھائی دیا۔ یہ اشعار اس کے خلاصہ افکار ہیں:

نامۂ درد والم میں نے جب آغاز کیا — جو ترے غم کے سوا تھا قلم انداز کیا

اتنا بھی داغِ عشق سے معمور ہو گیا — سینہ تمام خانۂ زنبور ہو گیا

یار تیری ہی زلف میں دیکھا — ایک زنجیر لاکھ دیوانہ

کیا خیال آئے بلاؤں سے اُسے پرہیز کا — ہے جو بیمار اس تری چشمِ بلا انگیز کا

آگ ہر ساعت برستی ہی نہ تنہا چشم سے — ہے تماشا استخوانوں میں مری گلریز کا

جب غمزۂ چشمِ یار دیکھا — سو تیر جگر کے پار دیکھا

یاد آگئی مشتِ خاک اپنی — اُڑتے جو کہیں غبار دیکھا

دل خس و خاشاک کی صورت اٹکتا ہی رہا — گو سدا دامن کو اپنے وہ جھٹکتا ہی رہا

جستجو میں یار کی گم کردہ راہوں کی طرح — میں کبھی ایدھر کبھی اودھر بھٹکتا ہی رہا

خط ترا نامِ خدا خط ہے ادا و ناز کا — دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے اس آغاز کا

کیا اس کو جتا دیں ہم جو ہم نے کیا ہو گا — کیا کیا نہ کیا ہو گا جب دل کو دیا ہو گا

دل میں برنگِ موج تمھارے وصال کا — بڑھ بڑھ کے اشتیاق کئی بار گھٹ گیا

ہر دم مجھے نیاز اُسے ناز ہی رہا — انجامِ کارِ عشق کا آغاز ہی رہا

صیاد فائدہ ہے رہائی سے کیا مجھے
اُڑنے سے جب مرا پرِ پرواز ہی رہا

سدا نکلا ہی کرتا ہے پگھل کر آتشِ غم سے
سرشک آنکھوں سے میری روغنِ بادام کی صورت

خدا ہرگز نہ دکھلاوے کسی کو غیر بسمل کے
تمہارے خنجرِ مژگانِ خوں آشام کی صورت

تیرِ نگاہ بسکہ لگی چھوٹ چھوٹ کر
چھاتی مشبکہ وار ہوئی پھوٹ پھوٹ کر

یہ داغِ عشق مثلِ نئے نے نواز کے
نکلے ہے بند بند سے اب پھوٹ پھوٹ کر

پہلو میں رکھوں میں دلِ ناشاد کہاں تک
اے درد کروں نالہ و فریاد کہاں تک

در آج قفس کا ہے کھلا کیجئے پرواز
اے ہم قفساں خاطرِ صیاد کہاں تک

زمانے سے نرالے ہیں جگر افگار کہتا ہوں
کہ لوگ ابرو جسے کہتے ہیں میں تروار کہتا ہوں

جز یادِ حق نہ ہو ترے دل میں کبھو گرہ
دے سبحہ وار منہ پہ اگر اپنے تو گرہ

ہر دم نمودِ قبضۂ شمشیر کی طرح
رہتی ہے ابروؤں میں ترے تند خو گرہ

دل کی طلب ہے اور تمنا ہے جان کی
کیا مہربانیاں ہیں مرے مہربان کی

درد و الم سے منزلتِ دل ہے بس بلند
یعنی مکیں سے ہے گی بزرگی مکان کی

لے خانہ اس غلام ارشاد کیجئے
گو کام کا نہ ہووے تو آزاد کیجئے

کوئے بتاں تلک تو رسائی محال ہے
جب تک یہ مشتِ خاک نہ برباد کیجئے

پیارے یہ وضعِ چشمِ مروت سے دور ہے
دل لے کے اس طرح بھی نہ آنکھیں چرائیے

روبرو تیرے ہی گر ظالم نہ یہ دل کیجئے
پھر اس آئینہ کو جا کس کے مقابل کیجئے

اُٹھتا ہے وہ غبار ہمارے مزار سے
ٹکر لیا کرے ہے جو نت کوہسار سے

آوارگی سے بات کروں آہ کس طرح
دل تو گزر چکا ہے مرے اختیار سے

گریہ افزا اس قدر اعضا مرے سارے ہوئے
ہر بنِ مو جوشش سے آنسو کے فوارے ہوئے

پیش آئی ہمارے وہ جو کچھ کہ تھی پیش آنی
اب یہ درِ دولت ہی اور اپنی یہ پیشانی

عشق کی بازی میں بسمل دل جلے درکار ہے
کس لئے تو اس قدر بیٹھا ہے جی ہارے ہوئے

تیری ہی یاد ذکر ہی تیرا ہر آن ہے — گویا کہ اس لئے مرے منھ میں زبان ہے
عہدہ پیمانِ بتاں بسکہ بہ سالوسی ہے — ایک امید تو سو باعثِ مایوسی ہے
داغ اتنے ہی دیئے عشق نے تیرے کہ تمام — مو بمو تن پہ مرے جلوۂ طاؤسی ہے
آیئے جلد کہ بسملِ مجروح ہنوز — ہر لبِ زخم سے مشتاقِ قدمبوسی ہے

رباعی

دُکھ درد کو کب تلک حکایت کیجئے — دوراں کی کہاں تلک شکایت کیجئے
اس کشورِ دل پہ فوجِ غم کا ہے ہجوم — یا شاہِ نجف میری حمایت کیجئے

حرف التاء

۷۲۔ **تانا شاہ**۔ بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ ۲ سطر، اشعر۔(۳۔ ا)

نام نامی، ور اسم گرامی اس بادشاہ عشرت دوست کا ابو الحسن تانا شاہ ہے۔ سلاطینِ نامدار اور خواقین عالی مقدار دکھن سے تھا اگرچہ شہرا عیش ونشاط کا اور آوازہ مسرت و انبساط کا اس عیش مجسم کے ماہ سے ماہی تک مشہور رہے، لیکن کچھ تھوڑا سا احوال اس سر برآرائے بارگاہ عیش و کامرانی کا یہاں لکھنا ضرور ہے جس ایام میں کہ عالم گیر خلد مکاں نے عادل شاہی اور نظام شاہیوں کو زیر و زبر کیا، اور صوبہ دکھن کو بعد بہت سی خرابی کے لیا، تو ابو الحسن تانا شاہ بھی نظر بندی میں آئے، اور فلکِ نیرنگ باز نے بدلے اس عیش و عشرت کے اور ہی رنگ دکھائے۔ سامان عیش سب برہم ہوا، اور مجمعِ ارباب نشاط حلقۂ ماتم ہوا۔ خلد مکان نے جس قدر تنگی ان کی اوقات میں چاہی، انھوں نے قبول کیا، لیکن حقّہ کے مقدمہ میں بہت سماجت کے ساتھ اتنی بات کہلا بھیجی کہ اس کا شوق مجھے نہایت ہے، جو رعایت کہ اس کے سامان میں ہوگی وہ عین عنایت ہوگی۔" ازبسکہ یہ بادشاہ

عشرت دوست آٹھ پہر نشۂ عیش میں مخمور رہتا تھا، حقّہ ایک دم مُنھ سے نہیں چھٹتا تھا اور یہ بھی معمول تھا کہ بعد ہر چلم کے ایک شیشہ سے گلاب کے حقّہ تازہ ہووے، پھر ایک شیشہ میں بید مشک کے حقّہ بردار نیچے کو بھگووے، شغل میں عیش ونشاط کے ازبسکہ دن کو کم سوتے تھے، سیکڑوں شیشہ گلاب خالص اور عرق بید مشک کے دن رات میں خرچ ہوتے تھے۔ یہ سب احوال مفصل خلد مکان کو معلوم تھا۔ علاوہ اس کے بادشاہ نے اس عجز سے کہلا بھیجا۔ بارہ سولہ شیشہ گلاب کے اور آٹھ شیشہ بید مشک کے حکم فرمائیے۔ سبحان اللہ! یا تو حقہ آٹھ پہر منھ سے نہیں چھٹتا تھا اور اُن کے دودِ محفل کے رشک سے دھواں حسد کا حقہ سپہر آسمان میں گھٹتا تھا، یا پیچ فلکِ حقہ باز کی آٹھ چلمیں دن رات میں یہ پیتے تھے اور گھونٹ گھونٹ کر عجب پیچ وتاب کے ساتھ جیتے تھے۔ اس میں بعد کئی دن کے حضرت خلد مکان نے فرمایا کہ سولہ شیشہ گلاب اور بید مشک کے ہر روز حقہ کے مصرف میں آنے اسراف ہے، اور امورات شرعی میں پاسِ خاطرِ بیجا بیجا، اور تکلفِ رسمی معاف ہے۔ آٹھ شیشہ ہر روز یہاں سے جایا کریں۔ ایک شیشے سے بعد ہر چلم کے حقہ تازہ کر کے آٹھ چلمیں دن رات میں پئیں، جب حضور سے ہر روز آٹھ شیشے آنے لگے، تو یہ دن رات میں لاچار چار چلموں سے دل بہلانے لگے۔ یہ ماجرا سُن کر خلد مکان نے ضد کے مارے چار شیشوں کی اور تخفیف کی۔ انھوں نے اپنے حقہ بردار کو دو چلموں کی پروانگی دی۔ بعد کئی دن کے جب دو شیشے اور کم ہوئے تو ایک چلم دن رات میں یہ پیا کرتے تھے۔ جس دن ان دونوں شیشوں کا بھی آنا موقوف ہوا، اُس دن انھوں نے عرض کیا۔ جہاں پناہ کی دولت سے اتنا کچھ بعد خرچ کے جمع کیا ہے کہ دس چلمیں روز اسی خرچ کے ساتھ سالہائے سال پلا سکتا ہے، اُمید ہے کہ بھیڈی خانے کے خرچ کا غلام کو حکم ہووے کہ نہال نمک حلال کا زمین میں سرخروئی کے بووے ارشاد فرمایا کہ حضرتِ اعلےٰ

کو امورات شرعی کا بہ شدّت دھیان ہے، اگرچہ مسجد کا کھود ڈالنا، خزانہ اُس کے نیچے گڑا اُس کر نہایت آسان ہے، تو جو ہمارے مصرفِ بیجا کا کفیل ہوتا ہے ابھی ایک دم میں جمع پونجی سر پہ ہاتھ دھر کے روتا ہے۔ غرض اُس دن سے پھر حقّہ نہ پیا، جب تک کہ ان کی نظر بندی میں رہے اور اس سرائے فانی سے عالمِ باقی کو تشریف لے گئے۔ سبحان اللہ! چشمِ حقیقت بیں سے اگر کوئی دیکھے تو دنیا جائے حسرت ہے، بلکہ خانۂ زحمت ہے

کدھر ہیں خسرو و جم لطف کیقباد کدھر — کہاں سکندر و دارا کہاں ہے کیکاؤس
جو مستِ جاہ ہیں دیکھیں وہ چشمِ عبرت سے — کچھ ان کے ساتھ گیا غیر حسرت و افسوس

اگرچہ ملک گیری اور کشور کشائی کے معاملہ کو سمجھنا شاہانِ عالی تبار پر ختم ہوا ہے، گدائے گوشہ نشیں کو دخل ان امورات میں کیا ہے۔ لیکن بعضے دانشمند کہتے ہیں کہ خلد مکاں نے استیصال بادشاہانِ دکن کا جو اس محنت سے کیا اور رنگہ مسجد کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے۔ تحصیل حاصل سے بھی اس میں کچھ کیفیت زیادہ ہے۔ کس واسطے کہ پیش از تسخیر دکن کے بھی خراج و باج اس طرف چلا آتا تھا اور بادشاہانِ ہندوستان کا شہنشاہ کہاتا تھا۔ مآل اس مشقت کا اعجوبہ نظر آیا، کہ اس حسن تردد نے شاہنشاہ کو بادشاہ کر دکھایا ؎

واقف رموزِ ملک سے ہیں شاہ و شہریار
ہے تو گدائے گوشہ نشیں لطف کچھ نہ بول

غرض شاہ عالی جاہ ابوالحسن تاناشاہ کی طرف لوگ اس مطلع کو منسوب کرتے ہیں اور باعتبار محاورۂ دکن کے اور بندش قدیم کے کہ اس مطلع میں ہے، ابراہیم خاں مرحوم بھی گفتگو پر لوگوں کی گوش دل کو دھرتے ہیں۔ مطلع یہ ہے :-

کس در کہوں، جاؤں کہاں، مجھ دل پہ بہوں بجھرا ہے
اک بات کہے ہونگے سجن، یہاں جی ہی بارہ بات ہے

۷۳۔ تاباں ۔ اسمش میر عبدالحی جوان رعنائے منظور ناظران خاصہ مفتون سلیمان نامی بود در آوانِ جوانی زمان فردوس آرامگاہ انتقال نمود مجالست با مرزا مظہر و مرزا محمد رفیع سودا داشت زیبائی او روشن تر از سخن سرائی او بود از وست

(۶۰ شعر)

تاباں تخلص، میر عبدالحی نام، شاہ جہان آبادی۔ نہایت عزیز خوب صورت اور صاحب جمال تھا، ایسا کہ دلّی سے شہر میں بے مثال تھا۔ ہندو مسلمان ہر گلی کوچہ میں ایک نگاہ پر اس کے لاکھ جان سے دین و دل نذر کرتے تھے اور پرے کے پرے عاشقانِ جانباز کے یاد میں اس لب جاں بخش، مسیحادم کے مرتے تھے۔ تکلف یہ ہے کہ اس رعنائی اور دل ربائی پر خود بدولت بھی دل کو کھو بیٹھے تھے اور ہنستے ہنستے بے اختیار صبر اور اختیار کو رو بیٹھے تھے۔ اس بے دردی اور شیریں ادائی پر مانند فرہاد کے چاشنی درد سے آگاہ، اس سرد مہری اور لیلیٰ صفتی پر مانند مجنوں کے ہمیشہ سرگرم نالہ و آہ تھے، یعنی ایک سلیمان نام لڑکے کو چاہتے تھے اور اُس کے درد محبت سے باوجود وصل کے، آٹھ پہر کراہتے تھے۔ وہی سلیمان کہ بالفعل شاہ سلیمان کر کے معروف تھا اور اداکرنے میں راہ و رسم درویشی کے بہ شدت مصروف، اس موضعیف نے عالم پیری اُس کا ۱۲۰۱ سنہ بارہ سو ایک ہجری تھے کہ بلدۂ لکھنو میں دیکھا۔ اگرچہ ریش سفید اور قد خمیدہ رکھتا تھا لیکن اس کے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کسی وقت میں بڑے بڑے گردن کش، سوئی کے ناکے سے نکالے ہوں گے۔

غرض میر عبدالحی تاباں تخلص۔ میرزا جان جاناں مظہر سے اور مرزا رفیع سودا سے ہمیشہ صحبت رکھتے تھے، بلکہ میرزا رفیع سودا بنا بر اک نظر توجہ کے کہ اُن کے حال پر تھی اکثر اشعار کو ان کے اصلاح کرتے تھے۔ عین شباب کے عالم اور جوبن کے عروج میں کہ

زمان فرمان فرمائے محمد شاہ فردوس آرام گاہ کا تھا، اس ماہِ تابانِ حسن نے جامۂ زندگی کو مانند کتان کے چاک کیا ہے۔ یہ منتخب ان کے دیوان کا ہے ؎

ہ سبز خط سے دونا ہوا حسن یار کا — آخر خزاں نے کچھ نہ اُکھاڑا بہار کا
اکثر جو اس زمین کو ہوتا ہے زلزلہ — شاید گڑا ہے جسم کسی بے قرار کا
کس کس طرح سے دل میں گزرتی ہیں حسرتیں — ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا

اخگر کو چھپا راکھ میں، میں دیکھ کے سمجھا — تاباں تو تہ خاک بھی جلتا ہی رہے گا

کوئی دوسرا مجھ سا تاباں نہ ہوگا — کہ دل دے بُتے پھر پشیماں نہ ہوگا

جفا سے اپنی پشیماں نہ ہو ہوا سو ہوا — تری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا
نہ پائی خاک بھی تاباں کی ہم نے پھر ظالم — وہ ایک دم ہی ترے روبرو ہوا سو ہوا

بیتابیوں کی عشق کے کرتا ہے کیا علاج — تاباں یہی جو دل ہے تو آرام ہو چکا

آشنا ہو چکا ہوں میں سب کا — جس کو دیکھا سو اپنے مطلب کا
ہیں بہت جامہ زیب، پر ہم نے — کوئی دیکھا نہیں یہ چپ ڈھب کا
یاں پلک بھی نہ ہم سکیں جھپکا — ایسا قاصد تو جائیو لپکا

دیا ہے جی میں اپنا دیکھ کر سج جس کے جامہ کی — اُسی کالے کے دامن کھینچیو یارو کفن میرا

لیا تھا دوستی سے جن نے دل ہائے — وہ اب دشمن ہوا ہے میرے جی کا
مجھے ترسا کے اس کافر نے مارا — نتیجہ کیا یہی تھا عاشقی کا

ہونٹوں پہ تیرے ظالم مسّی کی یہ دھڑی ہے — یا اُن کے تئیں کسی نے مل مل کیا ہے نیلا

اکیلا صنم باغ میں کل گیا تھا — اسے دیکھ کانٹوں پہ گل لوٹتا تھا
لیا چاہ سے کھینچ یوسف کو اپنے — ترا عشق تاباں قیامت رسا تھا
فغاں نے مرا مُنھ پھر آکر کھلایا[1] — ابھی روتے روتے ہی چپکا رہا تھا

---

[1] یعنی کھلوایا ۱۲

مری لوحِ تربت پہ یارو کھدانا
نہ اُس سنگ دل سے کوئی جی لگانا

ترے غم سے نسیاں ہے یاں تک تو مجھکو
اِدھر بات کہنا اُدھر بھول جانا

گلی میں اپنی روتا دیکھ مجھ کو وہ لگا کہنے
"کہ کچھ حاصل نہیں ہونے کا ساری عمر رو بیٹھا"

صبا میرا پیغام اُن تک تو لے جا
کہ تجھ بن رہیں ہم کہاں یہ کلیجا!

کسی بات کا میں نہ شکوہ کروں گا
ترے جی میں آوے سو مجھ کو کہے جا

ایسے کے تئیں کوئی سر پہ بھی چڑھاتا ہے؟
کھینچے ہے تری زلفیں، کیا شوخ ہے یہ شانہ

تمھارے ہجر میں رہتا ہے غم ہم کو میاں صاحب
خدا جانے جئیں گے یا مرینگے ہم میاں صاحب

مرا بس ہو تو ہرگز خط نہ آنے دوں ترے لیکن
لکھا قسمت کا کوئی بھی مٹا سکتا ہے کیا قدرت

غیر کے ہاتھ میں اُس شوخ کا دامان ہے آج
میں ہوں اور ہاتھ ہے اور میرا گریبان ہے آج

لے میری خبر، چشم مرے یار کی کیوں کر
بیمار عیادت کرے بیمار کی کیوں کر

کہتے ہیں اثر ہیگا گریہ میں ہیں یہ باتیں
اک دن بھی نہ یار آیا روتے ہی کٹیں راتیں

سُن فصلِ گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں
کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں

بیمار ہے زمیں سے اُٹھتی نہیں عصا بن
نرگس کو تم نے شاید آنکھیں دکھائیاں ہیں

قسمت میں کیا ہے دیکھیں جیتے رہیں کہ مر جائیں
قاتل سے اب تو ہم نے آنکھیں لڑائیاں ہیں

آشنا تو مجھ سے ایسا ہے کہ جیسا چاہیے
پر جو کچھ دل چاہتا ہے ہائے وہ ہوتا نہیں

شب کو پھرے وہ رشکِ ماہ خانہ بخانہ کو بکو
دن کو پھروں میں دادخواہ خانہ بخانہ کو بکو

گئے نالے ترے برباد جوں بانگ جرس جیت
اثر دیکھا تری فریاد میں دل ہم نے بس جیت

سلیماں کیا ہوا گر تو نظر آتا نہیں مجھ کو
مری آنکھوں کی پتلی میں تری تصویر پھرتی ہے

بتاں کے شہر ناپرساں میں کب کوئی داد کو پہنچے
مگر یہاں اپنے بندوں کی خدا فریاد کو پہنچے

تو بھلی بات سے بھی میری خفا ہوتا ہے
کیا بھلا چاہنا ایسا ہی بُرا ہوتا ہے

تری ابرو سے مرا دل نہ چھٹے گا ہرگز
گوشت ناخن سے کہوں کوئی جدا ہوتا ہے

ترے پاس عاشق کی عزت کہاں ہے
تجھے بے مروّت، مروت کہاں ہے
میں شکوہ کروں جورِ ظالم سے لیکن
مجھے آہ و نالہ سے فرصت کہاں ہے
بیاں کیا کروں ناتوانی میں اپنی
مجھے بات کہنی کی طاقت کہاں ہے
جو اُس کی کمر میں نے دیکھی ہے تاباں
رگِ گل میں ایسی نزاکت کہاں ہے
جو کرتا ہوں فریاد میں اُس کے آگے
تو کہتا ہے تاباں تو جاتا نہیں ہے
ابھی بست ہو جاگا لاتوں کے مارے
ترا شور کچھ مجھ کو بھاتا نہیں ہے

رباعی

ہوتا ہوں ترا جو اشتیاقی ساقی
بے خود ہو پکارتا ہوں ساقی ساقی
ہے مجھ کو خمارِ شب کا لا صبح ہوئی
شیشے میں جو کچھ کہ مے ہو باقی ساقی

مخمس

بیاں میں کیا کروں دیوانگی کا اپنی افسانہ
نہ میرا گھر میں جی لگتا نہیں بھاتا ہے ویرانہ
خوش آتا ہے مجھے گلیوں میں سنگِ کودکاں کھانا
ارے ناصح عبث ہے یہ ترا بیہودہ سمجھانا
پری رو ہو جدا جس کا سو ہو کیونکر نہ دیوانہ
عبث مت بک نہیں میں ماننا کہنا ترا ناصح
مری آہ و فغاں کرنے سے تبلا تجھ کو کیا ناصح
میں اپنے جی ہی سے بیزار ہوں مت تو ستا ناصح
بھلا چاہے تو اپنی آبرو کو لے کے جا ناصح
مجھے بے طرح آتا ہے تری باتوں پہ جھنجلانا
تو کیوں بیہودہ بکتا ہے نصیحت کے سخن اکثر
سنوں کیوں کر تری باتیں کہ میرا حال ہے ابتر
رہوں آرام سے بے یار اے ناصح بھلا کیونکر
کہ میری زندگی اور موت ہے موقوف اس ہی پر
اگر آوے تو جی جانا دگر جاوے تو مر جانا

لہ ہوجاگا یعنی ہو جائے گا ۱۲

کبھی راتوں کے تئیں کرتا ہوں گھر بیچ نالہ و افغاں
کبھی پھرتا ہوں صحرا بیچ میں وحشت سے ہو عریاں
کبھو ہوتا ہی تا باں ساتھ میرے محشر طفلاں
مرے تئیں اس طرح سے دیکھ کر سب خوار و سرگرداں
کوئی کہتا ہے سودائی کوئی کہتا ہی دیوانہ

۴۷ - **تمکین** دہلوی - اسمش میر صلاح الدین در زمان محمد شاہ فردوس آرام گاہ
در لباس آزادہ حالاں می زیست - از وست ؎

حسن اور عشق کو جس روز کہ ایجاد کیا
مجھکو دیوانہ کیا تجھکو پری زاد کیا

۴۷۵ - **تقی** دہلوی - اسمش سید محمد تقی معروف بمیر گھاسی - گاہے فکر ریختہ
می نماید از وست ؎

تجھ ہجر میں اے لشکر خوباں کے شاہ
سینے پہ میرے غم سے یہ ہی حالت آہ
جیسے رکتی ہی پل پہ دریا کی بھیڑ
پیچھے کو نہ پھر سکے نہ آگے کو راہ

۴۷۶ - **تصوّر** - تا تحریر اوراق معلوم نہ شد کہ کیست و کجائیست -
شعر بسیارے از وے بہ نظر رسیدہ - ایں بیت
از آں جملہ است ؎

دیکھے جو تری چشم نیم مست کو یکبار
پھر حشر تلک وہ کبھی ہشیار نہ ہووے

۴۷۷ - **تصویر** - مرشد آبادی - شاہ جواد علی - درویشے ست نو مشق
از گردہ از تقریر سخنوراں بردارد ممکن ست کہ کلامش
صورتے پیدا کند از وست ؎

قد و قامت اس بتِ مغرور کا ایک جھمکا ہے خدا کے نور کا

۷۸۔ **تمنا** ۔ عظیم آبادی۔ اسمش خواجہ محمد علی خلف خواجہ عبداللہ تائید جوان
سعادت مند و از محبان راقم آثم ست طبیعش اشعار آبدار را
طالب و گاہے بہ نظم ریختہ راغب ست ایں اشعار آں ستودہ
اطوار ست۔ ۶ شعر (۴، ب)

حرف الثاء

۷۹۔ **ثاقب** ۔ اسمش شہاب الدین۔ در دار الخلافہ دہلی زماں محمد شاہ
فردوس آرام گاہ، معاصر مرزا محمد رفیع سودا بود۔ از وست۔

قتل کا کس کے ہے اب قصد تمہارے دل میں
کیوں دکھاتے ہو میاں سان پہ تروار کتیں

۸۰۔ **ثابت** ۔ اسمش شجاعت اللہ خاں، اصلش پانی پت و از شاگردان
مرزا جعفر علی حسرت و بنا بر نواب دلیر خان ست از وست۔

آتے ہو تم تو دل میں کئی بار اس طرف
پر دیکھتے نہیں کبھی اے یار اس طرف

۸۱۔ **ثابت** ۔ اسمش اصالت خاں۔ قوم افغان۔ از مدتے در عظیم آباد

سکنی گزیدہ۔ تتبع زبان اُردو نمودہ۔ عمرے در ریختہ گوئی بسر بردہ۔ در ینولا کہ سنہ ۱۲۹۵ ہجریہ باشد باستصواب مرزا محمد علی فدوی تخلص فکر اشعار می نماید۔ ایں ابیات از افکار اوست۔ ۱۰ اشعر (۴۱)

حرف الجیم

۸۲۔ جہاندار۔ مرزا جواں بخت۔ علی لطف نے وہ ذکر چھوڑ دیا ہے جس میں علی ابراہیم نے اپنے متعلق لکھا ہے کہ جب جہاندار بنارس آئے تو علی ابراہیم وہاں حاکم تھے اور جہاندار کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی عنایتوں سے بہرہ ور ہوئے تھے (وغیرہ) اس حذف کو درگزر کرنے کے بعد علی لطف کے بیان میں بعض مفید اضافے نظر آتے ہیں۔

۱۳ ½ سطر ۹ شعر (۴۲-الف)

جہاندار تخلص، میرزا جواں بخت جہاندار شاہ نام، خورشید آسمان بلند اختری اور سر فرازی کا ولی عہد شاہ عالم بادشاہ غازی کا، رونق دینے والا بارگاہ جہانداری اور جہانبانی کو زینت بخشنے والا مسندِ ملک گیری اور کشور ستانی کو، ہر خطِ جبین جہاں افروز کا اس کے واسطے روشن کرنے عالم کے، مانند خطوط شعاعی آفتاب کے دور کرنے والا تاریکی فلاکت کا تھا اور دو دست دریا نوال اُس کا افراط جود و کرم سے مانند ید بیضا کے

روشن کرنے والا۔ کوشش ناموسِ امارت اور ایالت کا بخشش نے اُس کی، دشمنی آسمان کے
دل سے فلک زدوں کی نکالی، اور ہمت نے اُس کی گرہ بد طالعی کی پیشانی سے بدبختوں کی
کھول ڈالی۔ جس ایام میں کہ ناموافقت سے اُمرائے دولت کی۔ نشانِ کیوان شان اس
فلک جناب کے دار الخلافہ دلی سے بیچ حرکت کے آئے، تو سنہ ۱۱۹۸ گیارہ سو اٹھانوے
ہجری تھی، کہ خود بدولت و اقبال لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے
جو مراتب و آداب خدمت گزاری کے تھے، سب ادا کیے۔ خواصی میں بیٹھنے کے سوائے
گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے۔ باوصف اس ناز پروری کے کہ کبھی پیادہ
چار قدم کاہے کو چلے تھے۔ پانچوں ہتھیار باندھے ہوئے ایک الائچی اور گلوری کی بخشش
پر دس دس مرتبہ حجرہ گاہ پر سے جا کر آداب بجا لاتے تھے۔ غرض اس شہزادۂ عالی تبار
کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر آئی تھی، کہ مہینے میں دو مرتبہ بنا مشاعرے کی اپنے
دولت خانہ میں ٹھہرائی تھی۔ شعرائے باوقار کو اپنے چوب دار بھیج کر مشاعرے کے
دن بلواتے اور ہر ایک شخص سے نہایت الطاف اور عنایت کے ساتھ گرم جوشی فرماتے۔
چنانچہ راقم حقیر کو جب یاد فرمایا، تو اس ہیچمداں نے یہ عذر کہہ بھجوایا کہ "کمترین نے
مشاعرے کا جانا مدت سے موقوف کیا ہے، ازبسکہ ان صحبتوں میں مناظرہ ہی کو یاران
عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے، اگر ارشاد ہو تو سوائے مشاعرے کے ایک دن بندگی
میں حاضر ہوں اور اس تخم ناکاشتنی بے مغز کو موافق ارشاد کے زمین عرض میں بوؤں"
پزیرا نہ ہوا، پھر چوب دار آیا، اور یہ ارشاد فرمایا کہ "تیرا حاضر ہونا مشاعرے میں
نہایت ضرور ہے، مناظرے کا مطلق ہمارے ہاں نہیں دستور ہے۔" غرض ایما سے
نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا اور شرف سعادت ملازمت کا حاصل کیا۔ یکرہ
غزلیں اس دن از راہ تفضلات کے پڑھوائیں اور ہر شعر پہ کیا کہوں کہ کیا کیا عنایتیں
فرمائیں۔ پھر اپنی طبع زاد سے بہت کچھ ارشاد فرمایا، اور سامعین کو موردِ عنایت و امداد

فرمایا۔ سنہ ۱۲ بارہ سو ایک ہجری میں بلدہ بنارس کے اندر اس سریر آرائے بارگاہ شوکت و اجلال نے تخت نشینی ملک فنا کی چھوڑ کر اورنگ آرائی کشور بقا کی اختیار کی۔ یہ اشعار منتخب اُس سلطان عالی تبار کے ہیں ؎

نہ پوچھو دہر میں کیا کر چلے ہم — اسی ہی آرزو میں مر چلے ہم
رہے اک شب جو اس ماتم کدے میں — بسانِ شمع رو رو کر چلے ہم
اکیلے تھے ہم اب اک فوجِ غم ہے — ترے در سے مع لشکر چلے ہم
نہ تھے جوں گل کبھی اوراقِ دل جمع — کہ اس گلشن میں کر ابتر چلے ہم

رہے در پر بتاں کے تم جہاندار
خدا حافظ تمہارا گھر سے چلے ہم

جدا ہو تجھ سے صنم سخت بے قرار ہوں میں — یہ دیکھ آئینہ ساں چشم انتظار ہوں میں
بسا ہی میرا سراپا جو عطر فتنہ سے — یہ کس کی نرگسِ فتّان سے دوچار ہوں میں
نہ جور سے فلکِ حیلہ گر سے گھبرا کر — مثال ابر بہاری کے اشکبار ہوں میں
نظر پڑا ہے وہ آویزہ گہر جب سے — صدف سے چشم کی تب سے گہر نثار ہوں میں

ہے آفتاب کا سر پہ مرے جو پرتوِ مہر
بسانِ ماہ جہاندار آشکار ہوں میں

ہیں بسکہ جز و تن مرے طاؤس وار داغ — رکھتا ہے ایک ایک عجب ہی بہار باغ
رعنائی تیری دیکھ کے اے سروِ باغِ حسن — جوں لالہ دل پہ کھاتے ہیں سب گلعذار داغ

آتش پہ میرے دل کے جہاندار جوں سپند
چاہوں جو ٹھہرے، کر نہیں سکتا قرار داغ

۸۳ - جرأت - شیخ قلندر بخش - اضافہ کیا ہے - ۶ ½ سطر ۸۲ شعر (۴۵ - ۱)

جرأت تخلص، یحییٰ امان قلندر بخش نام، بیٹا حافظ امان کا۔ شاعر شیریں کلام ہے۔ ظاہرا

لفظ "امان" کا ان کے بزرگوں کے نام پر بطور خطاب کے زمان اکبری سے چلا آتا ہے اور جرأت مذکور رشید شاگردوں میں میرزا جعفر علی حسرت تخلص کے گنا جاتا ہے۔ علم موسیقی میں شغلہ بھلا چنگا رکھتا ہے اور ستار کے بجانے میں نہایت دست رسا رکھتا ہے۔ نجوم میں بھی اس شخص کو دخل تمام ہے، ایسا کہ ایک عالم لکھنؤ کا اس کا منتظرِ احکام ہے۔ تمام عمرِ عزیز کی بےکاری میں بسر ہوئی ہے اور بےروزگاری میں کٹی ہے۔ ابتدا میں نواب محبت خاں محبت تخلص اعانت اخراجات ضروری کی کرتے تھے، بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، صاحب عالم و عالمیان میرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے کچھ امداد ہوتی ہے۔ اگرچہ بصارتِ چشم سے یہ عزیز معذور رہے، پر ملاقاتوں کو دوستوں کی پہچانتا دور دور ہے۔ گو کہ آنکھوں سے کچھ نہیں سوجھتا ہے لیکن مضمون رنگین سوجھتا ہے زبان ریختہ میں صاحبِ دیوان عظیم الشان۔ یہ اُس کا منتخب دیوان ہے ؎

چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا — دن گیا رات ہوئی، رات گئی دن آیا
دن بدن تحلیل تو جرأت ہوا جاتا ہے کیوں؟ — آہ! یہ بیٹھے بٹھائے تجھ کو کس کا غم لگا
دل کو اے عشق سوئے زلفِ سیہ فام نہ بھیج — رہزنوں میں تو مسافر کو سرِ شام نہ بھیج
روشن ہے اس طرح دلِ ویراں کا داغ ایک — اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک
میرے ہونے سے تو کچھ گرمیِ بازار نہیں — ہوں میں وہ شے کہ کوئی جس کا خریدار نہیں
دل تو اُمڈے ہی یہ حیرت سے میں کیونکر روؤں — ابرِ تصویر کو گریہ سے سروکار نہیں
درد کیا جانیے کیا کیا یہ بیاں کرتا یار — دہنِ زخم کو گویا لبِ گفتار نہیں
تیرے بیمار سا بیمار نہ ہوگا کوئی — جس کو ظاہر میں جو دیکھو تو کچھ آزار نہیں
جس کے غم میں آہ ہم آرام سے واقف نہیں — کیا غضب ہے وہ ہمارے نام سے واقف نہیں
رو کے میں پوچھا کہ مقصد جانتے ہو تم مرا — ہنس کے بولا میں کسی کے کام سے واقف نہیں
کیا قتلِ دو عالم تو نے جنبش سے اک ابرو کی — اگر یہ جھوٹ ہو تو تیغ پر ہم ہاتھ دھرتے ہیں
یعنی قسم کھاتے ہیں

برنگِ طائرِ تصویر ہیں ہم باغِ حیرت میں
کب اپنے آشیاں سے صحن گلشن میں اُترتے ہیں

نالہ و آہ فغاں بھی مرا دم بھرتے ہیں
آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں

اے ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں
تو کریں غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں

کچھ تو نکلے آرزو دشنام دے تلوار کھینچ
چشم حسرت سے کہاں تک دم بہ دم دیکھا کریں

کہتے ہیں آپس میں ہمسایہ مری فریاد سے
مصلحت یہ ہے کہ اس کے پاس سے گھر چھوڑ دو

کیا کیا میں نے گناہ جو اپنے لوگوں سے یہ تم
کہتے ہو جا کر اُسے بستی کے باہر چھوڑ دو

آنے کی خبر ہے اس کے لیکن
آتا نہیں اعتبار دل کو

اُس کے آنے میں اب جو دیر ہے کچھ
یہ بھی قسمت کا ہیر پھیر ہے کچھ

جب نہ تب خوں مرا ہی پیتا ہے
غم بہت اس کا مجھ پہ شیر ہے کچھ

تھا یہ جرأت ہی اس کے کوچہ میں
وہ جو اک خاک کا سا ڈھیر ہے کچھ

جاتے ہیں اُس کے در سے پہ جانا محال ہے
جس جا قدم پڑے ہے اُٹھانا محال ہے

رونے میں اور آتشِ الفت بھڑک اُٹھی
اب اس لگی کا دل سے بجھانا محال ہے

کیا قہر ہے کہ بزم میں اُس شوخ کی مجھے
سب کہتے ہیں کہ تجھ کو بٹھانا محال ہے

جا بیٹھتے تھے در پہ جو اس کے وہ دن گئے
اودھر کو اب تو آنکھ اُٹھانا محال ہے

کس کی سنوں بات میں اے مہرباں
دھیان تو رہتا ہے تمھارا اب مجھے

غم بہت دنیا میں ہے پر عشق کا غم اور ہے
ہے اسی عالم میں لیکن اُس کا عالم اور ہے

گر کسی ڈھب سے کوئی مجھ کو ہنسا دیتا ہے
غمِ فرقت وہیں کچھ یاد دلا دیتا ہے

شب کو ٹک خواب جو آتا ہے تو ٹک اُس کا خیال
آنکھ لگنے نہیں پاتی کہ جگا دیتا ہے

لختِ دل کی مرے یہ اشکِ رواں میں ہے بہا
برگِ گل جوں کوئی دریا میں بہا دیتا ہے

گھر سے وہ جاوے جہاں میں بھی وہیں ہوں موجود
نہیں معلوم مجھے کون بتا دیتا ہے

سخت تجھ بن قلق اس دل کا ستاتا ہے مجھے — گہ بٹھاتا ہے یہ اور گاہ اٹھاتا ہے مجھے

دل بھڑکے ہے ٹک مصحفِ رو جان دکھا دے — سرگرم ہے آتش اسے قرآن[1] دکھا دے

رہنے کی جا جہان میں ہم خوب پا گئے — جوں دردِ اہلِ درد کے دل میں سما گئے

ہم گلشنِ جہان میں جوں آتشیں انار — اک دم کی زندگی کا تماشا دکھا گئے

جوششِ گل چاکِ قفس سے دمبدم دیکھا کئے — سب نے یاں لوٹیں بہاریں اور ہم دیکھا کئے

شب بزمِ یار میں ہم بیٹھے تو تھے پر اس کی — چتون سے تھا یہ ظاہر یہ شخص یہاں سے نکلے

عزیز وصل میں بھی ہم جو رو کر نہ سوتے تھے — سو اندیشہ تھا روزِ ہجر کا اس دن کو روتے تھے

کچھ ہم تو نہ سمجھے کہ شبِ وصل کدھر تھی — ٹک زلف سے جو رخ پہ نظر کی تو سحر تھی

ترے بن بسترِ اندوہ پر کچھ یاد میں کر کے — پڑا روتا ہوں پھروں یار منھ پر آستیں دھر کے

---

۸۴ - **جوان** دہلوی نامش کاظم علی۔ الحال کہ سنہ ۱۱۹۶ ہجری ست در لکھنؤ می گزراند۔ در سنہ مذکور اشعار ایشاں از لکھنؤ بہ بنارس طلبیدہ تحریر پذیرفت۔ از وست۔ ۸ شعر

۸۵ - **جوشش**۔ شیخ محمد روشن۔ کوئی اضافہ نہیں۔ ۶ سطر، ۲۴۰ شعر (ورق ۵۳)

جوشش تخلص، شیخ محمد روشن نام، وطن ان کا عظیم آباد ہے، خوش لیاقتی ان کی جو کچھ کہئے اس سے زیادہ ہے۔ طبیعت ان کی نظم ریختہ میں نہایت رسا ہے اور معنی بیگانہ سے بہ شدت آشنا ہے۔ چاشنی درد کی کلام سے ان کے ظاہر، اور علم عروض سے یہ

---

[1] جب گھر میں آگ لگتی ہے تو قرآن دکھاتے ہیں کہ اس کی برکت سے بجھ جائے ۱۲

بخوبی ماہر ہیں۔ شیوہ اختیار اُنھوں نے میر درد کا کیا ہے اور اس طور کو بہت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ "جس ایام میں یہ تذکرہ لکھتا ہوں تو شیخ مذکور نے اشعار اپنے مجھ کو بنارس بھجوائے، تاکہ نام اُس کا اس تذکرہ میں لکھا جائے۔ نہایت پسند آیا مجھ کو اسلوب ان کے بیان کا، چنانچہ اس طرح لکھا گیا انتخاب ان کے دیوان کا" ۔

کس طرح سے اوصاف ہو خلاق جہاں کا
قدرت نہ قلم کی ہے نہ مقدور زباں کا

عاشق کو ہے کب جلوۂ معشوق کی طاقت
مہتاب کو دیکھے نہیں مقدور کتاں کا

اس گلشن ہستی سے نکل راہِ عدم لے
نیرنگ نظر آوے ہی کچھ رنگ یہاں کا

عنقا کی طرح گو کہ نشاں وہ نہیں رکھتا
ملتا ہے پتا نام ہی سے اس کے نشاں کا

اس دل کو دکھاتا ہوں میں بازارِ محبت
خطرہ نہیں جوشش مجھے کچھ سود زیاں کا

ہم چشم کیوں کہوں میں اسے شعلہ زار کا
عالم ہے کچھ جدا ہی دلِ داغ دار کا

سرکار بے خودی کا یہ مختار کار ہے
کیا اختیار ہے دلِ بے اختیار کا

پیتا ہے گر تو بادۂ عشرت سمجھ وہے
جوشش بڑا ہے درد سر اس کے خمار کا

بزم میں یک شب بھی نرمایا نہ دل گلگیر کا
فائدہ اے شمع اشک و آہ بے تاثیر کا

دمبدم آلودہ رہنا خون سے عشاق کے
جوہرِ ذاتی ہے یہ جوہر تری شمشیر کا

دیکھ کر رنگ صنم تیری جفا کاری کا
کوہکن ہو تو نہ دم مارے وفاداری کا

چشم پُر آب ہے لب خشک دماغ آشفتہ
زور عالم ہے غرض دل کی گرفتاری کا

مسکراتا ہے مجھے دیکھ رقیبوں کے حضور
یاد ہے اس کو عجب طور دل آزاری کا

جی سیر میں گلزار کی، تن کنج قفس میں
یہ صیدِ گرفتار اِدھر کا نہ اُدھر کا

گر کوئی کاٹ بھی دے سر ترے دیوانے کا
پر یہ سودا تو کبھو سر سے نہیں جانے کا

کیوں نہ مضطر ہوں اُسے دیکھ کے دیکھو تو یہی ۔۔۔ شمع کے سامنے کیا حال ہے پروانے کا

ہاتھ اُٹھاتا ہی نہیں یار جو سلجھانے سے ۔۔۔ دل تری زلف میں اُلجھا ہے مگر شانے کا

سر اُس کی تیغ سے جبتک جدا نہ ہووے گا ۔۔۔ کسی طرح سے حق اس کا ادا نہ ہووے گا

کل اُن نے بیٹھ کے غیروں میں کی نگہ مجھپر ۔۔۔ یہ تیر کس کے جگر میں لگا نہ ہووے گا

دل و جگر پہ ہی آفت نہیں فقط جوشش
جو ہے یہی ترا رونا تو کیا نہ ہووے گا

غیروں پہ تو ستم کرے گا ۔۔۔ ہم پہ جو کبھی کرم کرے گا

ہم سا ہی وہ ہوگا سادگی میں ۔۔۔ باور جو تری قسم کرے گا

جوشش مت رو دل و جگر کو ۔۔۔ کس کا کس کا تو غم کرے گا

دیکھ کر حسن گلعذاروں کا ۔۔۔ خانہ ویراں ہوا ہزاروں کا

دیکھیں گر اس کی چشم پُرفن کو ۔۔۔ ہوش اُڑ جائے ہوشیاروں کا

اُس کی آنکھوں کو دیکھیں اے جوشش ۔۔۔ مُنھ تو دیکھو شراب خواروں کا

ہو چشم حباب وار دیکھا ۔۔۔ ہستی کو نہ پائدار دیکھا

جوں شیشۂ ساعت اس جہاں میں ۔۔۔ دو دل کو نہ بے غبار دیکھا

ہم مر ہی گئے پہ تو نہ آیا ۔۔۔ بس ہم نے ترا قرار دیکھا

اس ادا کا تری ہوں دیوانا ۔۔۔ دیکھنا مجھ کو اور چھپ جانا

آج ہے جاں بلب ترا جوشش ۔۔۔ جی میں آوے ترے تو آجانا

یاں مدعی اپنا کسے اے یار نہ دیکھا ۔۔۔ ہے کوئی جسے تیرا طلبگار نہ دیکھا

سوتوں کو جگا یا مرے نالے نے عدم کے ۔۔۔ پر طالع خوابیدہ کو بیدار نہ دیکھا

کل بزم میں سب پر نگہِ لطف و کرم تھی ۔۔۔ اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا

جز چشم بتاں میکدۂ دہر میں جوشش ۔۔۔ ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا

کہتا ہے ایک عالم انصاف کر ہمارا
سنتا نہیں کسی کی بیداد گر ہمارا

اوروں کی عیب جوئی اپنا ہنر نہیں ہے
اپنی ہی عیب جوئی ہے یہ ہنر ہمارا

سرگشتہ اس جہاں میں جوں گرد باد ہیں ہم
تھک کر جہاں کہ رہ گئے وہ ہی گھر ہمارا

اپنا تو کچھ گناہ نہ آیا ظہور میں
کیا بات ہو گئی کہ وہ بیزار ہو گیا

جہاں میں بادۂ عشرت پیا پیا نہ پیا
سلوک بخت نے ہم سے کیا کیا نہ کیا

نگاہِ لطف سے دیکھا یہی غنیمت ہے
سلام اُن نے ہمارا لیا لیا نہ لیا

جب عشق میرا شہرۂ آفاق ہو گیا
اک عالم اُس کے حسن کا مشتاق ہو گیا

کس سے ہوئی ہے دوستی ایسی کہ ان دنوں
آنا ہمارا دل پہ ترے شاق ہو گیا

ہوا ریگِ رواں کی طرح جس جا گزر اپنا
بجز آواز کے کوئی نہ تھا واں ہم سفر اپنا

لگا دی دل میں آگ اے آہِ سوزاں کیا کیا تو نے
جلا دیتا ہے اپنے ہاتھ سے بھی کوئی گھر اپنا

شب فرقت ہے بیتابی دل ہی درد پہلو میں
نظر آتا نہیں ہم کو تو بچنا تا سحر اپنا

تعلقات جہاں سے خبر نہیں رکھتا
ہزار شکر کہ میں دردِ سر نہیں رکھتا

خفا ہوں جان سے دل کھول کر میں روتا ہوں
تری گلی میں کسی کا میں ڈر نہیں رکھتا

تجھ سے ظالم کو اپنا یار کیا
ہم نے کیا جبر اختیار کیا

اُٹھ اے طبیب جا مجھے آرام ہو چکا
مرتا ہوں کوئی دم کو مرا کام ہو چکا

اب بھی کہیں اُٹھاوے گا چہرے سے زلف کو
معمور تو شکار سے یہ دام ہو چکا

لینا تھا اُس کو دل سو لیا اُن نے نامہ بر
اب میرے اُس کے نامہ و پیغام ہو چکا

تنہا یہ عشق میں نہ دلِ ناتواں جلا
مانند نخلِ شمع ہر اک استخواں جلا

نہ دل رہا نہ چشم رہی نہ جگر رہا
اے اشک تیرے ہاتھ سے کیا کیا مکاں جلا

وہ کیا ہوا زمانہ رونے میں جو اثر تھا
یہ چشم خوں فشاں تھی یہ دل یہی جگر تھا

غش آگیا وہ سامنے میرے جہاں ہوا
مجھ کو وصالِ یار میسر کہاں ہوا

بے طاقت اس قدر یہ دلِ ناتواں ہوا
حرفِ تواں بھی اُس کی زباں پر گراں ہوا

سر پر کھڑا ہے کھینچے ہوئے تیغ کہکشاں
جلاّد میری جان کا یہ آسماں ہوا

ہزار پیار کرے گا ہزار چاہے گا
مری طرح نہ کوئی تجھ کو پایہ چاہے گا

کوئی اس غم کدہ میں اپنی غمخواری نہیں کرتا
دیا ہے ایک کو دل وہ بھی دلداری نہیں کرتا

جو ترے سامنے آئے ہیں سو کم ٹھہرے ہیں
یہ ہمارا ہی کلیجا ہے کہ ہم ٹھہرے ہیں

ایک عالم کی جاں خراش ہے یہ
آہ ہے یا قلم تراش ہے یہ

روئیے تا ہو سبز کشتِ اُمید
اب تردد ہے یہ تلاش ہے یہ

دیدۂ تر کو دوست رکھ جوشش
بہت تحفہ گلاب پاش ہے یہ

اپنی وہ بے ثبات ہستی ہے
کہ سدا نیستی کو ہستی ہے

نام سُنتے ہو جس کا ویرانہ
وہی سودائیوں کی بستی ہے

جی میں جس وقت کہ مضمونِ کمر آتا ہے
بسکہ نازک ہے مجھے باندھتے ڈر آتا ہے

چشمِ تر آہ بہ لب خستہ جگر ہوں جوشش
بے طرح حال مرا مجھ کو نظر آتا ہے

شبنم کی طرح سامنے اُس آفتاب کے
ہونے کو تو ہوئے تھے ولیکن نہ ہو سکے

رباعی

کچھ کام نہیں ہمیں وفا سے
تو ہاتھ نہ کھینچیو جفا سے
کل سب سے گلے ملے تھے
تھے ہم بھی تو صورت آشنا سے

چشم سے غافل نہ ہوا چاہیئے
اس کے مقابل نہ ہوا چاہیئے

دل کا ضرر جان کا نقصان ہے
اب کہیں مائل نہ ہوا چاہیئے

فرہاد یہ بے فائدہ خارا شکنی ہے
گھر کیجئے کس دل میں یہی کوہ کنی ہے

نہ کوئی دوست ہے، نہ کوئی مرا دشمن ہے
ایک یہ دل ہی غرض دوست ہے یا دشمن ہے

قطعہ

ایک دن کا ماجرا ہے میں اُٹھا تھا سیر کو
دیکھتا کیا ہوں یہ جھگڑا بر سرِ بازار ہے
برہمن کہتا ہے بتخانے میں ہے ذاتِ خدا
شیخ کہتا ہے غلط کعبہ ہی میں وہ یار ہے
اس میں جوشش بول اُٹھا سنتے ہو شیخ و برہمن
جلنے دو اپنی طرف دیکھو یہ کیا تکرار ہے

ممکن نہیں کہ دیکھئے روئے شگفتگی
جب تک برنگِ غنچہ گریباں نہ پھاڑیئے

جاہ و حشم کی خواہش دولت کی آرزو ہے
دو دن کی زندگانی تس پر یہ جستجو ہے
صورت پرست ہوں میں مانند آئینہ کے
جو کچھ ہے میرے دل میں سو میرے روبرو ہے

کہتا ہوں دردِ دل تو وہ کہتا ہے کیا سب مجھے
چپ رہئے بس زیادہ نہ باتیں بنایئے

لاکھوں ہی کئے قتل گنہگار مجھی سے
رہتی ہے مگر اک تری تلوار مجھی سے

کوئی سوائے شانہ وہاں چھوٹتا نہیں
دیکھو تو کوئے زلف میں کیا بندوبست ہے

کشورِ عشق میں رسوا سرِ بازار ہوئے
اُس کے ہاتھ آپ بکے جس کے خریدار ہوئے

میں آ نہ سکوں اور صبا جا کے رہی ہے
کوچہ میں ترے یار عجب بادہی ہے
جی چاہے تو ملئے جو نہ چاہے نہ ملئے
دل میں تو ہمارے نہ یہی ہے نہ وہی ہے
جوشش تو یہاں تک ہوا رسوائے خلائق
جو دیکھے ہے کہتا ہے یہ دیوانہ وہی ہے

دل میں بھری ہے آگ اور آنکھوں میں آب ہے
مانندِ شمع حال ہمارا خراب ہے
دیکھا ہے جب سے زلف کو شانے کے ہاتھ میں
جوشش ہمارے دل کو عجب پیچ و تاب ہے

اے عشق مجھے خوار کیا کیا تو نے
رسوا سرِ بازار کیا کیا تو نے

جس طرح دل کا داغ جلتا ہے
اُس طرح کب چراغ جلتا ہے

اُس رخِ صاف کے آگے جو کبھی آتا ہے
آئینہ اپنا ہی منھ دیکھنے لگ جاتا ہے
ہوئے صحرا نشیں تشریف لا دے جس کا جی چاہے
در و درباں نہیں یہ کہتے ہیں آوے جس کا جی چاہے

گرہ میں غنچوں نے نافے کے نافے باندھ لئے — چمن میں کھل جوگئی زلفِ مشک بو تیری

مرنا تو بہتر ہے جو مر جائیے — جی سے کسی کے نہ اُتر جائیے

سوئے حرم یا طرفِ بت کدہ — الغرض اے شیخ جدھر جائیے

نت نئے عذر ہیں نہ آنے کے — ہم دیوانے ہیں اس بہانے کے

قطرے میرے آنسو کے ہیں اک لخت شرر سے — کیا آگ برستی ہے مرے دیدۂ تر سے

آشنا جب سے ہوئے اُس بُتِ ہرجائی سے — در بدر خاک بسر پھرتے ہیں سودائی سے

رباعی

گر جان دے کوئی پر نہ اس کے ہونگے — جی شوق سے لیں گے اس کا جس کے ہونگے

جوشش نہ رکھ ان بتوں سے ہرگز اُمید — یہ کس کے ہوئے ہیں اور کس کے ہونگے

۸۶ - **جوہر** - اسمش مرزا احمد علی۔ مولدش دہلی ست و اصل آبایش از ایران بود۔ در دہلی بپاس خاطر دوستی بمعرکۂ خانہ جنگی کشتہ شد۔ اکثر شعر فارسی وگاہے ریختہ می گفت۔ از وست۔

آتش دہ چمن ہو یا برقِ آشیاں ہو

اے مرغ نالہ کچھ ہو یک شب تو پرفشاں ہو

شاید کہ پہنچے تجھ تک واماندہ کوئی ہمسا

آوارۂ بیاباں اے گردِ کارواں ہو

۸۷ - **جودت** - مرشد آبادی۔ نامش ہردیرام۔ اصلش از کٹک و سلسلہ اش از منسلکان نواب علاؤ الدولہ سرفراز خاں مرحوم است

باراقم آشنا بود۔ در بلدهٔ مذکور بعہد شاہ عالم بادشاہ انتقال نمود
سوائے ایں رباعی بیتے ازوے نرسیدہ ازوست ۔

واعظ تیری بات دل سے کہنے کا نہیں
پتھر کی چوٹ شیشہ سہنے کا نہیں
جا زاہدِ خشک تو ہی جب تک مرے پاس
لو ہو میری چشم تر سے بہنے کا نہیں

۸۸ - **جرأت** - نامش میر شیر علی - گویند معاصر مرزا محمد رفیع سودا بود
از دہلی بہ لکھنؤ رفتہ دیگر احوالش معلوم نیست ۔ ازوست

نہ اپنے چھوٹنے کی کس طرح تدبیریں رہیئے
بہار آئی ہے کیونکر خانۂ زنجیر میں رہیئے
کیا اُس کے بیاباں کو اس ابر کی پروا ہے
گر یہ ستی مجنوں کے تر دامنِ صحرا ہے

۸۹ - **جولاں** - اسمش میر رمضان علی - در عہد محمد شاہ فردوس آرام گاہ بود
ازوست ۔

رہتے ہیں رات دن خفا تجھ بن　　جیوینگے ہم سے شخص کیا تجھ بن

۹۰ **میاں جگنو** - خالہ زاد شیر افگن خاں باسطی تخلص در عہد محمد شاہ
فردوس آرام گاہ بود ۔

ایسے مریضِ عشق کو آزار ہی بھلا

چنگا ہو تو ستم ہو یہ بیمار ہی بھلا

۹۱ - جان عالم خاں - برادر زادہ نواب روشن الدولہ - از تلامذہ میر سید محمد سوز تخلص ست - ازوست

چھوڑ عارض دل نے گھیرا زلفِ مشکیں فام کو

صبح کا بھولا غنیمت ہے جو پہنچے شام کو

لگا خوبانِ نوخط سے یہ ملنے گھسیٹا پھر مجھے کانٹوں میں دل نے

۹۲ - جنوں - گویند از مردم دہلی و دوستان خواجہ میر درد بودہ - بہر تقدیر سلامت گفتار از اشعارش پیداست

کبھی گرتا تھا قدم پر کبھی ہوتا تھا نثار

کیا بھلی موت ہوئی رات کو پروانے کی

میں نہ کہتا تھا پیارے مجھے کم دے تو شراب

آج سے مجکو قسم ساتھ تیرے آنے کی

میں بھی بیہوش ہوں اور تو بھی نپٹ بیخود ہے

طرح اب کس سے میاں پوچھئے گھر جانے کی

۹۳ - جنوں - الہ آبادی - اسمش شیخ غلام مرتضیٰ ابن شاہ تیمور سہسرامی از تلامذہ مولوی محمد برکت مرحوم ست - مدتیست کہ حشمش

از بینائی عاطل گشتہ۔ درالہ آباد بانزوامی گزراند بااین خاکسار آشنا۔ وذہنش درفہم معانی رسا ست۔ از وست

وجوداس جہاں کا عدم دیکھتے ہیں | عجب خواب ہے یہ جو ہم دیکھتے ہیں
مٹے ہے تبھی پیچ وتاب اپنے دل کا | جب اُس زلف کا پیچ وخم دیکھتے ہیں
آفتِ جاں ہوگئی آخر یہ بینائی مجھے | جو بلا گھیرے سو ان آنکھوں نے دکھلائی مجھے
دل مرا ہر شب اُلجھتا ہی صنم کی زلف سے | ایک دم کب چین دیتا ہی یہ سودائی مجھے

حرف الحا

۹۴ - حاتم - دہلوی - ایک لفظ بھی اضافہ نہیں کیا - ۳ سطر ۴۷ شعر -

(ورق ۵۶، ب)

حاتم تخلص شاہ جہان آبادی مشہور ریختہ گویوں میں سے دہلی کے تھا۔ ہم عصر شاہ نجم الدین آبرو اور میرزا رفیع سودا کا۔ شاعر خوش بیان تھا۔ صاحب دو دیوان تھا، ایک دیوان میں نہایت شرح ابہام کیا ہے اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع ہے طور متاخرین اور طرز ابہام کا ۵

گلشن اُس گل بن مری نظروں میں ویراں ہوگیا | جھاڑ جھاڑ اور بوٹا بوٹا دشمنِ جاں ہوگیا
ایک نے پائی نہ اب تک نبض کی رفتار حیف | دردمیرا تختۂ مشقِ طبیباں ہو گیا
اشک خوں آلودہ میرے اس قدر جاری ہیں آج | جا بجا لعلوں سے ہندوستاں بدخشاں ہوگیا
شور دریا تک ملاحت کا تری پہنچا ہی شور | بے نمک آگے ترے لب کے نمکداں ہوگیا
فیض صحبت کا تری حاتم عیاں ہے ہند میں | طفلِ مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہوگیا

سجن نے یاد کرنا مہ لکھا اور ہم رہے غافل — بجا ہے معذرت لکھنا ہمیں کاغذ خطائی پر

ہجر میں زندگی سے مرگ بھلی — کہ کہیں سب جہاں وصال ہوا

مثالِ بحر موجیں مارتا ہے — لیا ہے میں نے اس جگ سے کنارا

باوے پن سے مجھے سودا ہے ترے گیسو کا — بال باندھا میاں بندا ہوں ترے گیسو کا

مجھے درکار نہیں مشک و عبیر و صندل — ہوں دیوانہ میں پری رو کے چونکے لوکا

زور چیترا ہے مرے دل کا کبوتر حاتم — بسرت کرتا ہے جب اُڑتا ہے اُسی کے کوکا

ہر اک سخن ہوا ہے ہمارا مثالِ قند — شیریں لبوں کے جب سے کہ بوسے لئے ہیں ہم

ترے رخسار و قد نے دھوم ڈالا ہے گلستاں میں — اُدھر بلبل سسکتی ہے اِدھر قمری بلکتی ہے

دو چار اب تجھ سے کیوں کر ہوئے ہم چشمی کے دعوے سے — کہ نرگس کی چمن میں دیکھ کر گردن ڈھلکتی ہے

پری ہم جان کر اُس کو چھپائے شیشہ خالی میں — یہ تو بھی دخترِ رز پردۂ مینا سے تکتی ہے

جب سے تمھاری آنکھیں عالم کو بھائیاں ہیں — تب سے جہاں میں تم نے دھومیں مچائیاں ہیں

زلفوں کا بل بتانا آنکھیں چرا کے چلنا — کیا کج ادائیاں ہیں کیا کم نگاہیاں ہیں

حاتم کے بن اشارے سچ کہہ یہ چشم و ابرو — کس سے لڑائیاں ہیں کس پر چڑھائیاں ہیں

تمھارے غنچۂ لب کے شوق میں گلشن کی سب کلیاں — چمن میں سن خبر آنے کی استقبال کو چلیاں

لگن میں تجھ ستمگر کے عجب مجلس میں غم گزرا — شمع رو رو گئے ساری رات سر تا پا کھڑی جلیاں

۹۵۔ **حشمت** ۔ میر محتشم علی خاں دہلوی ولد میر باقی۔ برادر میر ولایت اللہ خاں بحلیۂ خوبی آراستہ۔ از مشاہیر شعرائے دہلی ست شعر فارسی را نیکو می گفت و ترکیب بند ریختہ از وے بسیار شہرت دارد باعتبار اظہار واسوختگی دل نشین مردم افتادہ است بنا بریں چند بیت و دو سہ بند آں دریں مقام ثبت افتاد۔

ارتحالش در زمان محمد شاہ فردوس آرام گاہ است۔

۹۶۔ **حشمت**۔ اسمش محمد علی۔ از دوستان میر عبدالحی تاباں بود خود را بزینت زناں می آراستہ۔ اما ہمت مردانہ داشت چنانچہ ہمراہ قطب الدین خاں در مراد آباد کہ محاربہ با پسران محمد علی خاں روہیلہ رو دادہ بود بدلیری کشتہ شد۔ گویند استاد تاباں بود و سلیقۂ نظم ریختہ داشت۔ از وست

خط نے ترا حسن سب اُڑایا — یہ سبز قدم کہاں سے آیا

جب آ خزاں چمن میں ہوئی آشنائے گل — تب عندلیب رو کے پکاری کہ ہائے گل

۹۷۔ **حزیں**۔ دہلوی، اسمش میر محمد باقر۔ کوئی اضافہ نہیں۔

۳ سطر ۱۹ شعر (ورق ۵۰)

حزیں تخلص، میر باقر نام، متوطن شاہ جہان آباد۔ شاگردوں میں میرزا جان جاناں مظہر کے تھے، دلّی سے جب جدائی اُنھوں نے لاچار کی، تو عظیم آباد میں بود و باش اختیار کی۔ رفیق تھے نواب با فرہنگ سید احمد خاں صولت جنگ کے، زندگی بسر کی ہے اُنھوں نے ساتھ رعایت نام و ننگ کے۔ بہت فہمیدہ اور آشنائے درست، دوستیوں میں نہایت چالاک و چست۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، خلاصہ اشعار ان کے دیوان کے لکھے گئے یہاں ہیں۔

غم نے آباد کیا خانۂ ویراں میرا — ابرِ مژگاں سے ہوا سبز بیاباں میرا

یہ کہہ کے باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ "یا قسمت!" / لکھا تھا یوں کہ فصلِ گل میں چھوڑیں آشیاں اپنا

گوارا ہو گیا دل پر ہمارے جورِ یار آخر / ہمیں رنج و الم سے ہو گئے صحبت برار آخر

غم نے لیا ہے گھیر مجھے یاں تلک کہ اب / دیتا ہے ساتھ دینے سے مجھ کو جواب دل

فصلِ گل آخر ہوئی، کیا دیکھ ہوں گے شاد ہم / کچھ کر اے صیاد، اب ہوں گے نہیں آزاد ہم
رحم آتا ہے مجھے اس مشتِ خاک اپنی پہ ہائے! / خو بہ رویوں کی ہوائیں ہو چکے برباد ہم

اُس بے وفا کے ہاتھ سے کچھ مجھ کو حس نہیں / پاؤں تلک بھی ہائے مجھے دسترس نہیں
ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ اب / چاہیں کہ جل مریں، تو کہیں خار و خس نہیں

کچھ کہا شاید اُن نے قاصد سے / دل پہ میرے وہ اضطراب نہیں

آوے نہ کیوں کہ رشک مجھے برگِ پان سے / لیتا ہے کیا مزہ وہ سخن کے لبان سے

نہ وصل میں اُسے راحت، نہ ہجر میں آرام / کسی طرح سے حزیں دل کے تئیں قرار نہیں

تو نہ ڈر، ٹک اُٹھا نقاب کے تئیں / میں سمجھالوں[1] گا اضطراب کے تئیں

کیوں کہ خاطر خواہ دل کے درد کی تقریر ہو / کب یہ معنی لفظ میں آتے ہیں کیا تحریر ہو

کچھ گئی ہجر میں، کچھ وصل میں گریاں گزری / کیا مری عمر کی اوقات پریشاں گزری

خوباں کے درد و غم نے کیا ناتواں مجھے / یاں تک کہ مو بھی تن پہ ہوئے ہیں گراں مجھے
کیوں کر کروں جفا کی شکایت میں اُس ستی / کرتا ہے وہ وفا میں کبھو امتحاں مجھے

وفا میری اگر جور و جفا تجھ کو نہ سکھلاتی / تو کیا آرام سے یہ زندگانی ہائے کٹ جاتی

حزیں میں دردِ دل کا کس طرح ظاہر کروں اُس سے / مجھے کہتا ہے "تیری بات مجھ کو خوش نہیں آتی"
مجھے کہتا ہے "تیرا دل کہاں ہے" / قیامت شوخ! میرا بدگماں ہے

[1] یہ لفظ تقطیع میں نہیں آسکتا۔ غالباً "سنبھالوں" ہوگا۔

۹۸- حیدر - اسمش غلام حیدر۔ احوالش معلوم نیست این بیت بنام او دیدہ شد۔

تمہاری یاد میں اے گلبدن آنکھوں کے لوہو سے
مژہ کے ہاتھ میں یاقوت کے دانوں کی مالا ہے

۹۹- حیدر - دکھنی- اسمش میر حیدر علی شاہ۔ در شمشیر زنی ہنرور و بانکہ و زبان آور بود۔ اما دلاور نہ بود۔ در حکومت نواب شجاع الدین محمد خاں شجاع الدولہ مرحوم از دہلی وارد بنگالہ شدہ با نواب علاء الدولہ سرفراز خاں خلف نواب مذکور بسر می برد و اشعار بطور قدما می گفت و بطرز خاص کہ موجب تماشائے مردم بود اشعار می خواند تمام دیوان ولی دکنی را مخمس کردہ و غزلیات دیوان حافظ را تضمین نمودہ اما جہولانہ رائیگو می گفت۔ عمرش قریب بصد سال رسیدہ- در عہد احمد شاہ ابن محمد شاہ فردوس آرام گاہ در صوبہ بنگلہ ارتحال نمود- از وست

چلے ہیں بن گئی محبوب بن بنا کر آج
خدا پناہ دے جس طرف کو یہ ڈھارا جائے

۱۰۰- حبیب اللہ- احوالش معلوم نیست- این بیت بنام او

بگوش خوردہ:

سوزباں سے مو بمو کہتا ہوں میں شانے کی طرح
ہاتھ میں تجھ زلف کے ہیں دل کے اُلجھانے کی طرح

۱۰۱- حیرت - مراد آبادی - اسمش مراد علی - از موزونان عہد شاہ عالم بادشاہ است ازوست

کیا قافلے یاروں کے آگے کہیں ٹھیرے ہیں
فریادِ جرس کم ہے یا کچھ ہمیں بہرے ہیں

۱۰۲- حسرت - دہلوی - مرزا جعفر علی - کچھ اضافہ ہے - خلیل نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے ۱۱۹۶ھ میں ان اشعار کو لکھنؤ سے بنارس طلب کیا۔ ۳ سطر ۲۲ شعر (ورق ۵۹)

حسرت تخلص، میرزا جعفر علی نام، متوطن شاہ جہاں آباد کے، بیٹا میرزا ابوالخیر کا تھا صاحب قصائد و دیوان ہے اور سر حلقۂ موزونان خوش بیان ہے۔ اکثر نو مشق لکھنؤ کے مع جرأت دم شاگردی کا مارتے ہیں، اور یا اُستاد کہہ کے پکارتے ہیں۔ نخاس کے اندر دکان عطاری کی یہ عزیز رکھتا تھا اور اوقات اسی وجہ حلال سے بسر کرتا تھا۔ ۱۲۱۰ھ بارہ سو دس ہجری میں تختہ بند کر کے دکان وجود کو سیر بازارِ عدم کی ہے۔ خدا بخشے اس عاقبت محمود کو۔

اتنا سودا یہ دلِ زار ہوا، کچھ نہ ہوا
کچھ بھی یہ عشق سے بیزار ہوا، کچھ نہ ہوا
کاش کے عشق جتاتا نہ میں اُس کو حسرت
میری صورت سے وہ بیزار ہوا کچھ نہ ہوا
بجا تجھ کو مریضِ عشق سے ملتے حذر آیا
کہ آئینے میں شکل اپنی جو دیکھی مجھکو ڈر آیا

رقیبوں کے حوالے کرکے خط کو نامہ بر آیا / عزیزو کیا کہوں قاصد تو میرا کام کر آیا
نہیں غنچوں پہ شبنم اس دہن کے وصف نے اُن کو / یہ لذت دی کہ پانی منھ میں ہر غنچے کے بھر آیا

اسی جہان میں رکھتے ہیں ہم جہان جدا / حباب وار ہے اپنا بھی آسمان جدا

تری فرقت میں ہے شام و سحر مجھکو عجب مشکل / جو شب کاٹی تو دن مشکل، جو دن کاٹا تو شب مشکل
کرم سے کھول جو عقدے پڑے ہیں کام میں میرے / ترے آگے ہیں سب آساں مرے آگے ہیں سب مشکل

ہوئے ہم بت کے بندے برہمن سے راہ کرتے ہیں / حرم کے رہنے والو! تم سے عشق اللہ کرتے ہیں
جلے جوں شمع اپنے دیکھ ہی خواموش[1] ہو جاؤ / یہ افسانہ سُنا کر قصّہ ہم کوتاہ کرتے ہیں

تصور نے ترے ظالم یہاں تک تفرقہ ڈالا / کہ ملنا ہوگیا دشوار اب مژگاں سے مژگاں کو

برنگِ آبلہ اے وائے یہ کیا زندگانی ہے / کہ جس کے پاؤں پڑتے ہیں اُسی کو سرگرانی ہے

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کروگے / لو دل تمھیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کروگے
تاراج کیا صبر و دل و جاں پھر اب آگے / کیا خاک بچی ہے جسے برباد کروگے

ترے بن کس طرح پیارے مری اوقات گزرے گی / ابھی سے دل کو بیتابی ہے کیونکر رات گزرے گی

کیا راہ میں غیروں سے ملاقات لگائی[2] / جو صبح سے یاں آنے تلک رات لگائی
اٹھتا جو زمانہ ہے تو اس صید نے دل کو / صیّاد کے ملنے کے لئے گھات لگائی

اس زلف میں جا وفات پائی / اس دل نے عجب ہی رات پائی

ہمارے کام پہ ہر چند آسمان پھرے / تجھے قسم ہے! جو تو اس طرف کو آن پھرے
چلا تھا لشکرِ غم چڑھ کے گھر پہ مجنوں کے / مجھے جو دیکھا تو وہیں ادھر نشان پھرے

رباعی

دل دردِ بتاں سے آہ کیونکر نہ کرے / پر آہ تو تب کرے جو اس سے نہ ڈرے
وہ شکل ہی جیسی دشمنوں میں گھائل / دم لیوے تو سر کٹے، نہ دم لے تو مرے

۱؎ اصل مسودہ میں اسی طرح املا لکھا ہے ۱۲ ۲؎ یہ مصرعہ جرأت کی طرف بھی منسوب ہے ۱۲

۱۰۳- حیران - دہلوی میر حیدر علی - خاصہ اضافہ کیا ہے -

۲ سطر ۱۰ شعر (۵۹ ب)

حیران تخلص، میر حیدر علی نام۔ ساکن شاہ جہان آباد کے۔ شاگرد رائے سرب سنگھ دیوانہ تخلص استاد کےلے۔ علم شعر سے تو بخوبی آگاہ نہیں ہیں، لیکن اشعار ان کے سب کے سب دلچسپ اور شیریں ہیں۔ بندش شعر کی ان کے استادانہ ہے۔ استاد جانتا ان کو ایک زمانہ ہے۔ نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خاں مرحوم کی امارت میں، اگرچہ نوکر وزیر الممالک نواب آصف الدولہ مغفور کے تھے، لیکن رائے میکو لعل سے کہ مالک و صلباقی کا تھا، توسل رکھتے تھے بعد رائے مذکور کے مرنے کے ایک آدھ برس تو تنخواہ کی طرف سے اذیت اٹھائی، پھر تو ایک مرتبہ نواب آصف الدولہ مرحوم سے کچھ ایسی موافقت آئی کہ پچاس کے سو روپے اضافہ کیا اور سو سوار کا رسالہ بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، مع رسالہ تنخواہ لکھنؤ میں لیتے ہیں اور داد عیش کی دیتے ہیں۔ یہ اشعار اس ستودہ اطوار کے ہیں:

گر یہی وضع ہے اور ہیں یہی ہیہات نصیب!	تو ہمیں ہو چکی بس اس سے ملاقات نصیب!
ہم لب گور ہوئے خوں یہ جگر اس غم سے	کر نی اس غنچہ دہن سے نہ ہوئی بات نصیب!
صبح ہر روز اسی غم میں ہمیں ہوتی ہی شام	آہ جا گیں گے مرے کون سی اب رات نصیب!
کچھ ہمیں شکوہ نہیں جور سے تیرے ہرگز	ہم ہمیشہ سے ہیں اے جان کچھ آ۔فات نصیب!

مسجدوں میں پھرے نت سبحہ پھراتے حیراں
شیخ جی پر نہ ہوئی تم کو کرامات نصیب!

ہوا نہ ہم کو کبھی سیر باغ و گشت نصیب	کریں گے زیست کا کیا یا دہم سے زشت نصیب
دل ستمزدہ کا آج پوچھتے ہو حال	غم فراق سے کب کا ہوا بہشت نصیب

لے اس فقرہ میں قافیہ کی پابندی سے سخت تعقید پیدا ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سرب سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے اور جو استاد فن ہیں۔ حیراں اُن کے شاگرد ہیں ۱۲

اپنے جانے کا وہاں دن کو ہے نہ رات کو ڈھب — دیکھئے کیسے بنے آن پڑی بات کڈھب
درد دل غیر کے ہونے سے نہ کہنے پایا — کل میسر ہوئی حیراں کو ملاقات کڈھب

دکھ اُس سے کون کہے، تابِ التماس کہاں — کسے ہے ہوش بجا، دل کدھر حواس کہاں!
ہوا ہے اب تو نئے دوستوں سے ربط وے — تمھیں اب آنے کی فرصت ہمارے پاس کہاں

کلیجا بھن گیا، کب تک کردگے ہائے بیداد ای — آٹھوں میں ہی جہاں سے یا کہ اُٹھ جائے یہ بیداد ای

کل کہا میں نے میرے گھر سے چلئے — اس میں کچھ کم نہ ہوگی محجوبی"
سن کے تیوری بدل لگا کہنے — "رسم و راہِ ادب تو سب ڈوبی
مجھکو کہتا ہے میرے گھر چلئے — دیکھیو اختلاط کی خوبی"

۱۰۴-حیدری - دہلوی اسمش شیخ غلام علی- پدر بزرگوارش در پیشہ عمالی مصروف و بصلاح و سداد موصوف بود- بہ سبب برہمی اطوار روزگار ترک وطن قدیم ساختہ اقامت در عظیم آباد انداختہ- نوشتق است- اما طرز گفتارش روانی دارد- از وست

یہ دل اسیرِ زلفِ گرہ گیر ہی رہا
مجنوں ہمارا بستۂ زنجیر ہی رہا

۱۰۵-میر حامد- در سلسلۂ مریدان حضرت میر نصیر کہ جانشین خواجہ باسط مغفور اند- انسلاک دارد- در لکھنؤ بخدمت میر موصوف بسر می برد- شخصے است آزادہ حال و نیکو خصال شوق بسیار بجمع اشعار دارد از وست:

دنیائے دنی کو جو کہ فانی سمجھے　　وہ قصۂ عمر کو کہانی سمجھے
دریائے حقیقت کو وہی جاوے پیر　　جو مثلِ حباب زندگانی سمجھے

۱۰۶- **حضور** - دہلوی - ہندو بیست شنیدہ شد در دہلی میگزراند

از وست:-

زبانِ شمع سے روشن ہوا یہ اہلِ مجلس پر
کہ یہاں جو دم گزرتا ہے ترقی میں تنزل ہے

۱۰۷- **حسرت** - عظیم آبادی - شاید ہی اضافہ کیا ہے-

۷ سطر ۴ ۵ شعر (ورق ۶۲)

حسرت تخلص، ہیبت قلی خاں لقب، ساکن عظیم آباد کے - شاگرد میرزا جان جاناں مظہر کے تھے - چند روز انھوں نے رفاقت نواب شوکت جنگ کی، کہ خلف نواب صولت جنگ ناظم پرگنہ کے تھے، کی ہے اور کچھ دنوں ان کو خدمت عرض و معروض کی نواب سراج الدولہ ناظم بنگالہ کے حضور میں، رہی ہے - سنہ ۱۱۹۵ گیارہ سو پچانوے ہجری کے اندر نواب مبارک الدولہ میر مبارک علی خاں بہادر صوبہ بنگ کی رفاقت میں نہایت غربت اور پریشانی کے ساتھ اوقات بسر کرتے تھے - سنہ ۱۲۱۰ بارہ سو دس ہجری میں اس سرائے فانی سے سفر کر گئے - بڑے ہی لطیفہ گو اور حاضر جواب تھے، بذلہ گوئی اور علم مجالس میں انتخاب تھے - قریب دو ہزار بیت کے دیوان اس عالی دودمان کا ہے - یہ انتخاب ان کے دیوان کا ہے -

رات کا بیج ہوا یہ خواب مرا　　مل گیا صبح آفتاب مرا
تیرے کوچہ سے باز نہیں[۱] آتا　　یہ دلِ خانماں خراب مرا

---

[۱] اس لفظ کو قدما کے لہجے کے موافق بہ وزن نہ پڑھنا چاہیئے - ورنہ مصرع ناموزوں ہوگا ۱۲

نہ جانوں کرے کیا حنا کا لگانا
لہو پانی کرتا ہے یہ پان کھانا

عجب طرح کا عشق حسرتؔ نے ٹھانا
کبھی اُس کے کوچہ نہ آنا نہ جانا

بسکہ دُکھ دیتا ہے میرے دل کو وہ بدخو مرا
کل نہیں پاتا ہے مارے درد کے پہلو مرا

دل ہوا غم میں آب کی سی طرح
پر جلے ہم شراب کی سی طرح

ہاتھ میں جام لے ملا مجھ سے
صبح کو آفتاب کی سی طرح

چھپاؤں اشکِ گلگوں کس طرح ہائے!
گریباں ہو رہا ہے جا بجا سرخ

اشک پر اشک چلا متصل آوے باہر
یہاں تلک روئیے آنکھوں سے دل آوے باہر

بعد مرنے کے ہماری خاک کو برباد کر
دے بگولے کو کہ لے مجنوں کا گھر آباد کر

ترے جمالِ جہاں گیر سے بنے کیونکر
میں ایک تیرا دیوانہ (بوزن دوانہ ۱۲) ترا ہزار میں دل

زلف و رخِ یار دیکھتا ہوں
گیا لیل و نہار دیکھتا ہوں

پھر یار سے ان دنوں میں بارے
صحبت کو برآر دیکھتا ہوں

آپ ہی اپنے یار تھے، جانا نہیں
غیر ہیں جو ہوئے تھے، پہچانا نہیں

ہم نہ ہوں، تو ہو، تو سب چرچا کریں
وہ شمع ہے محفل میں، پروانہ نہیں

کعبہ بھی ہم گئے، نہ گیا ان بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

مر گئے انتظار کے ہاتھوں
کیا کہیں! اپنے یار کے ہاتھوں

پھر مسیحا دمی کرے تو اُٹھیں
سو کہاں روزگار کے ہاتھوں

رباعی

فرہاد سے ہمسری کرے کون
سر کس کا پھرا ہے یوں مرے کون

چل کشمکشِ جہاں سے حسرتؔ
ہوتا رہے نت ورے پرے کون

سدا بارش ہی میں رہتی ہیں میری چشمِ تر ساون
تو ایک دو دن برس کر ہم سے آسکتا ہے بر سادن

اُڑا دے اے دِوانے! شورشِ سودا سے ڈر کو
بہار آئی، تو کیدھر دیکھتا ہے پھونک دے گھر کو

مجھے افراطِ رقت میں بجا نہیں بات کہ آئی
کہ گر سکتا نہیں ڈوبا ہوا، لقمہ پر پانی میں

سنا ہے آج میخانہ میں جامِ مے پہ مستوں نے
لٹایا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں

ہم دوانوں کے نہیں عشق میں گھر جلتے ہیں
اس محبت میں پرندوں کے بھی پر جلتے ہیں

دیکھ اس لب کو ترے، آگ میں لعل و یاقوت
تیرے ان دانتوں کی جھلکی سے گہر جلتے ہیں

ان پتنگوں کی میں جرأت پہ موا جاتا ہوں
بے کلیجے ہیں یہ کمبخت، قہر جلتے ہیں

تو جو دل گرمیاں کرتا ہے گا مجھ سے ہر دم
دیکھنے والوں کے حسرت سے جگر جلتے ہیں

نہ جی لگا ہو اُس سے جو دردمند نہ ہو
کسی کا دل کسی ظالم کے پائے بند نہ ہو

گو دلبروں کے ماہ سے رخ پر نقاب ہو
پوشیدہ ہو سکے ہے جو کوئی آفتاب ہو

لبِ بام آکے یہ تیرا کھڑے رہنا تو آفت ہے
سوا تیرے پہ گویا آفتاب آیا، قیامت ہے

داغِ دل پھر تازگی پہ ہوئے
اب شگوفہ بہار کرتا ہے

ترا غرور مرے عجز کے مقابل ہے
اُدھر بہار، اِدھر ایک شیشۂ دل ہے

پلا شراب، ہوائے شراب آتی ہے
گھٹا بھی اپنا جھمکڑا کھڑی دکھاتی ہے

لے اُڑا کام اپنا پروانہ
ہائے ہم بال و پر نہ رکھتے تھے

جیسے بھٹکے پھرا کیے حسرت
یار کے دل میں گھر نہ رکھتے تھے

قفس ہی میں ہمیں رہنے دے صیاد
کہاں اب اُڑ سکیں جب بال و پر گئے

تجھے کچھ بھی ہے حسرت فکر دل کی
کہاں کھویا اُسے تو ہائے گھر سے گئے

ناصح عبث ستاتے ہیں مبتلا کسو کے
کچھ دل بھی گیا پھرے ہے، پھرے سے کیا کسو کے

یہ گل ہزار اپنے جامے میں پھول بیٹھے
ویسے کھلے نہ دیکھے بندِ قبا کسو کے

جدائی کی ہوا دہکا گئی اب آگ سینے کی
لگے اُڑنے بھبوکے آہ کے، کیا طرح جینے کی

رباعیات

ناشاد کا میرے حال جیسے نہ گیا — جی ہٹکے میں دیا ملال جی سے نہ گیا
یہ لوحِ مزار پر ہماری لکھنا — "ہم گئے پہ ترا خیال جی سے نہ گیا"

زاہد جو نہیں ہے میرے دل سے آگاہ — کہتا ہے کہ "کافر ہے تو اے روئے سیاہ
ہوں جس کی پرستش میں کہوں کیا یارو — آتا ہے وہ بت، دیکھو اللہ! اللہ!

کب شہر کو چھوڑے، جو سیانا ہوگا — صحرا دیکھے گا، جو دِوانا ہوگا
ہم دونوں میں سیر کرکے دیکھا حسرتؔ — رہنا تو وہاں، جہاں کہ جانا ہوگا

میخانہ میں کیا پھرے ہے مٹکی مٹکی — زاہد واعظ سے دور، بھٹکی بھٹکی
قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے ہرگز — یہ دخترِ رز ہے، جس سے اٹکی اٹکی

۱۰۸ - **حضورؔ** - اسمش شیخ غلام یحییٰ - از اعزہ عظیم آباد یگانۂ عالم و درست باآنکہ خود را بہ شاگردی کسے نداده طبعش موزوں و سلیم افتاده است - در اوائل حال مختصرات متداولہ صرف و نحو را از عموی مولوی محمد باقر تحصیل کرده من بعد در پیشۂ روزگار در آمد - در ینولا بقلیل تجارت معیشت می کند از احباب مؤلفِ حقیرست - ہنگام تدوین ایں تذکره منتخب کلام خود را داده کہ دریں صحیفہ انضمام یابد - چوں نیست

آرامیده اطوار و این اشعار نخبہ افکار آں
دوستدار یست (۶۰ شعر)

۱۰۹ حسین - دہلوی اسمش میر محمد حسن از شاگردانِ مرزا محمد رفیع سودا بود
از وست:

قاتل اگر کہے کہ سسکتا ہی چھوڑ یو
خنجر تو ایک دم کے لئے منھ نہ موڑ یو

۱۱۰ حسن - اسمش میر محمد حسن - غالباً ہماں میر حسن دہلوی مذکور باشد
تفریق احوالش تا تحریر این اوراق براقم فقیر نہ رسید۔
این ابیات منسوب بہ میر حسن ست - (۱۱ شعر)

۱۱۱ - حسن - دہلوی - خواجہ حسن کوئی اضافہ نہیں - ۹ سطر ۴۰ شعر (رب ۶۶)

حسن تخلص، خواجہ حسن نام، متوطن شاہ جہاں آباد کے بیٹے خواجہ ابراہیم بن غیاث الدین بن محمد شریف بن ابراہیم کے ہیں - جو کہ مشہور خواجہ کمھار کر کے تھے چشتی اور ساکن پہاڑ گنج ہیں - بڑے ہی لطیفہ گو اور بذلہ سنج ہیں - علم موسیقی ہندی سے بخوبی ماہر اور استعداد اس علم کی ان تصانیف سے ظاہر - علم نجوم میں بھی دخل بھلا چنگا رکھتے ہیں - اور فقر و درویشی میں تو آدھا لکھنؤ معتقد اپنا رکھتے ہیں - علوم متداولہ سے بھی خوب آگاہ ہیں خصوص علم تصوف کے بادشاہ ہیں - توسل امورات دنیا میں ان کو نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خاں سے ہے اور یوں ملاقات تو ایک جہاں سے ہے - بخشی نام ایک رنڈی ارباب نشاط سے ہے اس پہ مرتے ہیں اور اکثر نام اس کا مقطع میں غزل کے داخل کرتے ہیں - زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں - کچھ اشعار منتخب ان کے لکھے گئے یہاں ہیں:

حالِ دل اپنا ہیں ہر ایک سے کہوا دیکھا — وہاں کسی ڈھب سے یہ ہوتے نہ پزیرا دیکھا
"وقتِ نظارہ نہ رو" کہتے تھے اے چشم تجھے — شدتِ گریہ سے نے خاک نہ سوجھا دیکھا
گھورتے ہو جو مجھے کیا قہر کی نظروں سے تم — ایک عالم نے آپ کو گھورا دیکھا
دیکھنے سے مرے کاہے کو غضب ہوتے ہو — کیا غضب ہو گیا گر میں نے بھی دیکھا دیکھا

تب اس حیلہ گر کو نہ کچھ کام ہوگا — کہ جب میرا یہاں کام اتمام ہوگا
یہی شورشِ عشق ہے تو الٰہی ! — اس آغاز کا کیوں کر انجام ہوگا
رہی بے قراری اسیروں کی یونہیں — تو صیّاد ٹکڑے ترا دام ہوگا
موئے ہم تو، پر بے قراری وہی ہے — خدا جانے کب دل کو آرام ہوگا

اگر نوع سے جان بخشی حسن کو
تو اُس میں تمھارا بڑا نام ہوگا

جو بندہ خانے میں آئے گا، خیر تم کو دعا کریگا — کسی کے دل کو جو خوش کروگے خدا تمھارا بھلا کریگا

عالم اُس حور کی جو جلوہ گری کا دیکھا — پھر یہ جلوہ نہ کسی حور و پری کا دیکھا

پہنچے وہاں کچھ جب تئیں پیغام ہمارا — یہاں تب تئیں آخر ہی ہوا کام ہمارا

دل دلاسوں سے کرے ہے آہ و زاری بیشتر — خانۂ ماتم میں ہو پُرسے سے زاری بیشتر

بھلا میں دِوانہ سہی پر یہ ناصح — مرے ساتھ بکتا ہے عاقل کو دیکھو
یہاں تھک کے بیٹھو ہو کیا راہ میں تم — چلو راہ رو اپنی منزل کو دیکھو

ٹک جلا دے ہمیں گو یا ہوتا — اے لبِ یار مسیحا ہوتا
میں تو سب طرح سے تیرا ہوں میاں — پر جو تو بھی کہیں میرا ہوتا
مانوں تب وعدۂ فردا اے یار — جب ترے وعدے کو فردا ہوتا
اے مرے اشک سرِ مژگاں پر — قطرہ کیا ہوتا ہے دریا ہوتا
تو جو ڈھونڈھے ہے حسن خلوت کو — عین خلوت میں اکیلا ہوتا

سر گریباں میں جھکا دل میں بیٹھے
منہ ڈھانپے آنکھ کو تنہا ہوتا

چلنے سے کب اشک ہارتا ہے
دریا ہے کہ جوش مارتا ہے

آ کر بلا سے قتل ہی کر جائیے مجھے
صورت اسی بہانے سے دکھلائیے مجھے

غم نے ایذا جو اے صنم بخشی
یہ بھی سرکار کی کرم بخشی

حقیقت کہیں کیا ہم اُس انجمن کی
نہ تھی واں خبر اپنے ہی تن بدن کی

اگر جاں کنی میں وہ جاں بخش آوے
تو ہو نزع سے جان بخشی حسن کی

یہ تو نے مجھ سے نالۂ شبگیر کچھ نہ کی
یہاں دل جلایا اور وہاں تاثیر کچھ نہ کی

کیوں تم خفا ہو، کب میں کسی بات پر میاں
موجب تمہارے قول کے تقریر کچھ نہ کی

کچھ اور تو ہوا نہیں ہے ساری عمر میں
تقصیر یہ ہوئی کہ میں تقصیر کچھ نہ کی

مرتا ہے جاں کنی میں حسن حیف تم نے رات
اب اُس کی جان بخشی کی تدبیر کچھ نہ کی

ٹک اپنا یہ رونے پہ اگر دھیان لگا دے
ساون کی جھڑی دیدۂ گریان لگا دے

شمشیر نگہ تیز ہے آگے ہی جو چاہے
اور سنگ سے سرمہ کے زر اسان لگا دے

دن رات مری تجھ سے دعا ہی یہی یارب!
اُس بت کا مجھے آٹھ پہر دھیان لگا دے

کب میں کہتا ہوں کہ میری جان جانے سے رہے
پر ٹک ایسا ہو کہ یہ دل تلملانے سے رہے

ہم نے ایسی بھی تو کچھ چوری نہ کی تھی آپ کی
بے سبب اب آپ جو ادھر کے آنے سے رہے

آہ کس کس بے وفائی کا میاں کیجے شمار
اور تو سب یک طرف منھ بھی دکھانے سے رہے

اُس نے کس کس طرح ٹالا ہم کو اپنے در سے پر
دیکھ تو ہم بھی حسن کس کس بہانے سے رہے

۱۱۲- حسن دہلوی۔ میر غلام حسن۔ کوئی اضافہ نہیں خلیل نے انہی حالات کو
جو لطف نے اپنی طرف سے پیش کئے ہیں میر حسن ہی کے قلم سے
لکھا ہے کیوں کہ انھوں نے لکھنؤ سے خود حالات بھیجے تھے۔
میر حسن نے اپنے متعلق جو الفاظ لکھے تھے ان میں سے علی ابراہیم نے
حسب ذیل نقل کئے ہیں :

"از سائر اقسام اشعار ابیات مدوّنہ من قریب ہشت ہزار
بیت ہست و تذکرۂ در ریختہ نوشتہ و اصلاح سخن از میر ضیا
گرفتہ ام و مدتیست از دہلی وارد لکھنؤ گشتہ با نواب سالار جنگ و
خلف الیشاں ملقب بہ مرزا نوازش علی خاں بہادر سردار جنگ
می گزرانم ۔"

حسن تخلص، میر غلام حسن نام۔ شاہ جہان آبادی۔ بیٹا میر غلام حسین ضاحک تخلص کا
اولاد ہے میر امامی ہروی کی دلّی کے پرانے شہر میں بود و باش رکھتے تھے۔ صغر سن سے
وارد لکھنؤ میں ہوئے۔ نواب سالار جنگ اور خلف اُن کے میر نوازش علی خاں سردار جنگ
کی رفاقت میں اوقات انھوں نے ساتھ عزت اور غربت کے بسر کی ہے، اور اصلاح سخن کی
میر ضیاء الدین ضیا تخلص سے لی ہے۔ اقسام علم سے تو جمیع علوم میں انھیں اقرار
ہیچ مدانی ہے، ہاں مگر اشعار میں ان کے البتہ ایک صفائی اور روانی ہے۔ قریب
آٹھ ہزار بیت کے انواعِ نظم میں دیوان ان کا ہے اور ایک تذکرہ بھی ہندی گویوں کا
زبان ریختہ میں لکھا ہے۔ بے نظیر اور بدر منیر کے احوال میں کیا خوب مثنوی لکھی ہے۔
اور سنہ ۱۲۰۵ بارہ سو پانچ ہجری میں سیر روضۂ رضوان کی کی ہے یہ اشعار منتخب دیوان

ان نکو کردار کے ہیں ؎

گر کیجے رقم کچھ تری وحدت کے بیاں کا
تو چاہیے خامہ بھی اُسے ایک زباں کا
چھوٹا نہ وہاں تغافل اس اپنے مہرباں کا
اور کام کر چکا یہاں یہ اضطراب جاں کا

نہ رہتی تھیں آہیں، نہ تھمتے تھے آنسو
حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

ایسی ہی آہ! باتیں اُس بے وفا نے چھیڑیں
روتے ہی روتے جس بن یہ روزِ وصال گزرا

کچھ تو صدا ہے آہ! ترِ خاک بھی، کہ جو
اُدھر کو لگ رہا ہے حسنؔ گوشِ نقشِ پا

اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا
جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا

چھوڑ دے کوئی کسی کے لئے جس طرح سے کچھ
ہم نے منت میں تری کون و مکاں چھوڑ دیا

اپنی جاگہ نہ ملے اور کہیں مجھ کو کیا
تیری خاطر سے میں آتا ہوں نہیں مجھ کو کیا

وہ ملک دل کہ اپنا آباد تھا کبھو کا
سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہُو کا

دامنِ صحرا سے اُٹھنے کا حسنؔ کا جی نہیں
پانوں دیوانے نے پھیلایا بیاباں دیکھ کر

اب جو چھوٹے بھی ہم قفس سے، تو کیا
ہو چکی واں بہار ہی آخر

اُس شوخ نے پھینکا ہے مگر تیر ہوا پر
جاتا ہے جو دل کا مرے نخچیر ہوا پر

دیکھا جو وہاں نہ اُس کو، گماں سو طرف گیا
آئے نہ ہوتے کاش کہ ہم کوئے یار تک

آن کر غمکدۂ دہر میں جو بیٹھے ہم
شمع ساں اپنے تئیں آپ ہی رو بیٹھے ہم

اس کی جب بزم سے ہم ہو کے بہ تنگ آتے ہیں
اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں
حسن میں جب تئیں گرمی نہ ہو، جی دیوے کون
شمعِ تصویر کے کب گرد پتنگ آتے ہیں

اپنے دل سے تو کبھی ہم ترا شکوہ نہ کریں
ہو گر آزردہ تم ایسے ہی تو بولا نہ کریں

ترے بن باغ میں جس وقت غنچے دل کے کھلتے ہیں
خراشِ ناخنِ غم سے جگر کے زخم چھلتے ہیں
نہ لیٹ اس طرح منہ پہ زلف کو بکھرا کے اے ظالم
ذرا اُٹھ بیٹھ تو اس دم کہ دونو وقت ملتے ہیں

ہے سزا دل کی جو زلفوں کے گیا پھیرے میں
شب کو کیوں نکلا اکیلا جو پھنسا پھیرے میں

کہتا ہے تو کہ "تجھ سے میں ہی نباہتا ہوں"   تو بھی کہیں ہو سچا میں یوں ہی چاہتا ہوں

مجھ پہ ہی تیرا یہ ستم و جور کچھ نہیں   لیکن ترا ہر ایک سے یہ طور کچھ نہیں

روٹھا کرے وہ کیوں نہ کسی اور سے حسن   یہ سب بگاڑ چاہ کا ہے، اور کچھ نہیں

صیاد کی مرضی ہے یہ اب گل کی ہوس میں   نالے نہ کریں مرغِ گرفتارِ قفس میں

وہ اور زمانہ تھا کہ خوباں میں تھی اُلفت   ایسا نظر آتا نہیں اب ایک بھی دس میں

دم رُکتا ہوا آتا ہے لب تک ترے غم سے   عقدے پڑے ہیں بسکہ مرے تارِ نفس میں

دل اپنا اسی باتوں سے اُٹھ جاتا ہے تجھ سے   جا بیٹھے ہے تو ل کے جو ہر ناکس و کس میں

تیرے ہمنام کو جب کوئی پکارے ہے کہیں   جی دھڑک جاتا ہے میرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو   کیا غضب کرتے ہو، ادھر دیکھو

دیکھنا زلف و رُخ تمھیں ہر وقت   شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

کہنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گزرتی   پر ایک جان تو ہے جس بن نہیں گزرتی

جان و دل ہیں اُداس سے میرے   اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

ساتھ دیکھوں ہوں کسی کے جو کسی دلبر کو   میں بھی جی رکھتا ہوں مجھ کو بھی ہوس آتی ہے

کیا چھیڑ سے پوچھے ہے کہ "گھر تیرا نہیں ہے؟"   کہنے کو تو گھر یہاں ہے، یہ جی اپنا وہیں ہے

سیر ہے تجھ سے مری جان جدھر کو چلیے   تو ہی جب ساتھ نہ ہووے تو کدھر کو چلیے

جب میں چلتا ہوں ترے کوچہ سے گھبرا کے کبھی   دل مجھے پھیر کے کہتا ہے "ادھر کو چلیے"

نغمۂ عشق سے ہیں سبحۂ و زنّار ملے   ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

دن توقع ہی توقع میں کہاں تک گزرے   مر گئے ہجر میں، بس اب تو کہیں یار ملے

جی تو ایسا ہی خفا تھا کہ نہ ملیے گا کبھو   پر ترے غش کے لپٹ جانے میں ناچار ملے

گر بخت اپنے جاگیں تو اک کام کیجیے   سایہ میں اُس کی زلف کے آرام کیجیے

اب میں بھی بے قراری پہ اپنی لیا قرار   بس خیر! آپ شوق سے آرام کیجیے

بھولے سے نام لے کے مرا ہٹ بتا گیا
پیاری لگی یہ مجھ کو تری بات آج کی

کئی دن تیرے چپ رہنے میں اشک آنکھوں سے برسائے
نکل خورشید رو گھر سے کہ عالم خوب ترسائے

ترا ہر چند دل پتھر سے بھی کچھ سخت تر سا ہے
و لیکن سخت اگر کہیے، تو کب میرے جگر سا ہے

گریباں چاک اور خاموش مجھ کو دیکھ کہتا ہے
"کروں کیا بات اس سے، یہ تو کچھ دیوانہ سا ہے"

رہنے نہ دے گا اُس بن یہ دل تو ایک دم بھی
کیوں روٹھ کر ہم اپنا کھو دیں عبث بھرم بھی

دریا میں ڈوب جائے، کہ یا چاہ میں پڑے
اے عشق پر نہ کوئی تری راہ میں پڑے

آجا کہیں شتاب! کہ مانندِ نقشِ پا
تکتے ہیں راہ تیری سرِ راہ میں پڑے

یوں غیر کچھ نہیں، تو بلا کو بُری لگے
تو کچھ نہ کہہ، کہ ہم غربا کو بُری لگے

کیا ہنسے اب کوئی اور کیا رو سکے
دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

یہ ہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا
بس اے زندگی! ایسی ہستی سے گزرے

آنکھوں کو اُس کی دیکھا تو ہستی نظر پڑی
پھر ساتھ اُس کے بادہ پرستی نظر پڑی

سارا جہاں خراب تھا آنکھوں میں تجھ بغیر
بارے وہ آج آیا تو بستی نظر پڑی

جو چاہے آپ کو تو اُسے کیا نہ چاہیے
انصاف کر تو، چاہیے یہ یا نہ چاہیے

مجھ سے نے تجھ کو چاہا تو چاہا عجب نہیں
تجھ سا جو مجھ کو چاہے تو پھر کیا نہ چاہیے

مژگاں سے جھاڑتے ہیں جو اُس گلی کے تنکے
رہتے ہیں ہم دوانے روزِ ازل سے تنکے

"یعنی اُن کے"

رباعی

دنیا داری میں اور نہ دیں داری میں
چاہت میں کسی کی ہیں، نہ بیزاری میں
حیرت کدۂ دہر میں تصویر کی طرح
سویا کرتے ہیں عین بیداری میں

رباعی

ہر آن میں آپ کو دکھا جاتے تھے
ہر لحظہ نیا شوق دلا جاتے تھے
کیوں دیر لگی ہے، کس نے روکا تم کو؟
اب تک تو کئی بار تم آ جاتے تھے

مثنوی در ہجو لکھنؤ و تعریف فیض آباد

نہیں یہ لکھنؤ ہے یہ زمانا
زمانے پر عبث رکھنا بہانا

زمیں یہ ملک ہے تھر پہ بستا
کہیں اونچا، کہیں نیچا ہے رستا

کسی کا آسماں پر گھر ہوا ہیں
کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ ہیں

زمیں گنجان ہے یہ شہر باہم
سما سکتا نہیں ہے غیر کا دم

سیہ گل سے گلی یوں تر رہے ہی
بغل جس طرح زنگی کی بہے ہی

فراغت سے یہاں کس کا مکاں ہے
ہر اک گھر نحس کا سا دل یہاں ہے

کنواں بھی یوں ہی ہر اس تنگ گھر میں
پڑے تیلی کا تل جیسے نظر میں

کنواں کہنا اسے ہے عقل سے دور
کہ ہے اس گھر کی چھاتی کا وہ ناسور

کہوں کیا میں قدامت اس مکاں کی
پڑی بنیاد بعد اس کے جہاں کی

ہزاروں راہ اس میں پیچ در پیچ
و لیکن مثل زلفِ زشت رو ہیچ

جو اس کے زیر سایہ آن نکلے
رکے دم، اور اُس کی جان نکلے

جو کوئی رات کو ہووے یہاں گھر
پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در

نہیں امکاں جو گھر اپنا وہ پاوے
بلا خورشید کو جب تک نہ لاوے

زمیں کوفے سے یہ شہر ہم عدد ہے
اگر شیعہ کہے نیک اس کو بد ہے

چڑھے ہے گومتی جب گرد آ کر
حباب آسا بہے پھرتے ہیں سب گھر

رکھے ہے پار ہو سکنا تب امکاں
چڑھے جب آدمی پر آدمی یہاں

سوائے قندیاں دیکھا نہ کچھ اور
سو ہے روپوش وہ بھی دیکھ یہ طور

چلا میں یہاں سے دل اپنا اُٹھا کر
کہ کیجے سیر فیض آباد جا کر

عجب معمورہ آباد پایا
مثالِ گل ہر اک دل شاد پایا

کھلا بازار اور رستہ کشادہ ۔۔۔ بیاض جدولی جیسے ہو سادہ
دو رستہ راستے میں اتنا رستا ۔۔۔ کسی نے آج تک دیکھا ہے بستا
وہ جی ہے شہر کا ترپولیا یوں ۔۔۔ کہ جیسے تین روحیں جسم میں ہوں
ادھر کو جوہری، اودھر کو بزّاز ۔۔۔ ادھر صرّاف اور اودھر طلا ساز
روپے اور اشرفی دیکھے برستے ۔۔۔ دیئے تختوں پہ جوں نرگس کے دستے
یہ فرنی اور فالودے کا عالم ۔۔۔ کہے تو چاند اور تارے ہیں باہم
ملا شربت میں جو اس کو بتاوے ۔۔۔ شبِ مہ کا سما پانی میں پاوے
ملائی دودھ کی دیکھو تو گویا ۔۔۔ اسی میں مال حلوائی نے کھویا
بلندی پر ہے حلوائی کی دکّاں ۔۔۔ ستارے گرد ہیں جیسے چراغاں
دھری ہیں گولیاں اور یوں اندرسے ۔۔۔ کہ گویا چاند اور تارے ہیں برسے
مٹھائی کی کروں تعریف تا چند ۔۔۔ قلم کی ہو گئی اب تو زباں بند
ہزاروں خانگی اور کسبی آ کر ۔۔۔ کریں ہیں سیر لالہ دل لگا کر
چمک دامن کی دکھلا یوں چلے ہے ۔۔۔ کہ بجلی اپنے ہاتھوں کو ملے ہے
وہ سبزہ کان میں زیبِ بناگوش ۔۔۔ کہ جس کو دیکھ طوطی کے اڑیں ہوش
شعاع اس کی یہ اور منھ کا پسینا ۔۔۔ ہے گویا پھول پر شبنم کا مینا
کوئی کرتی پہن جالی کی سادہ ۔۔۔ گریباں کر کے چھاتی تک کشادہ
کیا اس دام میں تکمہ کو یوں صید ۔۔۔ سحر کے جوں گریباں میں ہو خورشید

مسافر اس طرف جو آن نکلے
نہ نکلے واں سے غیر از جان نکلے

۱۱۳- **حیف** - اسمش موتی لعل - ولد لالہ ہت سین قوم کایتھ - از شاگردان میر سوز ہست - الحال کہ سنہ ۱۱۹۶ھ باشد

در لکھنؤ می گزراند۔ اشعارش در رسال مذکور از انجا
طلبیدہ تحریر یافت (۸ شعر)

حرف الخا

۱۱۴۔ خاکسار۔ دہلوی۔ محمد یار۔ کچھ اضافہ ہی ۲ ½ سطر ۶ شعر (۷۱)

خاکسار تخلص۔ محمد یار نام، شاہ جہان آبادی قدم شریف کے خادموں میں سے تھا بڑا ہی مشتاق زبان ریختہ کا۔ ہمیشہ محمد تقی میر تخلص سے نوک جھونک کرتا رہا ہے اور ان کے اشعار میں مشاعروں کے اندر اکثر تصرف کیا گیا ہے۔ صاحب دیوان اور شاعر خوش بیان تھا۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "شعر اس عزیز کے میرے ہاتھ نہیں لگے ہیں، اس جہت سے اشعار اس کے داخل اس تذکرے کے کمتر ہوئے ہیں" یہ اشعار طبعزاد اس کہن استاد کے ہیں:

تھا زلیخا کو جو جاں سے مہِ کنعان عزیز
ہم نے بھی تجھ سے تو بے مہر نہ کی جانِ عزیز

کل مجھے قتل کر اس دشمنِ دیں کافر نے
بولا لوگوں سے یہ تھا مردِ مسلمان عزیز

کیوں نہ وہ مصحفِ رو جاں سے مجھے ہووے زیاد
کس مسلماں کو نہیں دین اور ایمان عزیز

خاکسار عرش[۱] سے بھی دیکھا پرے تیرا مزاج
آپ میں آ ذرا اپنے تئیں پہچان عزیز

دل شیفتہ کر کے گیا لیا تو
اے خانہ خراب کیا کیا تو

تیری زلف سیہ اے پیارے!
مجھکو یک سر ہزار سودا ہے

---

[۱] تقطیع میں عین گرتا ہے ۱۲

قیامت بھی ہو گی تو میری بلا سے ‏ مجھے داد خواہی کی طاقت کہاں ہے
رونے سے خاکسار کے سوتا نہیں کوئی ‏ اس خانماں خراب کو جیکا خدا کرے!
کیا ہے حاصل تجھے ناصح مرے سمجھانے سے ‏ آہ! جوں شمع ہی راحت ہے مجھے جل جانے سے

۱۱۵ خلیق دہلوی۔ اسمش مرزا ظہور علی خلف مرزا ہوشدار۔
در موسیقی ہندی و مرثیہ خواندن بغایت مہارت دارد
بعضے از کتب عربیہ را خوانده۔ جوان آرامیده وخوش
ذہن ست۔ گاہے ریختہ می گوید۔ وباوصف نومشقی
بعضے شعرش دل نشیں می افتد۔ از عہد محمد شاہ فردوس
آرامگاه حسب الطلب نواب نوازش محمد خان شہامت جنگ
وارد مرشدآباد شده۔ دراں بلده سکنے اختیار کرده
تا حال که ۱۱۹۶ ہجریہ باشد در سرکار نظامت بنگالہ
منسلک و باراقم آشناست۔ از دست۔

آئی بہار کیوں دل افسردہ ہے خلیق
مانند گل کے تو بھی گریباں کو چاک کر

صحبت زنده دلاں ہے باعثِ آرام جاں
ہمنشینی مرده دل کی ہے عذابِ زندگی

۱۱۶- خادم۔ عظیم آبادی۔ نامش خادم حسین خاں۔ خلف حاجی

احمد علی قیامت تخلص۔ از منصبداران وعم زادگان مولف اوراق ست۔ بہ نسبت اجداد پدری از شیوخ بنی ہاشم و بہ نسبت اجداد مادری از سادات حسینی ست آرمیدہ و سنجیدہ اطوار۔ گاہے بہ موزونی طبع ریختہ می گوید۔ از دست۔

رات دن فرقت میں اس کی اس قدر ناشاد تھا
آسماں نالے سے اُس کے آسیاے باد تھا
بے پری جب تھی مجھے تب فکرِ آزادی نہ تھی
خوب تھا آرام جب بے رحم وہ صیّاد تھا

حرف الدال

۱۱۷۔ درد۔ خواجہ میر درد دہلوی۔ بعینہ ترجمہ ہی صرف تاریخ وفات کا اضافہ کیا ہے۔ ۲۰ سطر

درد تخلص، خواجہ میر نام متوطن شاہ جہان آباد کے، خلف الصدق حضرت ناصر دہلوی کے ثابت قدمی میں اس قطبِ آسمانِ استقلال کی اور زاویہ گزینی میں اس مرکزِ دائرۂ فضل و کمال کی یہ نقل مشہور ہے اور زباں زدِ جمہور ہے کہ جس ایام میں معمورۂ شاہ جہاں آباد کا اور ہر ایک کوچہ اُس خجستہ بنیاد کا، مجمع اہل کمال سے اور کثرت منتخبانِ عدیم المثال سے رشک ہفت اقلیم اور غیرتِ جنّت النعیم تھا، تو معموری پر شہر کی عرصہ ربع مسکون کا تنگ اور وہ خراب آباد تشبیہ سے ہفت اقلیم کی ننگ تھا۔ جب کہ متواتر نزولِ آفات کے باعث

اور بکر رور و دبلیات کے سبب خراب ہوا، اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے اور ہر ایک صابرِ زاویہ گزین نے اور ہر تونگر مالدار نے، اور ہر امیر عالی مقدار نے، فرار کو غنیمت جانا اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا۔ مگر وہ سیّد والا تبار کہ نام نامی اُن کا خواجہ میر درد تھا، اُس قطبِ آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہوئے، اور شاہجہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم اپنے کنج عزلت سے نہ گئے۔ اگر شیخ فرید شکر گنج اُس کوہِ تحمل کو دیکھتا، تو چاشنی فقر اُس کی حیران ہو کر مانند نیشکر کے انگشت تحیر کو کاٹتا۔ اور اگر سید حسین خنگ سوار بیچ اس عرصہ کے ہوتا، تو زین پوش خدمت کا اُس کے کاندھے پر ڈال کے دوڑتا۔

غرض اس مجمع فضل و کمال کی التفات طبیعت طرف نظم کے نہ واسطے شہرت اور نام کے ہے بلکہ واسطے گرمانے افسردہ دلان خام کے ہے۔ اُس شہسوار معرکۂ سخنوری کے توسن تند خرام قلم نے بیچ قلمرو معنی آفرینی کے ایک گام بے راہی نہیں کی اور اُس یکّہ تاز عرصۂ مضمون نزاکت کے ست رنگ آسمان سیر خامہ سے بیچ میدان بلند مقامی کے ایک قدم کوتاہی نہیں کی۔ تعجب نہیں ہے اگر اُس عندلیب گلشن معنی کے کلام معجز نظام کی تحریر سے صفحہ کاغذ کا ہمرنگ برگِ گل ہو، اور نغمہ زبانِ قلم کا ہم آہنگ صفیرِ بلبل ہو۔ اگرچہ دیوان ان کا بہت مختصر ہے، لیکن سراپا درد و اثر ہے۔ زبان فارسی میں بھی اکثر غزلیں کہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ رباعیوں کی طرف مسائل تصوف میں بیشتر طبیعت آئی ہے اور شرح بھی اُس کے مشکل مقاموں کی آپ ہی فرمائی ہے۔ طریقۂ فقر میں بہت بڑے کاسب اور شاغل تھے، اور راہِ طریقت کے طالبوں کے واسطے رہنمائے کامل تھے۔ سنہ ۱۲۰۲ بارہ سو دو ہجری میں اُس بلبل گلشن آزادی نے دامِ ہستی سے نکل کر شاخسار کو چمنِ عدم کے آباد کیا۔ یہ

منتخب ان کے دیوان کا ہے ؎

مقدور کسے ہے ترے وصفوں کے رقم کا — حقّا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن — آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

مانند حباب آنکھ تو اے دردؔ کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

اہلِ زمانہ آگے بھی تھے اور زمانہ تھا — پر اب جو کچھ ہے، یہ تو کسی نے سنا نہ تھا
باور نہیں ابھی تجھے غافل پہ عنقریب — معلوم ہووے گا کہ یہ عالم فسانہ تھا

یک بہ یک نام لے اُٹھا میرا — جی میں کیا اُس کے آگیا ہوگا

گل و گلزار خوش نہیں آتا — باغ بے یار خوش نہیں آتا

جان پہ کھیلا ہوں میں، میرا جگر دیکھنا — جی نہ رہے یار ہے، مجھ کو اُدھر دیکھنا
ذکرِ وفا کیجئے اُس سے کہ واقف نہ ہو — کہتے ہو کس سے یہ تم "تنک تو ادھر دیکھنا"

باہر نہ آسکی تو قیدِ خودی سے اپنی — اے عقلِ بے حقیقت! دیکھا شعور تیرا
جھکتا نہیں ہمارا دل تو کسی طرف یہاں — جی میں سما رہا ہے از بس غرور تیرا

ہم نے چاہا بھی، پر اُس کوچہ سے آیا نہ گیا — وہاں سے جوں نقشِ قدم دل کو اُٹھایا نہ گیا

چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشمِ تر شبنم — "بہارِ باغ گو یوں ہی رہے، لیکن کدھر شبنم"

تیری خوں آشنائیاں مشہور ہیں اے تیغِ یار — ایک[1] قطرہ چھوڑے تو پیوے ہمارا ہی لہو

اس ہستیِ خراب سے کیا کام تھا ہمیں — اے نشۂ ظہور! یہ تیری ترنگ ہے

نہ ہاتھ اُٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے — کسے دماغ کہ ہو دو بدو کمینے سے
مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جاوے — کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

---

[1] اس مضمون کو شیخ ابراہیم ذوق نے اس طرح باندھا ہے: کہے ہے اس سے دمِ ذبح یہ لہو میرا ٭ کمی جو مجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا۔ لیکن دردؔ کی بندش کو نہیں پہنچتا ۱۲

جو ملتا ہے مل، پھر کہاں زندگانی | کہاں میں کہاں تو، کہاں نوجوانی
عجب خواب درپیش ہے پھر تو سب کو | سنا لوٹک اب اپنی اپنی کہانی

۱۱۸- **دانا** تخلص دہلوی مشہور بشاہ دانا۔ اسمش شیخ فضل علی از معتقدان شاہ برہان الدین واز شاگردان میاں مضمون دہلوی ست بیشتر در لباس دنیا بود وچندے در سرکار نواب سراج الدولہ ناظم بنگالہ انسلاک داشت الحال کہ سنہ یک ہزار ویک صد ونود وچہار ہجری باشد۔ در لباس فقر بوارستگی ومسکنت در بنگالہ بسر می برد۔ ہنگام تدوین ایں تذکرہ اشعار خود را بمولف حقیر داد کہ در تذکرہ ارتسام یابد۔ گفتارش باطوار مضمون مذکور بطرز ایہام ست۔ ایں ابیات ازوست۔ ۱۶شعر (۹۰-ا)

۱۱۹- **درد** تخلص۔ اسمش میر کرم اللہ خاں۔ از اقربائے نواب عمدۃ الملک امیر خاں مرحوم ست۔ گویند بسیار دلاور وگرم جوش وزبان آور بود۔ بعہد احمد شاہ ابن محمد شاہ فردوس آرام گاہ ہمراہ میر علی اصغر گبری در معرکہ مرہٹہ شہید گردید۔ ۵شعر (۹۰-آ)

۱۲۰- **دردمند**- فقیر صاحب لطف نے یہ چھوڑ دیا کہ "(عظیم آبادی) بہ خالوی ایں خاکسار موسوم بہ زاہد حسین خاں مرحوم

اختصاص داشت .. .... با راقم محبتے داشت ::

۱۲۵ شعر

درد مند تخلص، فقیر صاحب نام۔ دکن ان کے بزرگوں کا وطن ہے۔ بلکہ ان کا بھی مولد دکن ہے۔ لیکن تربیت انھوں نے شاہجہان آباد میں پائی ہے اور خدمت سے میرزا جان جاناں مظہر کی کیفیت آداب فقر کی اٹھائی ہے۔ مرید بھی مرزائے مذکور کے تھے چند مدت عظیم آباد میں بود و باش کی ہے اور رفاقت میں نواب غلام حسین خاں اور نواب اعظم خاں کے بیٹے کی گزرانِ معاش کی ہے۔ بعد اس کے پھر دلی گئے اور چند مدت وہاں رہے پھر نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ بھتیجے نواب علی وردی خاں مہابت جنگ کے بلائے ہوئے شاہجہان آباد سے مرشد آباد میں آئے اور طور بود و باش کے وہیں ٹھہرائے۔ رفاقت میں نواب مذکور کی البتہ ایک رفاہِ احوال ہوا۔ آخر ۱۱۷۶ھ گیارہ سو چھتر ہجری میں بلدۂ مرشد آباد کے اندر انتقال ہوا۔ سلیقۂ سخن رسی میں اُستاد تھے؛ اور طریقۂ مصاحبت و اختلاط کے ماہر حد سے زیادہ تھے۔ فارسی دیوان ان کا صاحب نظروں کا منظور ہے۔ اور ہندی میں تو یہی ساقی نامہ مشہور ہے ؎

پری اُس کی خوبی کی از بسکہ دھوم ::: لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم
ارے ساقی اے جانِ فصلِ بہار! ::: یہی تھا ہمارا و تیرا قرار
ہمارے بسرنے کی یہ فصل تھی؟ ::: فراموش کرنے کی یہ فصل تھی؟
تری جان کی سوں غنیمت ہوں میں ::: سلیقوں میں ظالم قیامت ہوں میں
مری عقل میں کون انباز ہے ::: ارسطو مرا اک دوا ساز ہے
فلک چرخ مارے گا گر صد ہزار ::: نہ لاوے گا مجھ سا کوئی روزگار
نظر تو کرو ٹک چمن کی طرف ::: شگوفہ کہ آیا ہے مستی سے کف
چمن سب بھرا ہے نشہ یاں تلک ::: کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک

تجھے جان گل کے لہو کی قسم / تجھے باغ کے رنگ و بو کی قسم
تجھے جام کے چشمِ تر کی قسم / تجھے اپنی پنہاں نظر کی قسم
ادا سے لہکنے کی تجھ کو قسم / نشہ سے بہکنے کی تجھ کو قسم
تجھے جامِ صہبا کے سر کی قسم / تجھے اپنے مینا کے سر کی قسم
تجھے نازِ ہستی کی اپنے قسم / تجھے خود پرستی کی اپنے قسم
قسم ہے تجھے بے سبب جنگ کی / قسم ہے مرے نام کے ننگ کی
ارے بے وفا بے مروّت صنم / میں دیتا ہوں تجھ کو قسم پر قسم
تجھے دخترِ رز کی حرمت کی سوں / تجھے غنچوں کی شرارت کی سوں
تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں / تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں
تجھے ناتوانوں کی طاقت کی سوں / تجھے بیقراروں کی فرصت کی سوں
شبِ عید کے تجھ کو چاؤں کی سوں / تجھے اپنی مہندی کے پاؤں کی سوں
جو تو نے کیا مے کو مجھ پر حرام / تو اتنا کر اے ظالموں کے امام
کہ تو سرکشی سے نہ کر پائمال / مرے خون کو اپنے اوپر حلال
تجھے رحم مجھ پہ کچھ آتا نہیں / گر جیونا میرا بھاتا نہیں
نہ توڑ آئینہ اپنے خریدار کا / زیاں خوب نیں اپنی سرکار کا
یقیں جانیو گر نہ ہو ایک آن / تری مہربانی کا مجھ کو گمان
تو صورت نہ بگڑے ہماری حیات / نکل جائے جی ناامیدی کے ساتھ

رباعی

ہے غم سے رقیبوں کے مرا دل ناشاد / اس دھڑکے سے جاتے ہیں سبھی عیش بباد
پرویز کے شیشہ خانۂ عشرت پر / سنگ آیا و لیک سخت آیا فرہاد

۱۲۱- دوست - تخلص - اسمش غلام محمد و موطنش صوبہ بہار ست
باراقم حقیر در مرشد آباد ملاقات کردہ عاشق مزاج
بہ نظر آمدہ - از اشعار خود قریب صد بیت وا نمود - ایں
چند بیت از انجاست - ۳ شعر (۹۵ - ل)

۱۲۲- دل تخلص شیخ محمد عابد - لطف نے یہ چھوڑ دیا ہے - "بہ سبب
محبتے کہ باراقم آثم دارند ہنگام تالیف ایں مجموعہ مشارٌ الیہا
خلاصہ دیوان خود را در مرشد آباد در سنہ ۱۱۹۳ ہجریہ فرستاند"
علی ابراہیم نے تقریباً ۷۰ شعر نقل کئے ہیں تعجب ہے
علی لطف کو ایک بھی نہیں ملا -

دل تخلص، شیخ محمد عابد نام، متوطن بلدۂ عظیم آباد کے بے مثل اور بے نظیر عالم محبت و
وداد کے - شیخ محمد روشن جوشش تخلص بڑے بھائی ہیں، جن کی خوبیاں باب الجیم کے اندر
بیان میں آئی ہیں - غرض دونوں بھائی سنجیدہ اطوار اور حمیدہ خصال ہیں، طریقۂ یک رنگی
میں بے مثال ہیں یہ ابیات دل خراش اُس اہل دل کی تلاش سے ہیں[1] ؎

تیری زلفوں میں پھنسا دل ہی تقصیر ہوئی — نقد جاں لیجئے حاضر ہے گنہگاری دل
نلے ہی سدا بھر بھر دن عمر کے بھرتے ہیں — ہیں شمع ہیں ہم تجھ بن جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ — رہتا ہے مدام آب دیدہ
تمہارے در پہ جو درباں نے آستیں پکڑی — برنگ نقش قدم ہم نے بھی نہ میں پکڑی

---

[1] اصل کتاب میں نمونۂ کلام نہیں تھا معلوم نہیں مصنف ہی کو نہیں ملا یا جس نسخہ سے ہم نے نقل کیا ہے اُس کے
کاتب نے چھوڑ دیا ہے - یہ مندرجہ بالا چار شعر ہم نے سخن شعرا، مصنفہ عبد الغفور خاں نساخ سے نقل کئے ہیں ۱۲

۱۲۳- دیوانہ - رائے سرب سکھ - کچھ اضافہ کیا ہے تاریخ وفات وغیرہ کا - (۳ شعر)

دیوانہ تخلص، رائے سرب سُکھ نام، رشتہ دار راجہ مہانراین کا تھا۔ نہایت پُر گو۔ اور وضع مغلیت پر مرتا تھا۔ دو دیوان زبان فارسی میں اس نے لکھے ہیں، اور اکثر ریختہ گو لکھنؤ کے، مرزا جعفر علی حسرت، اور میر حیدر علی حیراں، اس کے شاگردوں میں سے ہیں سنہ ۱۲۰۴ بارہ سو چار ہجری میں لاچار گرم روی راہ عدم میں کی اور آتشِ فنا پیکرِ وجود کو دی[۱]۔ فارسی منظوم اس کا دس ہزار بیت سے زیاد ہے۔ یہ ہندی اس کا طبع زاد ہے:

جب تئیں تب سُنئے تو کرتا ہی وہ اقرار بغیر — گفتگو ہم سے اُسے پر نہیں انکار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ و پُرفن تھے وے — گرمیِ بزم کہاں اُس بتِ عیار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے یہ طبیبوں نے کہا — ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر

جان پر آبنی ہمدم مری خاموشی سے — بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے
کیونکہ دیوانہ بھلا رہیے اب اُس یار بغیر

دل ہے کہ تیری تیغ کے آگے سے ٹل نہ جائے — رستم کا کیا جگر ہے جو زہرا نکھل نہ جائے

رباعی

وے یار کہاں کہ یار باشی کیجے — وے وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجے
اک گوشہ میں بیٹھ کر دیوانہ تنہا — اب ناخنِ غم سے دل خراشی کیجے

---

[۱] مصنف نے جس خاص استعاروں میں رائے سرب سکھ دیوانہ کے انتقال کو بیان کیا ہے اُن میں ایک خاص جھلک پائی جاتی ہے، جو مصنف کی فراخ دلی پر مشعر ہیں ۱۲

۱۲۴- **داؤد** تخلص۔ اسمش داؤد بیگ۔ از موزونانِ عہد محمد شاہ
فردوس آرام گاہ بود از وست۔ (۹۷-ب)

زلفِ دلبر سے مجھکو سودا ہے   لوگ کہتے ہیں تجھکو سودا ہے

۱۲۵- **دل** تخلص۔ اسمش شاہ فتح محمد معاصر شاہ آبرو بود۔ از نبایر
محمد غوث گوالیاریست از وست:

کیا نکلی تیز تر دیکھیں ہیں مژگاں یار کی
ہم نے میاں بھی نہیں دیکھیں کہیں اس سار کی

۱۲۶- **درخشاں** تخلص۔ اسمش منکو بابیگ از موزونان عہد شاہ عالم بادشاہ
بود۔ شنیدہ شد مدتیست در فیض آباد رحلت نمود۔ از وست:

یاداں وداع عمر کو ہجراں کی رات ہے
مانند شمع میری سحر کو وفات ہے

حرف الذال

۱۲۷- **ذہین** تخلص اسمش میر مسعد۔ میر محمد علی در تذکرۂ خود نوشتہ کہ از
دوستانِ من بود۔ (۲ شعر)

۱۲۸- **ذاکر** تخلص۔ مراد آبادی۔ اسمش حسین دوست۔ از سادات
مراد آباد بود از وست۔ (۹۸-ا)

جو چاہو سو کہو مختار ہو عدو کو وے   حسین دوست کے دشمن کتیں یزید کہو

حرف الرا

۱۲۹- رند- تخلص دہلوی- اسمش شاہ حمزہ علی- جوان خوش روے بود
مدتے با علی نقی خاں انتظار تخلص و محمد تقی خاں پسران
علی اکبر خاں، مینکباشی مرحوم در زمرۂ سپاہیاں معاش کردہ
بچندیں لباس برآمدہ- آخر بجذبۂ باطن ترک علائق ظاہر نمودہ
در مرشد آباد سر و پا برہنہ بالنگ و کلیم می گشت- و در مجمع و
معرکہ حاضر شدہ برزمیں یا صفِ پائیں می نشست و اشعار
می خواند- وزار زار می گریست- راقم آثم را اکثر بہ آں
آزادہ حال نظر افتادہ خالی از حالتی و استقامتی بند د-
الحال کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری ست
شنیدہ شد بغایت وارستگی در عظیم آباد بر روضۂ شاہ ارزانی
دہمکان درویشان دیگر بلا تعین زندگانی می کند- کلامش
مربوط ست واکنوں بشنیدہ شیفتگاں گاہے درویشانہ
ریختہ می گوید- ایں اشعار آں ستودہ اطوار ست- (۲۲ شعر)

۱۳۰- راغب- دہلوی- اسمش محمد جعفر خاں برادر زادہ نواب لطف اللہ
خاں صادق پانی پتی تقرب سلسلۂ ایشاں پیش سلاطین
ہندوستان عیاں ست- راغب مذکور از چندے مسکن و

مادی در شہر عظیم آباد اختیار کردہ بعزت و اعتبار میگزراند طبعش چوں راغب بگفتن اشعار فارسی ست ریختہ را بہ بے پروای میگوید و با راقم آشناست۔ از وست

۶ شعر (۹۹ - ا)

۱۳۱- **رفعت** - شیخ محمد رفیع اصل موطنش الہ آباد است۔ اما سکنے در عظیم آباد اختیار کردہ۔ مدتے از منسلکان نواب عالی جاہ میر محمد قاسم علی خاں مرحوم بود۔ الحال از چند سال بخدمات مالی آں صوبہ روزگارے با عتبار دارد۔ بسیار دل جُود شگفتہ رو۔ آشنائے قدیم ایں خاکسارست۔ گاہے طبع موزونش رہنمون نظم ریختہ می شود۔ از وست ؛ ۲ شعر (۹۹ - ب)

۱۳۲- **رسوا** - مہتاب رائے گویند در ایام سلطنت محمد شاہ فردوس آرامگاہ اسلام اختیار کردہ بر منون نامی عاشق شدہ۔ از افراط محبت کارش برسوائی کشیدہ عریاں می گشت و با ہر کہ دوچار می شد میاں گفت و میگریست و آخر کار در دہلی بہماں عہد ازیں جہاں در گزشت از وست

۱۰ شعر (۱۱ - ب)

۱۳۳- **رسائی** - اسمش و احوالش ہنگام تحریر ایں اوراق معلوم نہ شد

اشعارش مرقوم است۔ ۲ شعر (۱۰۰۔ ا)

۱۳۴۔ رخشاں۔ محمد چاند۔ گویند در زمان احمد شاہ ابن محمد شاہ بادشاہ
بہ زعفران نامی عاشق شدہ زار و ضعیف بود از وست۔

یہ دل تپ ہجر میں تری جیا ہے
مرا ایک عمر جب لہو پیا ہے

۱۳۵۔ رضا۔ عظیم آبادی میر محمد رضا ابن میر جمال الدین حسین جمال تخلص
از قرابتیان میر حبیب اللہ مرحوم بود۔ از فیض صحبت سخنوران
عظیم آباد راغب گفتن ریختہ گردید۔ نوشتہ است ایں
ابیات از وست۔ ۶ شعر (۱۰۔ ب)

۱۳۶۔ رضا۔ مرزا علی رضا از دوستانِ لالہ سرب سکھ دیوانہ۔ و
بر وہب علی نامی عاشق ست و مثنوی در بیان عاشقی او
دارد۔ از وست۔ ۲ شعر

۱۳۷۔ رضا۔ تا تحریر ایں اوراق احوالش معلوم نیست۔ شعر بسیارے
از وے دیدہ شد یک بیت قلمی گشت

ایک دم تو رضا کے پاس آ بیٹھ
آج وہ اس جہاں سے اٹھتا ہے

۱۳۸۔ راقم۔ بندرابن از شاگردانِ مرزا محمد رفیع سودا بود
از وست ۲ شعر (۱۰۰، ب)

۱۳۹- رنگین - گویند اصلش کشمیر ست اما در دہلی ساکن و معاصر مرزا محمد رفیع سودا بود از وست:

مدت ہوئی ہم اس میں کچھ بھی اثر نہ پایا
اس واسطے دعا سے آخر کو ہاتھ اٹھایا

۱۴۰- رنگین - مرزا امان بیگ از خوشنویسان خط نستعلیق و از نسلکان سرکار نواب افتخار الدولہ مرزا علی خاں بہادر بود۔ از وست

ایک مو زلف کا رنگیں کو نشانی بھیجا (۱۰۱-ا)
بعد مدت کے کیا یاد صنم نے بارے

۱۴۱- رشید - از تلامذۂ ملا نظام الدین مرحوم و ساکن لکھنؤ بود در سن شباب در یکے از قضایا کشتہ شد۔ در علوم معقول طبعش رسا و ذہنش بدقت آشنائی داشت۔ از وست۔ ۳ شعر

۱۴۲- رضا - سید رضی خاں (۱۰۱-ا)

ناصح سے کیا کہے کوئی کچھ بات واقعی
غیر از یہی کہ قبلۂ حاجات واقعی

۱۴۳- رستم - مخاطب بہ رستم علی خاں احتشام الدولہ و مشہور بہ نواب بہادر ابن نواب اشرف خاں بن نواب صمصام الدولہ خان دوران مرحوم و برادر کلاں مرزا محمد حسن مرزا تخلص ست جلالت شانِ سلسلہ ایشاں از غایت اشتہار محتاج باظہار نیست

الحاصل رستم علی خاں موصوف با برادرِ خود از تفرقۂ روزگار ترک دیارِ خود کردہ بہمراہی نواب سعادت علی خاں بہادر مرور و گذار بجانب صوبۂ بنگالہ و بہار نمودہ - بعد مراجعت اصل اقامت در بنارس انداختند - ہرچند راقم حقیر را تا تحریر ایں اوراق با مشار الیہما اتفاق ملاقات ظاہر نیست اما بہ سماعت صفات حمیدۂ ایشاں تعارفے بہم رسانیدہ در بنارس ۱۱۹۶ھ ہجریہ برسم اخلاص اشعار مشار الیہما طلبیدہ در حرف الرا و حرف المیم ترقیم نمودہ - ۲۵ شعر (۱۰۲-الف)

۱۴۴- **رخصت** - دہلوی میر قدرت اللہ خلف میر سیف اللہ بنسبت شاگردی با مرزا جعفر علی حسرت تخلص دارد چندے استصلاح از قلندر بخش جرأت تخلص نیز نمودہ - الحال کہ ۱۱۹۶ھ یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجری ست در لکھنؤ می گزراند ایں چند اشعار از بلدۂ مذکور در بنارس طلبیدہ مرقوم شد - ۲ شعر (۱۰۲-ب)

۱۴۵- **رند** - مہربان خاں - گویند در موسیقی ماہر و در تصنیف کبت و دوہرہ پٹہ قادر ہست در فرخ آباد بخدمت دیوانی نواب احمد خاں غالب جنگ اختصاص داشتہ مسافر نواز و از تلامذۂ مرزا محمد رفیع سودا و میر سید محمد سوز تخلص ست در تیر اندازی

وشمشیر شناسی ید طولا دارد. از وست (۱۰۲ - ب)

حاصل تو ہوا وصل ہمیں رات پر افسوس
ایک پل میں شبِ عیش و طرب ہو گئی آخر

حرف الزا

۱۴۶- زکی - دہلوی جعفر علی خاں ابن مرزا مومن بیگ۔ بہ منصب سہ ہزاری در منصبداران محمد شاہ مرحوم سرفراز بود۔ و در مقربان نواب عمدۃ الملک امیر خاں مرحوم امتیاز داشت گویند براجہ رام سودائی عاشق بود۔ آخر حال بعد انتقال نواب امیر خاں مرحوم بناکامی گزرانیدہ ازیں جہاں گزشت طبعش در فکر ریختہ رسا و نظم کلامش بطرز قدماست مثنوی او کہ اکثر رعایت ابہام کردہ شہرت تمام دارد۔

۵۲ شعر (۱۰۴ - ب)

۱۴۷- زار - مغل بیگ از دوستانِ محمد تقی میر ست - از وست:

مشہور تھے جو نالے میرے گلی میں اُس کے
کوئی اور بھی جو رویا سمجھا کہ زار ہوگا

۱۴۸- زار دہلوی - اسمش میر مظہر علی بہ صفات حمیدہ موصوف و بہ شاگردی

حقایق آگاہ مولوی شاہ حفیظ اللہ معروف ست. در
زمرۂ متوسلان نواب مرزا علی خاں بہادر انسلاک دارد
۳ شعر (۱۰۴-ب)

حرف السین

۱۴۹- سودا- مرزا محمد رفیع- بالکل لفظی ترجمہ ہے لیکن لطف نے
چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر، نواب آصف الدولہ کی
تعریف کے قصیدہ اور سودا کے مدفن کا ذکر اپنی طرف سے
بڑھایا ہے۔ ۲۲ سطر (ایک سو صفحے تقریباً ۱۵۰۰ اشعر
نقل کیے گئے ہیں) (۱۵۵-ا)

نام نامی اور اسم گرامی اُس شاہ بازِ عرش پرواز معنی کا مرزا رفیع ہے۔ متوطن
دار الخلافہ شاہ جہان آباد کے۔ بے شک مقام اُن کی طبیعتِ فلک فرسا کا موافق اُن کے نام کے
نہایت رفیع اور منیع ہے۔ روز تولد سے ساٹھ برس کی عمر تک دلی میں ساتھ کمال عز و وقار کے
رہے اور طبع رسا کی مربی گری سے انیس و جلیس سلاطین نامدار اور وزرائے عالی تبار کے
رہے۔ اگرچہ ذات اُس یگانۂ روزگار کی کثرتِ اشتہار کے باعث مستغنی ہے تکلیف سے
خامۂ مدائح نگار کی، لیکن انصاف کہتا ہے کہ کچھ تھوڑا سا احوال اس مستغنی الصفات کا
لکھا چاہیئے اور تذکرے سے اُس شاہ بیتِ کلیات معانی کے- بیان کو ان اوراق
پریشان کے، زیب و زینت دیا چاہیئے- سچ تو یہ ہے کہ میرزائے مذکور سر حلقۂ

سخنوران اور سرآمدِ معنی گستران تھے۔ آشنائے معنی بیگانہ اور مضمون تازہ کے پیدا کرنے میں یگانہ تھے۔ اقسامِ نظم سے دیوان اس مطلع دیوان سحر بیان کا بھرا ہے' اور انواعِ نظم کو کیا کیا زور و شور کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خصوصاً طرز قصیدہ کو کس صفائی اور تکلف سے ادا کر کے اس طاقِ بلند پر رکھا کہ دستِ وہم نازک خیالان ہندستان کا اس کے خیال تک نہ جا سکا۔ آگ کو یاد میں اُس آتش زبان کے ہجوم شرار سے جوشش قطراتِ عرق انفعال ہے' اور پانی کو خجالت سے اس طبع رواں کی خاک میں چھپنے کا زبان ہندی شرفِ ہمزبانی سے اُس کی سرفراز' اور نظم ریختہ کو طبع معنی آفریں پر اُس کے گھمنڈ اور ناز۔ جب کہ بعد خراب اور ویران ہونے شاہ جہان آباد کے نقل و حرکت کا اتفاق میرزائے مذکور کو اس شہر سے ہوا' تو اور شہروں کی سیر کرتے ہوئے آخر بلدۂ لکھنؤ میں طور سکونت کا کیا۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت قدر و منزلت کی' اور چھ ہزار روپے سالیانہ کی جاگیر مقرر کر دی۔ چنانچہ بیشتر قصیدے نواب آصف الدولہ مرحوم کے تعریف میں کہے ہیں' اور کیا کیا تر و تازگی کے ساتھ مضامین عالی باندھے ہیں۔ جب کہ سن شریف اس خضرِ راہ سخن دانی کا ستر برس کو پہنچا' تو داعی اجل کو لبیک اجابت کہہ کے سرائے وجود سے پیما منزلِ عدم کا ہوا۔ تاریخ وفات اُس رفیع قدر محفل نکتہ دانی کی ہر ایک سخن سنج نے کہی ہے' لیکن یہ تاریخ اُس فرہادِ بے ستون مضمون تراشی کے سنگ مزار پر کندہ کی ہوئی ہے۔

خلد کو جب حضرتِ سودا گئے   فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا
بولے منصف دُور کر پائے عناد   شاعرانِ ہند کا سرور گیا

آغا باقر کا امام باڑہ اس محب امام علیہ السلام کا مدفن ہے۔ سنہ ۱۱۹۵ھ سایۂ قدوم امام کے باعث بے شک رنج مکافات کے واسطے مامن ہے۔ یہ اشعار یادگار جریدۂ روزگار کے لکھے جاتے ہیں اور یہ اوراق پریشان اس سے زینت پاتے ہیں۔

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی — نہ ٹوٹے شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی
ہنر پیدا کر اول، ترک کیجو تب لباس اپنا — کہ ہو جو تیغ بے جوہر اسے ہے ننگ عریانی
خوش آمد کب کریں عالی طبیعت اہلِ دولت کی — نہ جھاڑے آستینِ کہکشاں شاہوں کی پیشانی
کرے ہے کلفتِ ایام ضائع قدر مردوں کی — ہوئی جب تیغ زنگ آلود کب جاتی ہے پہچانی
یہ روشن ہے برنگِ شمع ربطِ باد و آتش سے — موافق گر نہ ہووے دوست ہے وہ دشمن جانی
ہے پرورش سخن کی مجھے اپنی جاں تلک — جوں شمع زندگانی مری ہے زباں تلک
بے ماتم اس چمن میں نہیں خندۂ طرب — ہے کسوتِ کبود گلِ زعفراں تلک
لاف سپہ گری نہ بکے مردِ راست باز — پاوے نہ راہِ حرف زبانِ سناں تلک
سختی سے گزری اہلِ سعادت کی یاں معاش — ہے منحصر غذائے ہما استخواں تلک

مطلع ثانی

جس کی بہار پہنچی نہ آخر خزاں تلک — آیا نہ ایک گل کبھی اس بوستاں تلک
وہ مرغِ ناتواں ہوں کہ صحنِ چمن سے میں — بے نردبان پہنچ نہ سکوں آشیاں تلک
روضہ میں جن کے حلقۂ چشمِ ملک سوا — پہنچا نہ پائے شمع کبھو شمعداں تلک
ہنگامِ طوف بسکہ ملائک ہمیشہ وہاں — لیتے ہیں خاک آن کے اُس آستاں تلک
خادم کہے ہیں وہاں کے یہ آپس میں دیکھ کر — پہنچے ہے کوئی دن کو زمیں آسماں تلک
رہنے کو جگ میں صورتِ افسوں کے تئیں — احکام خورمی نے کیا منع یہاں تلک
انگشت چوسنے کے لئے طفلِ شیر خوار — ممکن نہیں کہ لا سکے اپنے زباں تلک
اس چرخ دوں پرست تلے بہرِ مشتِ جو — مانند آسیا کے پھروں میں کہاں تلک

قصیدہ

ہے سخن سنج اک جوانِ متین — فخرِ صائب جو وہ کرے تحسین
رات جا کر میں اس کی خدمت میں — اُسے دیکھا تو تھا نپٹ غمگیں

میں جو پوچھا؟ کہا سبب مت پوچھ
خبث کرنا کسی کا خوب نہیں

لیکن اے یار تجھ سے کہتا ہوں
ل سکے گو مجھ پہ سب کریں نفریں

داغ ہوں اُن سے اب زمانے میں
بزمِ شعرا سے ہیں جو صدر نشیں

یعنی سودا و میر و قائمؔ و درد
بے ہدایت سے تا کلیم و یقیں

کیا غرور و دماغ و کیا نخوت
کون سا کبر ہے جو اُن میں نہیں

مثلِ شیرازۂ کتاب اللہ
سمجھے ہر ایک اپنی چینِ جبیں

ننگ جانیں جو بزم کا اُن کی
بو علی ہو صفِ نعال نشیں

اور جو احمق اُن کے سامع ہیں
دم بہ دم اُن کی کیا کریں تحسیں

جیسے سُبحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ پر
لڑکے مکتب کے کہتے ہیں آمیں

شعر و تقطیع اُن کے دیواں کی
جمع ہووے تو جیسے نقشِ نگیں

اُس میں جو دیکھئے تو آخرکار
یا توارد ہوا ہے یا تضمیں

اتنی کچھ شاعری یہ کرتے ہیں
میخ در کونِ آسمان و زمیں

غرض اس خبث کے تئیں سُنکر
ہو گئے بے اختیار میں وہیں

کہا سودا کو اُن بزرگوں میں
مت گنو اُس کا ہے یہ کب آئیں

اور جو ہووے بھی تو لائق ہے
فخر کرنا پھبے ہے اُس کے تئیں

ہے وہ مدّاح ایک ایسے کا
مسندِ جاہ جس کی عرش بریں

یعنی نواب سیف دولہ سدا
جس کی شمشیر و فرق دشمنِ دیں

رفعتِ دستِ جود سے جس کے
دامنِ خلق کا ہے یہ آئیں

پنجۂ آفتاب کی سی طرح
بہرہ ور ہے ہمیشہ روئے زمیں

غنچہ کی بھی گرہ میں بند کیا
تیری بخشش نے منتِ زر کے تئیں

دست و پا اپنے گم کرے ہے عدو
یاد کر تیری تیغ و خنجرِ کیں

پوچھتا ہے ہر ایک سے سچ کہہ
سر فرا ٹنگڑیوں میں ہے کہ نہیں

فکر میں تھر کے ترے ہر شب
حالت نزع سے زبس ہے قریں

نیند اُس کو نہ آوے تا نہ پڑھیں
جائے افسانہ سورۂ یٰسیں

احکام پر ترے نہ کرے کیونکہ کام تیر
ہے یہ کمان حلقہ بگوش و غلام تیر

اُتنا ہی چست بیٹھے ہے جتنی کماں ہو چست
خوبی کا حق کرے ہے ادا یاں تمام تیر

ہمسر ہے کس کا تیر ترے تیر سے کہ یہ
انگشت ہے قضا کی کہیں ہیں بنام تیر

شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منھ میں زباں ہے

کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانے میں کئی شکل
ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ مکاں ہے

ثابت ہے، جو ڈگلا تو نہیں موزوں میں کچھ جان
تیروں میں ہی پر گیری تو بے چلہ کماں ہے

کہتا ہے نفر غرّہ کو صرّاف سے جاکر
بی بی نے تو کھایا ہے۔ فاقہ سے میاں ہے

یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ
شوال بھی پھر ماہ مبارک رمضاں ہے

اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے
تنخواہ کے پھر ملنے کی یہ شکل کہاں ہے

لیتے ہیں بایں رو بھی وہ تو دو ماہہ
ٹک دھوس دھڑکے کی جنھیں تاب و تواں ہے

قاضی کی جو مسجد ہے گدھا باندھ کے اس میں
بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و جواں ہے

ملّا جو اذاں دیوے تو منھ موند کر اُس کا
کہتے ہیں کہ خاموش مسلمانی تمھاں ہے

بولا جو خطیب اس میں تو مارے اُسے اک دھول
ہاتھ آگیا واعظ تو تھپیڑا بہ دہاں ہے

رینگے سے گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے
نہ ذکر نہ صلوٰۃ۔ نہ سجدہ نہ اذاں ہے

اور وہ جو ہیں کمزور سو وہاں آن کے بیٹھے
رستے کے جو آگے کو یہ ہر ایک دکاں ہے

اُٹھ اُٹھ کے دکھاتے ہیں انھیں مال وہ اپنا
دربار رواس عہد میں جو خرد و کلاں ہے

یوں بھی نہ ملا کچھ تو ہر اک پالکی آگے
اس سج سے رسالہ کا رسالہ ہی رواں ہے

کوئی سر پہ کئے خاک گریباں کہیں کا چاک
کوئی روئے ہے منھ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے

ہندو و مسلماں کو پھر اُس پالکی اوپر
ارتھی کا توہّم ہے جنازے کا گماں ہے

یہ مسخرگی دیکھ کے وہ صاحبِ ارتھی
کرتا ہے جو وہاں عرض تو یہاں ہے نہ وہاں ہے

گو ہو جئے جا کر کسی عمدے کے مصاحب
اُس کی تو اذیت بڑی ہی آفتِ جاں ہے

وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دو زانو
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خوابِ گراں ہے

خمیازہ پہ خمیازہ ہے اور حیرت اوپر حیرت
منھ صورتِ سوفار کمر شکلِ کماں ہے

صیغہ پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر
سو دو سو روپے کا جو کسی عمدہ کے ہاں ہے

صحبت ہی یہ اُس سے اگر آقا کے تئیں چھینک
آوے تو وہ اُس کو بہ خشونت نگراں ہے

دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اُس کے
ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اس وقت گماں ہے

سوداگری کیجئے تو ہے اُس میں یہ مشقت
دکھن میں بکے وہ جو خریدِ صفہاں ہے

قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ پہ دزدی کا گماں ہے

گر خان و خوانین کی کرے کوئی وکالت
اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ سے کہ عیاں ہے

ہر گھر میں وہ چاہے کہیں فوّارہ سا چھوٹوں
ہر کوچہ میں جوں آبِ چکاں اور دواں ہے

شاعر جو سُنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
دیکھے جو کوئی فکر و تردد تو یہاں ہے

گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانا
نیت قطعۂ تہنیتِ خانِ زماں ہے

تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر
گر رحم میں بیگم کے سُنے نطفہ خاں ہے

استقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ اُس کا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

ملّائی اگر کیجے تو ملّا کی ہے یہ قدر
ہوں دو روپے اُس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے

دن کو تو وہ بچارہ پڑھایا کرے لڑکے
سب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے
تس پہ یہ ستم ہے کہ تہالی تلے اُس کے
لڑکوں کی شرارت سے سدا خانہ نہاں ہے

چاہے جو کوئی شیخ بنے بہرِ فراغت
چھٹتے ہی تو شعرا کے وہ مطعون زباں ہے
دیتا ہے دُمِ خرس سے کوئی شملہ کو نسبت
گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے

پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اُٹھ کر
ہے آج کدھر عرس کی شب یہ ورد کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس تو کر داڑھی کو کنگھی
لے خیلِ مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے

در ہجوِ اسپِ بخیل

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بیک قرار

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفشِ پا کو ٹکاتے ہیں وہ اُدھار

تنہا ولے نہ دہر سے عالم خراب ہے
خسّت نے اکثروں میں اُٹھایا ہے ننگ و عار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں
پاوے سزا جو ان کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو ایسا خراب و خوار

نے دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نے سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفلِ شیر خوار

مانندِ نقشِ نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اُٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

ناطاقتی سے اُس کی کہاں تک بیاں کروں
فاقوں کا اُس کے ہائے کہاں تک کروں شمار

اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اُس کا حال
کرتا ہے راکب اُس کا جو بازار میں گزار

قصّاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
اُمیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

جس دن سے اُس قصائی کے کھونٹے بندھا ہے وہ
گزری ہے اس نمط اُسے ہر لیل و ہر نہار

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کے طرف ہو کے بے قرار

خطِ شعاع کو سمجھے ہے وہ دستۂ گیاہ
ہر دم زمیں پہ آپ کو پٹکے ہے بار بار

تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھانس کا
چوکے کو آنکھیں موند کے دیتا ہے وہ پسار

دیکھے ہے جب وہ توبرۂ ٹھاں کی طرف
کھاتا ہے دانہ گھاس کی جا گہ سدا بچھار

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
گھوڑے کو دیکھتا ہے تو پادی ہی بار بار

نے استخواں نہ گوشت نہ کچھ اُس کے پیٹ میں
دھونکے ہے اپنی دُم کو کہ جوں کھال کو لہار

پیدا ہوئی ہے تس پہ اگن پاؤ اس قدر
ہرگز دروغ اس کو تو مت جان زینہار

گزرے وہ جس طرف سے کبھو اُس طرف ستی
بادِ سموم ہووے صبا گر کرے گزار

سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہی یا کہ رنگ
خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار

ہر زخم پہ زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اُس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار

یہ حال اُس کا دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق
چنگل سے موذی کی تو چھڑا اُس کو کردگار

یا مر رہے یا چور لے جاوے یا ہووے گُم
اس تین بات سے کوئی بھی ہووے آشکار

تنہا نہ اُس کے غم سے ہے دل تنگ تنگ زیں
خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہے فگار

القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار

رہتے تھے گھر کے پاس قضارا وہ آشنا
مشہور تھا جنھوں کنے وہ اسپ نابکار

خدمت میں اُن کے میں نے کیا جا کے التماس
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار

فرمایا تب اُنھوں نے کہ اے میری جان من
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم اوپر نثار

لیکن کسی کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ
یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو گے انکسار

صورت کا جس کی دیکھنا ہیگا گدھے کو ننگ
سیرت سے جس کی نت ہے سگِ خشمگیں کو عار

بد رنگ جیسے لید ہے بد رنگ جوں پیشاب
بد یُمن اس قدر کہ کرے اصطبل اُجاڑ

مانند میخ جو کی لگد زن ہے تھان پر
لاجنب وے جگہ نہیں جوں میخ استوار

حشری ہے اس قدر کہ قیامت کو اُس اوپر
دجّال مُنہ کو اپنے سیہ کر کے ہو سوار

اتنا ہی سرنگوں ہے کہ سب اڑ گئے ہیں دانت
جبڑے پہ بسکہ ٹھوکروں کی نت پڑی ہی مار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلاوے اس کا سن
پہلے وہ ریگِ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے ز روئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

کم رو ہے اس قدر کہ اگر اس کے نعل کا
لوہا منگا کے تیغ بناوے کبھی لہار

ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کارزار

مانندِ اسپِ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
جز دستِ غیر کے نہیں چلتا وہ زینہار

مٹھا تو اس قدر ہے کہ جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں میں یار

دلّی میں آن پہنچے تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے آ کر ہے وقت کار

مدت سے کوڑیوں کو اڑاتے ہو گھر میں بیٹھ
ہو کر سوار اب کرو میداں میں کارزار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زین
ہتیار باندھ کر میں ہوا اس اوپر سوار

جس شکل سے سوار تھا اس دن میں اس اوپر
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھی دونوں ہاتھوں میں پکڑے تھا منہ میں باگ
ٹخ ٹخ کے پاشنوں سے مرے پاؤں تھے فگار

آگے سے توبڑا اسے دکھلائے تھا نفر
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا رو براہ
ہلتا نہ تھا جگہ سے ستی جوں میخ استوار

اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبّر ان میں سے کہتے تھے یوں پکار

پیہے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھ پونکے دو اختیار

کہتا تھا کوئی ہے بُزِ کوہی نہیں یہ اسپ
کہتا تھا کوئی ہیگا ولایت کا یہ حمار

پوچھے تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ کیا کیوں تجھے سوار

کہنے لگا یہ آکے اس اجماع میں ایک شخص
گھوڑا نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہ گار

سمجھوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں
ڈائن چلے ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار

اس مخمصے میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک اور
فتنے کو آسمان نے کیا مجھ سے دوچار

دھوبی کمار کی گدھی اُس دن ہوئی تھی گم — اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے وہاں گزار
ہر اک نے اُس کو اپنی گدھی کا خیال کر — پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھے دم کمار
دریائے کشمکش ہوا اُس آن موج زن — تھا عنقریب ڈوبیے خفت سے یک کنار
بد شیمی اُس کی دیکھ کے کر خرس کا خیال — لڑکے بھی وہاں تھے جمع تماشے کو بیشمار
کہتا تھا کوئی مجھ سے کہ تو مجھ کو بھی چڑھا — دوں گا ٹکا میں تجھ کو بھی نوچندہ اتوار
رکھتا کوئی تھا لا کے سپاری کو منھ کی بیچ — لیتا تھا کوئی دوڑ کے موتن ستی اُتار
کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اُس کے گرد و پیش — ساتھ اُس سمند خرس نما کے ہو چشم چار
جھگڑوں میں دھوبیوں سے کہ لڑکوں کو دوں جواب — کتوں کو ماروں یا کہ مروں اپنا پیٹ مار
پہلی ہی گولی چھوٹتے اُس گھوڑے کو لگی — ایسا لگے نہ تیر کہ ہو وے نہ تن سے پار
بارے دعا مری ہوئی اُس وقت مستجاب — وہاں سے بہر نمط کیا جنگاہ تک گزار
یہ کہہ کے حق ستی میں ہوا مستعد بہ جنگ — اتنے میں مرہٹہ نے ہوا مجھ سے بھی دو چار
گھوڑا تھا بسکہ لاغر و پست و ضعیف و خشک — کرتا تھا یوں خفیف سے مجھے وقتِ کارزار
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اُس کو حریف پر — دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نے سوار
جب میں نے دیکھا جنگ کی یہاں تو بندھی یہ شکل — لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

:

مقدور نہیں اُس کی تجلّی کے بیاں کا — جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا
پردے کو تعین کے درِ دل سے اُٹھا دے — کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا
ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ — جوں شمع حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا
اس گلشنِ ہستی کی عجب دید ہے لیکن — جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

سودا جو کبھی گوش سے ہمت کے سُنے تو
مضموں یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا

جگہ تھی دل کو ترے دل میں اک زمانہ تھا | مرے بھی شیشہ کو اس سنگ میں ٹھکانا تھا
جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ ٹل جاؤں گا | ہاتھ سے دل کے ترے اب میں نکل جاؤں گا
لطف اے اشک کہ جوں شمع گلا جاتا ہوں | رحم اے آہ شرر بار کہ جل جاؤں گا
چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہت گل | پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

۱۵۰-سوز- سید محمد- بالکل ترجمہ ہے۔ لیکن اصل تذکرہ میں سوز نے اپنے اشعار کے ساتھ، اپنے احوال میں جو نثر کے فقرے لکھے وہ موجود ہیں گلشن ہند میں ان کا کوئی ذکر نہیں۔

"میر سوز شخصے ست کہ ہیچکس را از وحلاوتے جز سکوت واکراہ حاصل نشود۔ ایں نیز از قدرت کمال الٰہی ست کہ ہر یکے بلکہ خار و خسے نیست کہ بکار چند بباید پس اگر منکرے سوال کند کہ ناکارۂ محض نیفتادہ ست اینست کہ ناموش سوختنی ست۔"

(۱۲ سطر، ۲۰۰ شعر (۱۶۲-ا)

سوز تخلص سید میر نام۔ ساکن قراول پورہ شاہجہان آباد۔ سید عالی نسب اور فن سخنوری میں استاد۔ طرز و ادا بندی کے بادشاہ، اور صورتِ مضمون درد و آہ سے کلام ان کا سر سے پاؤں تک سوز و سازہ ہے اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز شعر کے پڑھنے میں صاحب طرزِ خاص تھے اور آئین محبت میں مایۂ مودّت و اخلاص علم تیر اندازی اور کمان داری میں بہ شدت دل آشنا رکھتے تھے اور حسن شفیعہ نویسی میں نہایت دست رسا۔ ابتدائے جوانی میں انھوں نے ساتھ کام دل کے ایام زندگانی کو صرفِ نشۂ بے خمار کیا، اور سنہ اٹھارہویں میں جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے وارستہ

مزاجی کی تکلیف سے لباسِ فقر اختیار کیا۔ لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے اور اوقات ساتھ توکل وقناعت کے بسر کرتے تھے۔

سنہ ۱۲۱۲ بارہ سو بارہ ہجری میں مرشد آباد تک تشریف لائے، لیکن اطوار سکونت کے وہاں کچھ نظر نہ آئے۔ اُسی سال پھر لکھنؤ تشریف لے گئے اور اس دارِ فنا سے راہی ملکِ بقا کے ہوئے۔

علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزارِ ابراہیم میں لکھا ہے کہ "جس سال یہ تذکرہ میں لکھتا ہوں تو میر مذکور نے کچھ اشعار اپنے مع چندہ فقرۂ نثر لکھ کر مجھے بھجوائے تاکہ داخل تذکرہ کردوں"۔ چنانچہ ایک آدھ فقرہ میر مذکور کی نثر کا بھی خان مذکور نے تذکرے میں لکھا ہے ترجمہ اُس کا زبان ریختہ میں راقم حقیر نے اس طرح کیا ہے "کہ جو شے حق سبحانہ تعالیٰ نے خلق کیا ہے، بلکہ جتنے خار و خس ہیں، کتنے ہی کام آتے ہیں اور بندگانِ خدا اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں مگر یہ سوز وہ تخلص ہے کہ کسی کو اس سے حلاوت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ سوا سکوت اور کراہیت کے سبحان اللہ! یہ بھی قدرت الٰہی کا اظہار کمال ہے، کہ ایسی شے خلق کی جاوے جس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھاوے۔ پس اگر کوئی منکر سوال کرے کہ ناکارہ محض تو نہیں ہے؟ خیر تو اس لائق ہے کہ نام اُس کا قابل جلانے کے ہے"۔ غرض میر مذکور صاحب دیوان ہیں۔ اشعار منتخب ان کے لکھے جاتے یہاں ہیں ؎

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یارب! رازِ دل اُن پر بھی ظاہر ہو گیا

درد سے محروم ہوں درماں سے مجھکو کام کیا
یارِ خاطر تھا سو میرا بارِ خاطر ہو گیا

میں نے جانا تھا صحیفہ عشق کا ہی میرے نام
واہ یہ دیوان بھی نقلِ دفاتر ہو گیا

کیا مسیحائی ہے تیرے لعل لب میں اے صنم
بات کے کہتے ہی دیکھو سوز شاعر ہو گیا

دیکھ دل کو چھیڑ مت ظالم کہیں دُکھ جائے گا
ہاں بغیر از قطرۂ خوں اور تو کیا پائے گا

قتل کی نیت تو کر آیا اب تو کیا دیر ہے
پر مجھے تو مار کر ظالم بہت پچھتائے گا

پھر بھی کہتا ہوں تجھے "آ سوز کو یوں مت ستا"
مت ظالم کہیں تو بھی ستایا جائے گا

منہ ہی گر چشم ظاہر و دیدۂ بیدار ہو پیدا
در و دیوار سے شکلِ جمالِ یار ہو پیدا

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر
کہ تیرا اشک جس جا گر پڑے گلزار ہو پیدا

یہاں تک کفر پورا چاہیے گر خاکِ گلشن ہو
بجائے ہر رگِ گل رشتۂ زنار ہو پیدا

قتیلِ خنجرِ مژگاں ہوں کیا یہ بھی تعجب ہے
کہ میری خاک سے سبزے کی جاگہ خار ہو پیدا

مسیحائی ہے تیری تیغ میں کیا سوز کو ڈر ہے
جو لاکھوں بار ہووے قتل لاکھوں بار ہو پیدا

جی ناک میں آیا بتِ گلفام نہ آیا
جینا تو الٰہی مرے کچھ کام نہ آیا

دنیا میں یہی دوستی رہتی ہے مری جاں
جب تک نہ لیا دل تجھے آرام نہ آیا

عالم کی تمنا میں تری جاں بلب آیا
رحمت ہے خدا کی تو لبِ بام نہ آیا

قاصد سے تو پوچھا تھا کہ قاصد ہے تو کس کا
دہشت سے اسے یاد مرا نام نہ آیا

تھا نزع کی حالت میں یہی سوز کے لب پر
جی ناک میں آیا بتِ گلفام نہ آیا

کھڑے رہنے والو گر سوز ہے یہ
بھلا اس کے دل کا تو ارمان نکلا

مرا گشتہ ایسا تو ہے جس کی خاطر
یہ خورشید پھاڑے گریبان نکلا

قتل سے یہ بے گنہ راضی ہے اپنے اس لئے
ہاتھ میں اک روز تو دامانِ قاتل ہوئے گا

ابر کے قطرہ سے ہو جاتے ہیں موتی ناصحا
کیا ہمیں رونے سے اپنے کچھ نہ حاصل ہوئے گا

درگزر اس خوں سے آخر تجھے آوے گا رحم
سوز کا دل جب گھڑی خنجر سے بسمل ہوئے گا

کعبہ ہی کا اب قصد یہ گمراہ کرے گا / جو تم سے بتاں ہوگا سو اللہ کرے گا
زلفوں سے پڑا طول میں اب عشق کا جھگڑا / خط آن کے یہ مجملہ کوتاہ کرے گا

اپنے رونے سے گر اثر ہوتا / قطرۂ اشک بھی گہر ہوتا
جن کے نامے پہنچتے ہیں تجھ تک / کاش میں اُن کا نامہ بر ہوتا
پھر نہ کرتا ستم کسی پہ اگر / حال میرے سے باخبر ہوتا
خون عشاق کرتے کیوں ناحق / گر بتوں کو خدا کا ڈر ہوتا
سوز کو شوق کعبہ جانے کا
ہے بہت پر زیادہ تر ہوتا

اگر میں جانتا ہے عشق میں دھڑکا جدائی کا / تو محشر تک نہ لیتا نام ہرگز آشنائی کا
نہ پہنچے آہ و نالہ گوش تک اُس کے کبھو اپنا / بیاں ہم کیا کریں طالع کی اپنے نارسائی کا
خدایا کس کے ہم بندے کہاویں سخت مشکل ہے / رکھے ہے ہر صنم اس دہر میں دعویٰ خدائی کا
خدا کی بندگی کا سوز ہے دعویٰ تو خلقت کو
وے دیکھا جسے بندہ ہے اپنی خود نمائی کا

قاضی ہزار طرح کے قصوں میں آسکا / لیکن نہ حسن و عشق کا جھگڑا چکا سکا
قاصد ہو طفل اشک گئے بارہا و لے / دل کی خبر کوئی نہ تری کو سے لا سکا
کیا فائدہ ہے رونے سے اے چشم زار بس / کب اشک دل کی آگ لگی کو بجھا سکا
رستم نے گو پہاڑ اُٹھایا تو کیا ہوا / اس کو سراہیے جو ترا ناز اُٹھا سکا
اے سوز عزم کوچۂ قاتل نہ کر عبث
تو ایک بھی بتا دے کہ واں جا کے آسکا

خطرہ نہیں ہے مجھکو اے عشق اپنے جی کا / تو نے خطاب بخشا جب سے بہادری کا
ہر صبح منھ چڑھے ہے اُس تند خو کے اُٹھ کر / کیا آہنی کلیجہ دیکھو ہے آرسی کا

کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سے تو باز آ — دیکھا مزا نہ تو نے نادان عاشقی کا
عارض کو تیرے پہنچے کب اس کی ڈہڈہاہٹ — پیارے ہزار ہو تو ہے گل کا رنگ پھیکا
رستم تو آج تو ہے میدان کے سخن کا
اے سوز کس کو دعویٰ ہے تجھ سے ہمسری کا

تجھ پہ قربان مری جان دل و دیں میرا — ایک باری تو سن افسانۂ رنگیں میرا
بوئے گل شاخ ہوا میں سے بھی لیتا ہی ہیں — کس قدر شوخ ہے اللہ یہ گلچیں میرا

زلفوں کا اگر مجھ کو سروکار نہ ہوتا — یہاں تک تو پریشاں یہ دل زار نہ ہوتا
خوگر جو مداوے سے طبیب اپنے کو پاتا — تو زیست سے مایوس یہ بیمار نہ ہوتا
اگر آنکھ اٹکتی نہ کسی شوخ سے جا کر
تو دل بھی کہیں سوز گرفتار نہ ہوتا

ایک دن اک شخص نے اُس سے کہا — تو نے تو یہ ذکر سنا ہوئے گا
یعنی کہ عاشق ہے ترا جی سے سوز — ہو متبسم یہ کہا ہوئے گا

بلبل نے جس کا جلوہ جا کر چمن میں دیکھا — دو آنکھ موند ہم نے وہ من ہی من میں دیکھا
خورشید آوے جیسے ابر تنک کے اندر — عاشق کو تیرے جن نے یوں پیرہن میں دیکھا
یوں دیکھنے سے میرے کیا فائدہ کسی کو — دیکھا انھیں نے مجھ کو جن نے سخن میں دیکھا

اس سوا کھوج نہ پایا ترے دیوانے کا — قطرۂ خوں ہے مگر خار بیاباں میں لگا

کسی طرح ترے دل سے جواب نکلے گا — مرے سوال کا منھ سے جواب نکلے گا
نکلنے کا نہیں سینے سے دل جو ڈھونڈے گا — جو نکلے گا تو جلا سا کباب نکلے گا

ہے جیتے جی تو مجھے کوئے یار میں رونا — رہے گا مرگ کے بعد از مزار میں رونا
جو چھپ کے رات کو شبنم چمن میں روئے تو کیا — مجھے تو ایک سے ہے تا ہزار میں رونا
نہ غم خزاں کا مجھے نے بہار کی شادی — خزاں میں خاک ہے سر پر بہار میں رونا

تو روزِ وصل تو اے سوز اپنے آنسو پونچھ — ابھی بہت ہے تجھے ہجر یار میں رونا
بتوں کے عشق سے واللہ کچھ حاصل نہیں ہوتا — انھوں سے بات کرنے کو بھی اب تو دل نہیں ہوتا

جس نے آدم کے تئیں دم بخشا — اُس نے مجھ کو دلِ پُر غم بخشا
ساغرِ عیش دیا اوروں کو — سوز کو دیدۂ پُر نم بخشا
جس نے ہر درد کو درماں بخشا — مجھ سے کافر کو بھی ایماں بخشا
بے نیازی تو میاں کی دیکھو — گل کو بھی چاک گریباں بخشا
چشمِ معشوق کو دی عیاری
سوز کو دیدۂ گریاں بخشا

غم تو کہتا ہے کہ میں تجھ کو ستا جاؤں گا — پر مری جان ترے غم کو میں کھا جاؤں گا
ہم غریبوں کے گھر آنے کا کہاں تم کو دماغ — مت کرو وعدہ عبث ہم سے کہ آ جاؤں گا
اس طرح جی دوں کہ تو رحم سے بولے صد حیف — رسمِ عشاق کشی جان اُٹھا جاؤں گا
باغباں فکر نہ کر تو مرے ویرانے کا — آشیاں آتشِ گل سے میں جلا جاؤں گا
لے چکا دل کو خط اب جان جو مانگے ہی خال
سوز کہتا ہے یہ گو لی تو بچا جاؤں گا

گل ہی نہیں غلام تبسم کی آن کا — غنچہ بھی زر خرید ہے تیرے دہان کا
زاہد جو کھینچ کھینچ کے چلّے ہوا ہے خم — بہتر ہے ایسے چلّوں سے چلّہ کمان کا
سینہ میں دل کہاں ہے غمِ زدگاں سے سوز
اخگر یہ رہ گیا ہے نشاں کاروان کا

جو دل کہ تھا الٰہی اُس دل ربا کے گھر سا — خالی پڑا ہے اب یوں اُجڑا ہوا نگر سا
ترسا نے ترس کھایا احوال سن کے میرا — بے ترس ڈر خدا سے اتنا نہ مجھ کو ترسا
شاید کہ اپنے گھر کی دی اُس نے خاک روبی — خورشید کی کلہ پر کچھ تو دھرا ہے پر سا

جاتا ہی سوزؔ جس دن کہتا ہے ہمنشیں سے
آنے نہ دیجو اس کو لگتا ہے بد نظر سا

مروّت دشمنا غفلت پناہا
ادھر ٹک دیکھ لیجو مڑ کے آہا
صرفت العمر فی لہوٍ و لعبٍ
فآہاً ثم آہاً ثم آہا

یوں دیکھ لے ہے وہ کہ ادا کو نہ ہو خبر
چھینے دل اس طرح کہ دغا کو نہ ہو خبر
عشّاق تیری تیغ تلے او ستم پناہ
سر اس طرح سے دیں کہ قضا کو نہ ہو خبر
رخصت جو دے تو مجھ کو تو میں تیرے پاؤں کا
بوسہ لوں اس طرح کہ حنا کو نہ ہو خبر
ناصح تو چاکِ جیب کا مانع ہے اس قدر
دل چاک یوں کروں کہ قبا کو نہ ہو خبر

اب ضرر کرنے لگا دل کو بتاں کا اختلاط
سچ تو ہے ان بے وفاؤں سے کہاں کا اختلاط
اب کوئی دم کو مچا دے گی خزاں یاں آ کے دھوم
عندلیبو چھوڑ دو تم گلستاں کا اختلاط

یہ سب باتیں ہیں قاصد یار میرے گھر نہیں آتا
نہ دیکھوں جب تلک آنکھوں سے کچھ باور نہیں آتا
پرائے دل کو لے کر اپنے تلوؤں کے تلے ملنا
ارے سن تو تجھے ہرگز خدا کا ڈر نہیں آتا
کسی کے دل میں ہوگا سوزؔ مر جاوے تو بہتر ہے
الٰہی میں مروں کیوں کر مجھے تو مر نہیں آتا

کیا دید کروں میں اس جہاں کا
وابستہ ہوں چشمِ خوں چکاں کا
ہرگز نہ ٹلا تری گلی سے
ممنون ہوں جسمِ ناتواں کا
سوزؔ آگے ذرا سنبھل کے جانا
بیٹھا ہے لگائے گھات بانکا

جگر سے آہ دل سے نالہ سینہ سے فغاں نکلا
سرائے تن سے کیا حسرت زدوں کا کارواں نکلا
جو دل تھا میرے پہلو میں سو اب وہ عرشِ اعظم ہے
خدا کے واسطے دیکھو کہاں سے جا کہاں نکلا

الٰہی محبت کو لگ جائے لو کا
کہ اٹھتا ہے ہر دم جگر سے بھبھوکا
فریبِ محبت نے مجھ کو پھنسایا
میں بھولا میں بھولا، میں چوکا میں چوکا

جہاں روز پریوں کا رہتا اکھاڑا ‌ وہاں اب پڑا ہے گا میدان ہُو کا
مرا قتل کیا دل ربا نے نہ چاہا ‌ وہ کب ہو سکتا تھا خدا نے نہ چاہا

چشم غفلت کھول کر ٹک دیکھ تو اے مستِ خواب ‌ دہر نے کن کن ملوکوں کا کیا خانہ خراب
مسندِ فرعونیت پر بیٹھتے تھے جو مہ ناز ‌ اہل استحقاق کا منہ سے نہ دیتے تھے جواب
خاک میں پنہاں ہوئے ایسے کہ کچھ پیدا نہیں ‌ کون سا ان میں ہے رستم کون سا افراسیاب
بارہ ساعت کے لئے افلاک پر ہیں جو دماغ ‌ واہ واہ اُن کو بھی کہو آفتاب اور ماہتاب
پوچھیو تو باندھ کر کس پر چلا ہے تو کمر ‌ میں پڑا کھاتا رہوں گا تا قیامت پیچ و تاب
ان دنوں میں سوز کو دیکھا ہے یارو واہ واہ
ایک دنیا دار سے مل کر بنے عالی جناب

اشک کب ہوں ترے مستانے کے خشک ‌ کوچے کب ہوتے ہیں میخانے کے خشک
چوری چوری منہ ترے شاید لگا ‌ ہونٹ کچھ بے ڈھب ہیں پیمانے کے خشک
زلف کی بلٹوں میں کیا جا کر پھنسا ‌ یا الٰہی ہاتھ ہوں شانے کے خشک

ٹکرائیں سنگ سے سر ہو ہمکنار ہم تم ‌ روئیں گلے سے لگ کر اے آبشار ہم تم
میرا ہی سرو مجھ سے سرکش ہوا ہے قمری ‌ نالے کریں نہ یک جا ہیں سوگوار ہم تم
دیکھیں تو داغ سینہ کس کے ہیں اب زیادہ ‌ اے لالہ داغ دل کے کرلیں شمار ہم تم
تو میرے دل کو دیکھ اور میں ترے دل کو دیکھوں ‌ دل چاک چاک کر کر دیکھیں بہار ہم تم
تم تو چلے گئے پر یہ سوز ہے اکیلا
اے میرے درد صاحب تھے یادگار ہم تم

۱۵۱- سوزاں - مخاطب بہ نواب احمد علی خاں شوکت جنگ خلف
نواب افتخار الدولہ مرزا علی خاں مرحوم و برادر زادہ

نواب سالار جنگ بہادر - در لکھنؤ بہ سایۂ عاطفت نواب
وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر مد دولتہ می گزرانند - در
زمانے کہ میر ضیا ہمراہ سوزاں مذکور بود - فکر اشعار می نمود
بغایت معنی یاب ست - ۵ شعر

۱۵۲- سجاد - اکبر آبادی میر سجاد - ایک لفظ اضافہ نہیں کیا -

۳ سطر ۳۸ شعر (۱۶۴- الف)

سجّاد تخلص، میر سجاد نام اکبر آبادی - وطن بزرگوں کا ان کے آذر بائجان ہے لیکن تربیت انھوں نے شاہ جہان آباد میں پائی ہے - اور شاگردوں میں شاہ نجم الدین آبرو کے کیفیت طرز ایہام شاہ صاحب مذکور سے زیادہ ہے - سچ تو یہ ہے کہ اپنی وضع کا یہ عزیز بھی استاد ہے - میر محمد اکرم خاں دادا ان کے دار الانشائے بادشاہی میں نواب یحییٰ خاں میر منشی کے ہمراہ تھے، بہت مرد سنجیدہ اور حقیقت آگاہ تھے - غرض میر مذکور صاحب دیوان ہیں یہ غزلیں ان کی منتخب دیوان ہیں:

ساقی بغیر جام کے جی کا بچاؤ نیں — جوں فیل مست آوے ہے ابر سیہ پلا
کافروں سے داد نہ چاہو کہ یہاں کوئی — مر جا ستم سے اُن کے تو کہتے ہیں حق ہوا
گر تیرے گل کے آنے نے کھوئے نہیں حواس — سجّاد کیوں پھرے ہے سجن آج فق ہوا
یعقوب کے جب عشق بڑا سر پہ ٹوٹ کر — آنکھوں نے اُس کے رو دیا آخر کو پھوٹ کر
عشق میں جائے گا بے طرح مارا — بے طرح دل ہوا ہے آوارا
خط کترواکے آج قینچی سے — ہم سے ملنے میں جائے ہے کترا
غم نہیں گر گم ہوا بالوں میں تیرے جا کے دل — پیچ پر تجھ زلف کے گویا کہ اُس کو بل دیا
تجھ کو اے سجاد غیر از خنجر بیداد کے — اور بھی کچھ ظالموں کی دوستی نے پھل دیا

بتاں تو چاہتے سجّاد تجھ کو — کریں کیا پہ خدا نے جو نچاہا

مقبول اس جہاں کا ہرگز غنی نہ دیکھا — راجہ وہی ہے جو کوئی یہاں سے گیا ہی راجہ

شتابی پلالے کہ جاتا ہے ابر — جو کچھ باقی ساقی رہی ہو شراب

دَوربیں رخسار کے تیرے کہیں انصاف نہیں — خط چرالے جائے دل کو اور باندھی جائے زلف

جس خوب رو کے دل میں عاشق سے ہو نفاق — کہتے ہیں سارے اُس کے تئیں حسن اتفاق

ایک دل رکھتا ہوں جو چاہے سو لیجاوے اُسے — خواہ زلفیں خواہ مژگاں خواہ ابرو خواہ چشم

جب ہم آغوش یار ہوتے ہیں — سب مزے در کنار ہوتے ہیں

بتوں کے تئیں کس قدر مانتا ہے — یہ کافر مرا دل خدا جانتا ہے

اے صنم زنّار پہنی تجھ وفا کے واسطے — ورنہ کوئی کافر بھی ہوتا ہے خدا کے واسطے

کوئی جا کے قاتل کو سمجھائیے گا — کہ عاشق کا جی کھو کے کیا پائیے گا

کہا دل نے بولو یہ خوبوں کے تئیں — یہ دیکھو گے اپنا کیا پائیے گا

میرے تمام حال کی تقریر ہے یہ زلف — روزِ سیاہ و نالۂ شبگیر ہے یہ زلف

رہو آہ دل سوز میرے سے فرق — کہ ہے خوشہ چیں اُس کے خرمن کی برق

دل کو کبھی پیار دلا کر کے اے سجن — لاگا نہیں گلے سے مرے آج لگ

لخت جگر ہمارا پانوں کے ساتھ کھا کر — کرتے ہو ہم سے باتیں اب تم چبا چبا کر

۱۵۳- سراج - اورنگ آبادی اسمش میر سراج الدین - از موزونان زمان شاہ عالمگیر خلد مکاں بود۔ ۵ شعر

۱۵۴- سلیمان - معشوق سید عبدالحی تاباں این مطلع از و مشہور ست:

تجھ سے ظالم سے ملا دیکھ تو طراری دل — کچھ بھی دھڑکا نہ کیا بل بے جگر داری دل

۱۵۵- **سامان** - جونپوری - میر ناصر - گویند از شاگردانِ مرزا
مظہر جان جاناں بود - ۳ شعر

۱۵۶- **سعادت** - میر سعادت علی ساکن امروہہ - مرید شاہ ولایت اللہ بود.
مثنوی سیلی سجنون کہ در زمان نواب قمر الدین خان وزیر
دو عاشق و معشوق در دہلی گزشتہ اند گفتہ' و در
رعایت ایہام می کرد - و اکثر مناقب ائمہ علیہم السّلام
می گفت' از وست - ۵ شعر

۱۵۷- **سید** - دہلوی - میر امام الدین راقم حقیر او را ندیدہ - اما زبانی
بعض از دوستاں شنیدہ کہ سنجیدہ اطوار بود - از وست -

ہماری حسن کے کوچہ میں بینوائی ہے
یہ آنکھیں دیکھتے ہو کاسۂ گدائی ہے

۱۵۸- **سید** - میر یادگار علی - از سادات بارہ پور میوات و موزونان
عہد شاہ عالم بادشاہ است - از وست:

شورشیں باقی ہیں دل میں تس پہ آتی ہے بہار
دیکھئے کیا کیا شگوفے اب کے لاتی ہے بہار

۱۵۹- **ساقی** - میر حسین علی - احوالش تا تحریر ایں اوراق معلوم نہ شد چہ
غزل او بہ نظر راقم خاکسار رسیدہ اما بر یک بیت

اکثفا رفت ؎

قفس کو تو چمن میں رکھ جو آزادی نہیں ممکن
یہ اتنی عرض بھی لے کر کوئی صیاد تک پہونچے

۱۶۰۔ سکندر۔ مشہور بخلیفہ سکندر۔ در مرثیہ گفتن کمال اقتدار و سلیقہ درستی دارد اکثر در زبان پوربی و مارواڑی و پنجابی مرثیہ گفتہ و قصۂ ملّاح و ماہی و بادشاہ دل؟ فزار منظوم ساختہ۔ اگرچہ استعداد علمی ندارد۔ اما مرثیۂ او مقبول خواص و عوام ست و در قصہ خوانی و عرق کشی واقف و خود را از شاگردان ناجی می شمارد۔ از وست۔ ۲ شعر

۱۶۱۔ سلیم۔ عظیم آبادی۔ میر محمد سلیم۔ از سادات انجا است۔ بہ تجارت قلیلے معیشت می کرد۔ در تفہیم و تنظیم شعر طبع سلیم و ذہن مستقیم داشت۔ مثنوی در ریختہ مشتمل بر سانحۂ عجیب واقعہ ناحیۂ عظیم آباد۔ ترتیب دادہ کہ خالی از حالتے نیست و آں حمیدہ اطوار بایں خاکسار آشنا بود۔ در سنہ یک ہزار و صد و نود و پنج ہجری در مرشد آباد رحلت نمود و در ہماں بلدہ مدفون گشت۔ از وست (ایک پورا صفحہ اور ۳ سطریں اشعار کے لئے چھوڑ دی گئی ہیں۔ دوسرے نسخہ میں بالکل بعد ہی سے ش کی ردیف شروع کر دی گئی ہے)
(ورق ۱۶۵)

حرف الشین

۱۶۲۔ شاہی ۔ دکھنی شاہ قلی خاں، در حیدر آباد از منسلکانِ تاناشاہ
بود بیشتر مرثیہ می گفت ۔ از قدما بود ۔ از وست:

ملنا تمہیں کا غیر سوں کوئی جھوٹ کوئی سچ مچ کہے
کس کس کا منہ موندوں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

۱۶۳۔ شاکر ۔ محمد شاکر از دوستان محمد علی حشمت بوده و ریختہ را بسلاست
می گفت ۔ از وست:

کیا پوچھے ہے حال بلبلوں کا　　جو اُن پہ گزرتی ہے گزر لے
گلچیں تجھے کیا تری بلا سے　　گل توڑ کے تو تو گود بھر لے

۱۶۴۔ میر شاہ علی خاں دہلوی ۔ جوان زیبائے بود ۔ پریشان حال وارد
مرشد آباد گشتہ با حصول مراد مدتے بہ شادمانی گزراند
و بعد انقراض دولت نواب سراج الدولہ آوارہ از مرشد آباد
شدہ بہ سمت لکھنؤ افتاد ۔ و بہ عہد دولت نواب عالی جاہ
میر محمد قاسم خاں بہ عظیم آباد آمدہ در زمرۂ ملازمان نواب
مذکور انسلاک یافت و از نجا بدکھن رفتہ، گویند دران ناحیہ
انتقال یافت ۔ ۳ شعر

۱۶۵- شورش عظیم آبادی - میر غلام حسین - ۳۵ شعر

ایک لفظ کا اضافہ نہیں کیا۔ اس کے بر خلاف علی ابراہیم کا
مطلب خبط کر دیا ہے۔ نیز ترجمہ کو نہایت طویل بنا دیا
خصوصاً عبارت قلم کشیدہ کا مطلب غلط لیا۔

" میر غلام حسین مشہور بہ میر بہینیا۔ خواہر زادہ ملّا میر
وحید و شاگرد باقر حزین ست۔ بایں خاکسار آشنا بود
بہ محض پندار التفات بقبائح افکار خود نمی نمود۔
تذکرہ در ریختہ تالیف نمودہ۔ خالی از دردے
و حالتے نہ بود۔
در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنج ہجری رحلت کردہ
اشعارش مدوّن و ایں اشعار خلاصۂ دیوان اوست۔"

شورش تخلص، میر غلام حسین نام، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر بہینا کر کے تھے
بھانجے تھے ملا میر وحید کے اور مشورہ سخن کا کیا تھا میر باقر حزین تخلص سے علی ابراہیم خاں مرحوم نے
گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ "میرے آشنا تھے اور بیماری میں غرور کی مبتلا تھے فقط
اپنے خیال فاسد سے انھوں نے اپنے کلام کی قباحتوں پہ التفات نہیں کیا ہے، اسی
سبب سے سخن ان کا ہمیشہ موردِ اعتراض سخن گیروں کا رہا ہے" ایک تذکرہ شعرائے ہند
کا زبان ریختہ میں اُنھوں نے لکھا ہے، لیکن وہ بھی بسبب ان کی خود پسندی کے
خالی خلل اور زلل سے نہ تھا۔ سنہ ۱۱۹۵ گیارہ سو پچانوے ہجری میں اس سرائے

فنا سے جادہ نورد منزل بقا کے ہوئے۔ دیوان ان کا زبان ریختہ میں مترتب ہے
یہ ان کے کلام کا منتخب ہے:

ہمارے پاس بھی آیا نہ آیا ———— بھروسا کیا ہے جی آیا نہ آیا
کسی کو خم سے غرض ہے کسی کو جام سے کام ———— قسم مغاں کی ہے ساقی کے مجھ کو نام سے کام
اُٹھی یہ الفتِ گل کے سبب سے سب ایذا ———— وگرنہ کیا تھا ہمیں ہم صفیر و دام سے کام
ہماری صبح رخ یار شام زلفِ نگار ———— نہ مہر و ماہ کے ہے ہم کو صبح و شام سے کام
ہر ایک دم میں ہمیں وصل ہجر میں موجود ———— غرض نہ نام سے رکھتے ہیں نے پیام سے کام
رقیب گرچہ بہت برخلاف ہے شورش
ہوا کرے ہمیں ہے یار اپنے کام سے کام

۱۶۶۔ **شفا**۔ حکیم یار علی، معاصر محمد علی حشمت بود از وست:

جوں ڈانک کے ائے سے دونا کھولے ہے یاقوت
چمکا ہے رنگ پان سے جوہر ترے لبوں کا

۱۶۷۔ **شاعر**۔ میر کلّو۔ از اقربائے خواجہ میر درد ہست۔ بہ سلامت ذہن و درستی سلیقہ انصاف دارد۔ از موزونان عہد شاہ عالم بادشاہ ہست۔ از وست۔ ۵ شعر

۱۶۸۔ **شیدا**۔ میر فتح علی۔ از شمس آباد است متبنّٰی میر سوز و شاگرد مرزا محمد رفیع سودا و از موزونان عہد شاہ عالم بادشاہ است
از وست ۲ شعر

۱۶۹- **شوق** - حسین علی از شاگردان سراج الدین علی خاں آرزو بود
و در منسلکان نواب عماد الملک غازی الدین خاں انسلاک داشت
این اشعار از افکارِ اوست - ۱۵ شعر

۱۷۰- **شاداب** - لاله خوش وقت رائے و مسکنش چاندپور ندیه است - گویند
در فن انشا سلیقه داشته -

۱۷۱- **شهرت** - دہلوی مرزا محمد علی - از شاگردان یحییٰ اماں جرأت است
الحال که سنه ۱۱۹۶ ہجری است - در لکھنؤ می گزراند - از وست - ۲ شعر

۱۷۲- **شاقی** - جہان آبادی - امین الدین - الحال که سنه ۱۱۹۶ ہجری ست
در عظیم آباد بمسکنت و نامرادی می گزراند - از وست:

مت زخم دل ہیرے کو کوئی التیام دو ظالم کو بلکہ زخمِ دگر کا پیام دو

۱۷۳- **شہید** - غازی پوری مولوی غلام حسین، مدتے برفاقت نواب
فضل علی خاں غازی پوری - روزگار بہ عزت گزرانیده
مردے ست خوش تقریر و سنجیده اطوار و باین خاکسار آشنا است
درین ولا که سنه ۱۱۹۶ ہجری ست - در زمرهٔ افاضل عوالی
مقدار که در بنارس باین خاکسار در عدالت مامور اند اشتغال
دارد - از وست - ۴ شعر

۱۷۴- **شرف** - میر محمدی - برادر زادهٔ نواب خان دوران - در ریختہ گوئی

متبع طرز نازک خیالان ست۔ از وست:

صاف دل کا مرتبہ ہی عرش و کرسی سے بلند جلوہ گر ہے آسماں زیر زمین آئینہ

۱۷۵۔ شفیع۔ میر محمد شفیع از ہم صحبتانِ مرزا محمد رفیع سودا و محمد تقی میر ست بوارستگی و آزادہ مشربی در لکھنو می گزراند

از وست۔ ۲ شعر

حرف الصاد

۱۷۶۔ صمصام الدولہ۔ خاندوران، موسوم بخواجہ محمد عاصم از امرائے فرخ سیر بادشاہ ست۔ احوال آں امیر ستودہ اطوار از غایت اشتہار محتاج بہ تحریر نیست گاہے بہ موزونی طبع نظم ریختہ و فارسی می نمود۔ از وست:

نزدیک ہے خزاں کا ہوئے گزر چمن میں
اب شور کرے بلبل آوے جو تیرے من میں

شکر لب نے بس گرمجوشی سے آج
میرے دل کو تل میں مرندا کیا ؟

۱۷۷۔ صنعت۔ لعل خاں از متوسلان نواب آصف جاہ نظام الملک بود

این دو بیت بنام او منسوب است:

دل جب سے ترے عشق میں مجھ سے جدا ہوا
بہکا جلا موا نہیں جانا کہ کیا ہوا

۱۷۸۔ صفدری حیدرآبادی۔ از قدماست واین معنی از شعرش ہویداست

سبز جامہ بر میں پی کے رنگ پینا دکھیو
شمع کافوری پہ یہ فانوس مینا دکھیو

۱۷۹۔ صادق دہلوی۔ میر جعفر خاں۔ نبیرۂ حقائق آگاہ میر سید محمد دری قاست
کہ مزار ایشاں بر نالہ بیرم دہی از محلات شاہجہاں آباد
واقع ست۔ صادق مذکور بآئین جد خود در صلاح و تقوی
آراستہ بود۔ "بہارستانِ جعفری" تصنیف کردۂ او ست
وبعد فوت بہ مقبرۂ جد خود مدفون گشتہ۔ از وست (۲ شعر)

۱۸۰۔ صبر فیض آبادی۔ میر محمد علی بشیر مرثیہ می گوید۔ این مطلع
از دست۔ ۳ شعر

۱۸۱۔ صانع بگرامی۔ نظام الدین احمد۔

لطف نے ذرا سے مطلب کو کس قدر طویل بنا دیا ہی پھر بھی
علی ابراہیم کا پورا خیال ظاہر نہ کیا۔ اور نہ خود اپنی طرف سے
کوئی اضافہ کیا ہے۔

از دوستانِ این خاکسار و محبّانِ مرزا محمد رفیع سودا ہست اشعار فارسی مدوّن دارد، و ریختہ کمتر می گوید۔ از خواندن اشعار خوب بسیار متاثّر می شود۔ بعالم اخلاص مستثنیٰ و ذہنش بفہم اشعار رسا ست۔
الحال بہ سال بیست و دویم شاہ عالم بادشاہ در مرشد آباد و کلکتہ لبسر می برد۔ از وست۔

(دونوں نسخوں میں یہی عبارت ہی اور دونو میں شعر نہیں دئے گئے ہیں)

صانع تخلص۔ نظام الدین احمد نام۔ ساکن بلگرام۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ محبان قدیم سے میرزا محمد رفیع سودا کے اور دوستان صمیم سے اس خاکسار کے تھے۔ بڑے صاحب درد و تاثیر، اور طبیعت کی گدازی میں بے نظیر۔ اچھا شعر جب کسی سے سنتے، تو گھڑلوں روتے، اور بے چین رہتے۔ عالم اخلاص اور دوستی میں زمانہ کے افتخار، استقامت طبع اور رسائی ذہن میں مستغنی روزگار تھے۔ سنہ بائیسویں تک جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے ہمیشہ مرشد آباد اور کلکتے میں ایام زندگی کے بسر کرتے تھے۔ آخر سنہ[1] ہجری میں ملک وجود سے رخت سفر کا باندھ کے راہی کشور عدم کے ہوئے۔ فارسی دیوان مترتب ہے ان کا۔ اور ریختہ کا شوق کمتر تھا۔ یہ اشعار اس نکو کردار کے ہیں:

سجن کی اس محبت پر دیا تھا جان و دل صانع
نہ تھا معلوم ہو جاوے گا وہ نا مہرباں اپنا

جلے بھنے ترے جس وقت آہ کرتے ہیں
تو دودِ دل سے جہاں کو سیاہ کرتے ہیں
قسم ہے تیری ہی کہانے میں یار تیر نگاہ
جگر تلک نہیں دل کے تباہ کرتے ہیں

---

[1] قلمی نسخہ میں سن وفات نہیں لکھا ۱۲

وہی ہوئے ہیں تب و تاب جاں سیتی آگاہ
جو کوئی دل سے گزرگاہ گاہ کرتے ہیں
خدا بچاوے غم و درد بحرِ عشق ہیں آہ
ڈبا کے زورقِ دل کو تباہ کرتے ہیں
نہ کوہ کن سے ہوئی بے ستوں ہیں صانع راہ
بڑے وہ مرد ہیں جو دل ہیں راہ کرتے ہیں
ہولے ہے شوق مہن کو دھڑی ہونٹوں جمانے کا
نہ جانوں کیا سبب یاقوت کے نیلم بنانے کا
یہ بلبل شاخِ گل پر بیٹھ کر کیا شور کرتی ہے
صبا کا آج وعدہ ہے مگر کلیاں کھلانے کا

حرف الضاد

۱۸۲۔ **ضمیر** دہلوی ملقب بہ سید ہدایت علی خاں و مخاطب بہ نصیر الدولہ بخشی الملک اسد جنگ بہادر۔ از دہلی بہ عظیم آباد آمدہ سکنی اختیار کرد۔ بصفات شجاعت و سخاوت معروف۔ و از خویشان نواب شجاع الملک محمد علی وردی خاں مہابت جنگ بود چندے بہ صوبہ داری عظیم آباد بہ نیک نامی گزرانیدہ۔ آخر بنا بر فقرات کہ تفصیل آں تطویل می خواہد در دہلی و اطراف آں بحصول بعضے خدمات بادشاہی بکام و ناکام بسر بردہ۔ اوایل سلطنت شاہ عالم بادشاہ باز بہ عظیم آباد آمدہ اصل اقامت انداخت و در حسین آباد برحمت الٰہی پیوست۔ گاہے بموزونیِ طبع

شعر ریختہ و فارسی می گفت ۲ شعر

۱۸۳- **ضیا**ء میر ضیاء الدین، ایک بات کا بھی اضافہ نہیں۔ ۹سطر ۹شعر

ضیا تخلص، میر ضیاء الدین نام، متوطن شاہ جہان آباد کے، میرزا محمد رفیع سودا کے ہم عصر تھے۔ نظم ریختہ میں مالک تھے طبع بلند کے اور صاحب تھے ذہن ارجمند کے۔ دلّی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا وہیں ٹھہرائے۔ ایک مدت اوقات اُسی شہر میں بسر کی، اور داد شعر و شاعری کی دی۔ اکثر سخنوروں کو اس دیار کے نسبت شاگردی کی اُس شاعر شیریں کام کے ساتھ ہے، اقسام نظم میں ان سے بیشتر ہوئی فکرِ غزلیات ہے۔ قصیدے سے تو ان کو کچھ انکار سا رہا ہے، اور مثنوی کا خیال بھی کم تر کیا ہے۔ آخر عمر بلدۂ عظیم آباد میں استقامت اختیار کی تھی اور طبیعت اکثر ساتھ عزلت و گوشہ نشینی کے بار کی تھی۔ آشنا پرست اور دردمند، رنج و راحت میں ہمیشہ خورسند تھے۔ از بسکہ مدار دنیائے فانی کا فنا پر ہے راہ گزار جادۂ بقا کے ہوئے۔ مالک دیوان رنگین و متین کے ہیں۔ یہ شعر اس شاعر ذکی و ذہین کے ہیں:

باؤ بھی کھائی نہ تھی دل نے کہ مرجھانے لگا
آہ یہ غنچہ تو کچھ کھلتے ہی کملانے لگا

کل کی رسوائی تجھے کیا بس نہ تھی اے ننگِ خلق
اُس کے کوچے میں **ضیا** پھر آج تو جانے لگا

پلادے آبِ خنجر ہم کو ظالم تشنہ جاتے ہیں
جو کوئی مرتا ہے اُس کے حلق میں پانی چواتے ہیں

ہے ماتم کس دوانے کا الٰہی آج صحرا میں
کہ سیلیں روتی پھرتی ہیں بگولے خاک اُڑاتے ہیں

ضیا رکھ ہاتھ سینے پر خبر دل کی بھی لے ظالم
کہ آج آنسو تری آنکھوں سے کچھ لوہو سے آتے ہیں

گریاں و خاک اُڑاتا جوں ابر و جوں بگولا
صحرا میں تو نے مجنوں وحشی **ضیا** کو دیکھا

اے آہ پچ نکل نہ کہیں دل تھلاک پڑے
یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

تیرے **ضیا** کا حال میں پوچھا تھا شمع سے
اک آہ اُس نے کھینچی اور آنسو ڈھلک پڑے

۱۸۴- **ضاحک** - دہلوی میر غلام حسین والد میر حسن تذکرہ نویس۔ در
ہزالی و ہزلہ گوئی اقتدار و در فہم موسیقی مناسبتے دارد
الحال کہ سال ہزار و صد و نود و شش ہجری باشد شنیدہ شد
در فیض آباد بوارستگی می گزراند۔ ازوست:

کیا دیجئے اصلاح خدائی کو دلیکن | کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

حرف الطا

۱۸۵- **طپش** - دہلوی۔ از شاگردان خواجہ میر درد و منسلکان سرکار
مرشد زادہ آفاق جہاندار شاہ صاحب عالم ست۔ ہرگاہ
کہ مرشد زادہ آفاق رونق افزائے بنارس بودند بارا قم
آثم در ۱۱۹۸ھ ہجریہ بکرر ملاقات کردہ۔ جوانے خوش ظاہر
بہ صفت خاکساری و اخلاق آراستہ است۔ ازوست ۷ شعر

۱۸۶- **طالع** - شمس الدین۔ گویند جوان زیبائے از اضلاع لکھنو بودہ ازوست:

زبس معمور ہے سینا مرا الفت کے داغوں سے
شگاف سینہ اپنے کون دد گلزار کہتے ہیں

۱۸۷- **طرز** - گردھاری لال۔ قوم کایتھ۔ متوطن امروہہ از شاگردان
میان محمد قائم قائم تخلص است۔ ازوست۔ ۲ شعر

حرف الظا

۱۸۸- **ظاہر** - خواجہ محمد خاں - از تربیت یافتگان مرزا مظہر جان جاناں بود
در زمان محمد شاہ فردوس آرام گاہ انتقال نمود - از وست:

پھر زلیخا نہ نیند بھر سوئی   جیسے یوسف کو خواب میں دیکھا

۱۸۹- **ظہور** - دہلوی - لالہ شیو سنگھ - در عہد احمد شاہ بن محمد شاہ
فردوس آرام گاہ بود - از وست   ۴ شعر

حرف العین

۱۹۰- **عزلت** - سورتی سید عبد الولی -

لطف نے کوئی اضافہ نہیں کیا - اگر کیا بھی ہے تو من گھڑت
جس سے علی ابراہیم کے اصل خیالات سے کوئی تعلق نہیں مثلاً
حسب ذیل کا ترجمہ لطف کے یہاں ملاحظہ ہو:

"وباوصف فضیلت اطوار واقوالش خالی
از سبکی وہزالی نبود - در زمان دولت نواب
محمد علی وردی خاں مہابت جنگ مغفور وارد
مرشد آباد ومورد مہربانی نواب مذکور گردید -

و بعد انتقال نواب بدکہن رفت۔ اشعار شش مدّون
بہ نظر ایں خاکسار در آمد "

(دونوں نسخوں میں یہی ہے کوئی اختلاف نہیں) ۲۶ شعر

عزلت تخلص، سید عبدالولی نام، خلف شاہ سعداللہ سورتی کے۔ وہ شاہ سعیداللہ کہ سر دفتر فاضلان اور سر حلقۂ صاحبدلان تھے اور بادشاہ عالمگیر کے تئیں اس مرجع خلائق سے اعتقاد صادق تھا۔ اصل وطن شاہ صاحب مذکور کا کوئی قصبہ ہے قصبات لکھنؤ سے۔ لیکن از بسکہ استقامت سورت میں اختیار کی تھی سورتی مشہور ہوئے۔ غرض جب عزلت مذکور اپنے والد کی وفات کے بعد دلّی میں گئے، تو شاہ جہان آباد کے سخنوروں کی ہم صحبتی سے فکر میں ریختہ کے پڑے۔ تلاش پر نظم کی دل دیا، اور حوصلہ شعر و شاعری کا حاصل کیا۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "باوصف تمکنت و فضیلت کے اوضاع و اطوار اس عزیز کے خالی سبکی اور بے مغزی سے نہ تھے۔ نواب علی وردی خاں مہابت جنگ مغفور کے عہد دولت میں وارد مرشد آباد کے ہوئے اور مورد عنایت و امداد کے ہوئے۔ حرکات ان سے خلاف ان کے منصب کے عمل میں آتے تھے اور آنکھوں میں ارباب تمیز کی کیفیت کو اعتبار کی گھٹاتے تھے۔ نواب مرقوم الصدر کی وفات کے بعد سرزمین دکن نور جمال سے اپنے منور کی اور بقایائے عمر اُسی مملکت میں بسر کی " دیوان ان کا مدت سے پا چکا انتظام ہے، یہ ان کا منتخب کلام ہے:

فقیروں سے نہ ہو نیرنگ لالن فصل ہولی میں
ترا جامہ گلابی ہے تو میرا خرقہ بھگواں ہے

بہار آئی چمن میں غل ہے بلبل کی صفیروں کا
جدا ہے ہر گلی میں شور زنجیر اسیروں کا

عبث توڑا مرا دل ناز سکھلانے کے کام آتا
یہ آئینہ تھا، اُس خودبیں کے اترانے کے کام آتا

جلایا مصحفِ دل تو نے کیوں برقِ تغافل سے
جو میں سچ بولوں تجھے جھوٹی قسم کھانے کے کام آتا

بتوں کا جور دیوانہ دوا کر مانتا ہیں گا
کہ پتھروں کو وہ صندل درد سر کا جانتا ہیں گا

بگولہ بن کے راہِ بے ستون میں کوہ کن اب تک
سم گلگوں کی ماٹی ہاتھ ل ل چھانتا ہیں گا

سیہ روزی میں میری قدر کو احباب کیا جانیں
اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہیں گا

مجھے چاہیے کہ پتھر مارے جب دشنام سیکیں گا
غلیل ابرو کے غزلت کس مزے سے تانتا ہیں گا

ہوا ہے داغ اُس کا مغز نازک آتش گل سے
چمن زادوں میں اک مرزا انش لالہ ہوا پیدا

جدھر نکلے وہ ہولی باز بانکا
گلابی ہے غبارِ راہ وہاں کا

نخل اُمید بے وفایوں سے
دل سلامت رہے تو پھل پانا

ادل ہمیں عشق اپنے سے بیہوش کیا
یاد اپنی دی پھر ہم کو فراموش کیا

ہم نے بھی جرس وار اے یار سفری
دل کو نالاں لبوں کو خاموش کیا

ہماری گرد سے دامن جھٹک گیا دلدار
کلاں سا پڑا جلتا ہے اب تلک یہ غبار

یاروں کی خاطروں کی گیا دل مرا خبر لے
ہیں پُر غبار سب دل کیا خاک جا خبر لے

جوں شب کہ صبح ہو جائے تب آفتاب آوے
ہم جل کے ہو گئے راکھ جب لگ وہ آ خبر لے

ہم ہیں مفلس بایہ کی قیمت گراں کیا کیجئے
ہم زمیں اور یہ اُس کا رتبہ آسماں کیا کیجئے

بچا دل زلف کے عقرب سے تو کیا
کہ چوٹی ناگنی پیچھے پڑی ہے

تری زلف کی شب کا بیدار ہیں ہوں
تجھ آنکھوں کے ساغر کا میخوار ہیں ہوں

کدھر بہتا پھرتا ہے اے گریۂ غم
کہ آنکھوں سے تیرا خریدار ہیں ہوں

پیر ہو یا شیخ ہو ہے دیکھو طفلاں کا مرید
مردہ بولا ہے کفن پھاڑ قیامت آئی

دل میں رندوں کے پھپولا ہوا عمامۂ شیخ
یا رب اس بزم سے یہ زہر کا ٹکڑا جاوے

کھلا کے دل جیسے پالا سو ہے مرا والی
جناب پاک جبوں مدظلہ العالی

شانہ اُس زلف میں پھرتے یہ سخن کہتا تھا
بات کہتے ہی شب وصل چلی جاتی ہے

شکستہ گر ہوا دل اب نظر نہ کر مجھ پر
یہ ٹوٹے آئینے میں منھ تری بلا دیکھے

۱۹۱- **عارف** - اکبرآبادی - محمد عارف۔ شاگرد مضمون است
قریب دہلی دروازہ شاہجہان آباد دوکان نوگری
داشت۔ ازوست:

دخترِ رز کو کہہ کہ اُس سے ملے
ورنہ عارف افیم کھا دے گا

۱۹۲- **عشق** - دہلوی۔ شاہ رکن الدین۔
صرف اس جملہ کا اضافہ ہے جس کا مطلب واضح نہیں معلوم
لطف نے کہاں سے حاصل کیا۔
"جہاں بیاں ہوتی ہے شاہ فرہاد کی حالت
سکر و مستی ہے تو کہتے ہیں کہ اس عالم میں تعظیم
بادشاہ کی نہیں ہے"
(دیکھو لطف ص ۱۲۶ ۴۵ شعر)

عشق تخلص۔ شاہ رکن الدین نام۔ شاہ گھسیٹا کر کے مشہور تھے۔ شاہ جہاں آبادی
نواسے شاہ فرہاد کے عمدہ مشائخوں میں سے دلی کے۔ جہاں بیان ہوتی۔ شاہ
فرہاد کی حالت سکر و مستی ہو تو کہتے ہیں کہ اس عالم میں تعظیم بادشاہ کی نہیں کی ہے
عشق مذکور ایام شباب میں شاہ جہان آباد سے مرشد آباد میں آئے اور خواجہ
محمدی خاں مرحوم کے ساتھ لباس دنیاداری میں ایک مدت ایام حیات بعزت تمام
بسر لائے۔ اگرچہ نہ کچھ خدمت نہ کام رکھتے تھے، لیکن آنکھوں میں امرایانِ
مرشد آباد کے نہایت احترام رکھتے تھے۔ بعد ایک عرصہ کے اپنے بزرگوں کے

طور پر مزاج فقر و درویشی کی طرف آیا اور تکیہ فضل ایزدی پر کر کے طور استقامت کا عظیم آباد میں ٹھہرایا۔ پھر تو نہایت زور و شور کے ساتھ مشیخت پناہی کی اور معتقدوں کے ہجوم سے عالم درویشی میں بادشاہی کی۔ طالبان راہ عشق کو ہدایت مطلب سے خالی نہیں چھوڑا۔ بقول علی ابراہیم خاں مرحوم سنہ ۱۱۹۵ گیارہ سو پچانوے ہجری تک داد حال و قال کی دی۔ آخر بلدہ عظیم آباد میں مرشد حقیقی قضا کے ارشاد دعوت پر لبیک اجابت آواز بلند کہی۔ دیوان اس مشیخت دستگاہ کا زبان ریختہ میں مترتب ہے، یہ اُس کا منتخب ہے:

کہنے کو اِدھر آدھر گئے ہم
تھے تیری طرف جدھر گئے ہم

تا جاں نہ ہوئی عدو دل حکمی
تو نے کہا مر، تو مر گئے ہم

بات کہنے کی نہیں طاقت شکایت کیا کروں
عشق رخصت دے تو شور حشر برپا کروں

نے درد دل ہی باقی نے آہ و نے فغاں ہے
اے سوز عشق سچ کہہ تو ان دنوں کہاں ہے

دیکھنے بن اُس کے یکدم چین یہ رہتا نہیں
اس دلِ کافر کے ہاتھوں سخت گھبرائے ہیں ہم

جوں آفتاب تاباں گو نام کو یہاں ہوں
یہ پرتو ہے تیرا ٹک دیکھ میں کہاں ہوں

گو نام اور نشاں ہی ظاہر میں میرا یارو
جو دیکھو فی الحقیقت ہوں وہم یا گماں ہوں

باتیں نہ سُن تو میری جل جائے گا دیوانے
میں برق آسماں ہوں یا عشق کی زباں ہوں

عرش تا فرش سیر کر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

چشمِ تحقیق سے جہاں ڈھونڈھا
کافر ہوں تجھ سوا اگر دیکھا

تیر کے نام پر تڑپتا ہوں
اس طرح کا کہیں جگر دیکھا

آبلہ آبلہ ہوئے سب عضو
نخلِ الفت میں یہ ثمر دیکھا

سحر میں سامری کے کیا قدرت
تیری نظروں میں جو اثر دیکھا

اپنے ہم چشم سے لگا کہنے
نالہ و آہ گھر بہ گھر دیکھا

ٹک اک انصاف سے اگر دیکھو
عشق سا کوئی چشم تر دیکھا

دیدۂ دل جو کر کے وا دیکھا | حرم و دیر میں خدا دیکھا
ہنس کے کہنے لگا ملامت کر | عشق میں تونے کیا مزا دیکھا
اس کی لذت کو دل سمجھتا ہے | اس کو میں کیا کہوں کہ کیا دیکھا

دشت تجھ کو قسم ہے مجنوں کی
عشق سا کوئی برہنہ پا دیکھا

از عدم تا وجود آ دیکھا | جان دیکھا سو بے وفا دیکھا
اپنی آنکھوں سے دیکھ اے خوش چشم | مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا دیکھا
تجھ سے کوئی آشنا نہ ہوا یا ہو | پہ تجھے سب سے آشنا دیکھا
اُس کے دہن تلک نہ پہنچے ہم | خاک میں آپ کو ملا دیکھا
ظالم اپنی جفا میں کہہ تو کبھو | لب مرا شکوہ میں ہلا دیکھا

کبھو غم سے جدا نہ دیکھا نہیں
عشق کو جا کے بارہا دیکھا

میں کافر ہوں اگر منظور ہوئے لطف مرہم کا | کہ یہ داغِ جگر ہے یادگار اُس یارِ ہمدم کا
ترا یہ وعدۂ فردا تو دل کو روزِ فردا ہے | کہاں فرصت ہی اے نادان بھروسا ہی کہاں دم کا
رلانے میں مرے کچھ تجھ کو ہیگا فائدہ کہ تو | مگر اتنا کہ گھر اپنا ڈبویا ادرہردم کا
کفایت ہی بروزِ حشر مجھ کو شفقتِ حیدر | کہ جس کے نام سے زہرا ہوا پانی جہنم کا

چاکِ دل تا بہ گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا | تختِ دل زینتِ داماں نہ ہوا تھا سو ہوا
بے وفائی تری دل دیکھ کے اے وعدہ خلاف | عشق بازی میں پشیماں نہ ہوا تھا سو ہوا

۱۹۳- عمدہ- کشمیری سیتا رام۔ معاصر سراج الدین علی خاں آرزو بود

اشعار بسیار از وے بہ نظر آمد اما ہمیں دو بیت

اکتفا نمود۔ از وست :

کسو کے سینے میں ہرگز مرا سا داغ نہ تھا
مرے چراغ سا روشن کوئی چراغ نہ تھا

چمن میں کھینچ کے لائے ہیں گلرخاں مجھکو
وگرنہ سیرِ چمن کا مجھے دماغ نہ تھا

۱۹۴۔ **عاصی**۔ نور محمد از برہان پور دکھن بود۔ از وست :

آتا تھا تیرے مونھ کے مقابل ہو آفتاب
ایسا گرا کہ تیغ کہیں اور سپر کہیں

۱۹۵۔ **عاجز**۔ اکبر آبادی۔ عارف علی خاں۔ گویند اشعارش مدون ست
اما بہ نظر حقیر نیایدہ از وست :

تری سمرن کو اے گلرو ہمارے اشک خونیں سے
پلک کے ہاتھ میں یاقوت کے دانوں کا مالا ہے

۱۹۶۔ **عمر** دکھنی معتبر خاں از منصبداران دکھن و شاگردانِ
ولی دکھنی بودہ از وست :

تل میں دل لے کے یوں مکرتے ہو   کہ گویا ان تلوں میں تیل نہیں

۱۹۷۔ **عیش**۔ مرزا محمد عسکری۔ کوئی اضافہ نہیں۔ (۳ سطر۔ ۶ شعر)
عیش تخلص، میرزا عسکری نام، بیٹے مرزا علی نقی کے۔ وہ مرزا علی نقی

جن کو نواب حسین قلی خاں کی طرف سے اپنی جہانگیری ایک مدت رہی، اور زندگی انھوں نے اس خدمت میں نہایت تشخیص و حکومت کے ساتھ بسر کی ہے۔ غرض میرزا عسکری مذکور جوان مودب و باشعور اور تہذیب اخلاق سے معمور ہیں۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "میرے آشنا ہیں، بہت ہی باشرم و باحیا ہیں۔ وطن تو ان کا شاہ جہان آباد ہے لیکن ایک مدت سے مرشد آباد میں آکر رہے تھے، اور بعضے خدمتوں کے ساتھ سرکار میں ناظم بنگالہ کے اوقات بسر کرتے تھے۔ دیوان ان کا مورد اشتہار رہے۔ یہ آن کا خلاصۂ افکار ہے:

وہ اگر آوے سرِ بام کہیں — میں بھی کرلوں اُسے سلام کہیں
کیاہے یہ قطرہ قطرہ، دے ساقی — ایک باری تو بھر کے جام کہیں
اس شب وصل کی سحر اے چرخ — لیجو مت مجھ سے انتقام کہیں

یہ غزل علیش ہے تصدقِ سوز
مجھ سے ہوتی تھی الصرام کہیں

۱۹۸- **عزیز**۔ بھکاری داس- از تلامذۂ خواجہ میر درد- موطن آبائیش جون پور و مولدش دہلی ست۔ بیشتر بہ بعضے خدمات بادشاہی مامور بود۔ وا الحال کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجری ست احوال و پارۂ اشعار خود را از الہ آباد بایں خاکسار فرستادہ۔ این چند ابیات از ال عزیز است۔ (۴ شعر)

۱۹۹- **عظیم**- محمد عظیم از شاگردانِ مرزا محمد رفیع سودا است شنیدہ شد کہ در دہلی بسر می برد۔

خواہی پیالہ خواہ سبو کیجیو کلال ہم اپنی خاک پر تجھے مختار کر چکے

۲۰۰ - عاشق - میر یحییٰ و مخاطب بہ عاشق علی خاں، از مردم دکہن بود

از وست :

ہیں شہید کربلا سب سرخ پوش مصطفٰی کی آل کا کیا رنگ ہے

۲۰۱ - عاشق - علی اعظم خاں خلف خواجہ محمدی خاں از مریدان معارف آگاہ شاہ گھسیٹا ست۔ با راقم آشنا بود۔ ترک لباسِ دنیا کردہ چند سال ست کہ وفات یافت۔ از وست :

روز و شب یار سے ملا کیجئے چین اس پہ نہ ہو تو کیا کیجئے

۲۰۲ - عاشق - میر برہان الدین شاگرد میر حسن ست در لباسِ فقر بحسن صورت و سیرت معروف و در علم نقوش مہارتے دارد

از وست : (۲ شعر)

۲۰۳ - عاشق - منشی عجائب رائے۔

(دونوں نسخوں میں جگہ چھوڑ دی گئی ہے)

حرف الغین

۲۰۴ - غالب، دہلوی - مخاطب بہ سید الملک نواب اسد اللہ خاں بہادر امام جنگ در زمان دولت نواب مہابت جنگ وارد

مرشد آباد شدہ سکونت دراں بلدہ اختیار فرمودہ۔ در فتوت و مروت یگانۂ دہر و در اخلاق و استقامت حال ممتاز عصر اند اگرچہ شاعری دون مرتبۂ کمال آں ستودہ خصال ست اما گاہے بموزونی طبع بہ نظم شعر فارسی و ریختہ رغبت می نماید۔ ایں خاکسار را بخدمت آں سید عالی تبار نیازمندی ست :

عجب کیا ہے اگر اخگر گریں اب میری آنکھوں سے
کہ روتا ہے دلِ پُر شور آتشبار پہلو میں

۲۰۵۔ **غریب**، دہلوی میر تقی۔ از ملازمانِ نواب عالی جاہ میر محمد قاسم خاں مرحوم بود۔ از وست :

الٰہی مت کسی کے پیش دردِ انتظار آوے
ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک کہ یار آوے

حرف الفا

۲۰۶۔ **فقیر**۔ دہلوی۔ میر شمس الدین۔ بہت اچھا اضافہ کیا ہی
(۴ سطر، ۳ شعر)

فقیر تخلص، میر شمس الدین نام۔ متوطن شاہ جہان آباد کے۔ استادوں میں سے شعرائے ہندوستان کے تھے۔ اہل ہند میں مجال کسی کی نہ ہوئی کہ سخن گستری میں مقام پر

فیضی کے اور خوش بیانی میں جگہ پر ان کے تکیہ کر سکے۔ دار الخلافہ شاہ جہان آباد میں ہر روز زندگانی کا اُنھوں نے نہایت غربت اور استغنا کے ساتھ بسر کیا ہے اور اس عرصہ میں دکن کا بھی سفر کیا ہے۔ چنانچہ بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے۔ اقسام نظم میں کوئی قسم نہیں رہی کہ ان کے خامۂ سحر آفریں نے اُس میں جادوکاری نہیں کی اور انواع شعر میں کوئی نوع نہیں چھوٹی کہ ان کے کلکِ گوہر سلک سے اُس میں دُرر باری نہیں ہوئی۔ اکثر علوم میں کتابیں ان کی تصانیف سے ہیں۔ خصوصاً عروض و قوافی میں کیا خوب رسالے تالیف کیے ہیں۔ سنہ ۱۱۱۷ گیارہ سو سترہ ہجری میں واسطے حج و زیارت کے تشریف لے گئے اور بعد حصول سعادتِ زیارت کے جب کہ پھرے تو کشتیِ حیات اُس آشنائے بحرِ معنی کے گردابِ ممات میں تباہی ہو کر ڈوبی۔ یعنی اس ناخدائے جہاز سخندانی کے جہاز کو بادِ مخالف نے صدمۂ طوفان دیا اور دریا سے مسقط میں غریقِ بحرِ رحمت کیا۔ اگرچہ کہنا ریختہ کا اُس اہلِ کمال کا دوں مرتبہ کمال تھا، لیکن اکثر واسطے تفنن طبیعت کے اس کا بھی اشتغال تھا۔ یہ گوہر آبدار اس بحر سخن سنجی کے آویزۂ گوشِ روزگار ہیں۔

دردمندوں سے نہ پوچھو کہ کدھر بیٹھ گئے
تیری مجلس میں غنیمت ہے جدھر بیٹھ گئے

ہے غرض دید سے یاں کام تکلف سے نہیں
خواہ ادھر بیٹھ گئے خواہ اُدھر بیٹھ گئے

دیکھا ہووے گا مرے اشک کا طوفاں تم نے
لاکھ دیوار گرے سیکڑوں گھر بیٹھ گئے

کس نظر ناز نے اُس باز کو بخشی پرواز
سیکڑوں مرغ ہوا پھاند[1] کے پر بیٹھ گئے

کم ہے آواز ترے کوچہ کے باشندوں کی
نالہ کرنے سے گلے اُن کے مگر بیٹھ گئے

مفت اُٹھنے کے نہیں یار کے کوچہ سے فقیر
جب کہ بستر کو جما کھول کمر بیٹھ گئے

[1] آج کل باندھ بولتے ہیں ۱۲

آہ تو نے تو کئی بار رلایا ہے فلک
زیادہ گستاخ نہ ہو عرش کو پہنچے گی دھمک

کل ہی کی شب کا ہے مذکور کہ جبرئیل آئے
خوب معلوم نہیں آپ تھا یا اور ملک

۲۰۷- **فغاں**- دہلوی - اشرف علی خاں - کوئی اضافہ نہیں علی ابراہیم نے لکھا ہے " باراقم آثم ربطے نداشت " (۷ سطر - ۱۵۰ اشعر جن میں دو مثنویاں ہجویہ بھی ہیں)

فغاں تخلص، اشرف علی خاں نام تھا - شاہ جہان آبادی خلف میرزا علی خاں نکتہ کے آٹھ پہران کو خوش طبعی اور خوش اختلاطی سے کام تھا - کوکے تھے احمد شاہ بادشاہ کے اور مربی گری سے ظرافت کی ندیم تھے جہاں پناہ کے - چنانچہ ظریف الملک کوکے خاں بہادر حضور سے بادشاہ کے خطاب پایا تھا اور مرتبہ کو شوخی کے ساتھ لطیفہ سنجی کے بہت دور پہنچایا تھا - دلّی سے مرشد آباد میں اپنے چچا کے پاس، کہ محمد ایرج خاں کر کے مشہور تھے، وارد ہوئے - لیکن نہ رہے اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر شاہ جہان آباد چلے گئے - بعد کئی برس کے عظیم آباد میں آئے اور طور بود و باش کے وہاں ٹھہرائے رفاقت میں مہاراجہ شتاب رائے کے چند مدت اوقات کاٹے، اور لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ہی میں دن رات کاٹے - اتفاقِ اصلاحِ سخن ان کو شیخ علی قلی ندیم تخلص سے ہوا ہے - نظم ریختہ میں طبیعت ان کی رسا ہے - ۱۱۸۶ھ گیارہ سو چھیاسی ہجری میں اس حباب کو دریائے فنا کے نزا ٹھٹھا سمجھ کر آشنا بحرِ کنارِ بقا کے ہوئے - بلدۂ عظیم آباد اس شیریں کلام کا مدفن ہے اور تلخیِ روز حشر تک اب وہیں مسکن ہے - زبانِ ریختہ میں صاحبِ دیوان ہیں - غزلیں منتخب ان کے دیوان کی لکھی گئی یہاں ہیں:

شکوہ کرے ہی تو جو مرے اشکِ سرخ کا
تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

ہستی کے خرابے نظر آتے جو عدم میں
ہرگز کوئی اس خواب سے بیدار نہ ہوتا

اے شیخ اگر کفر سے اسلام جدا ہے
پس چاہیئے تسبیح میں زنّار نہ ہوتا

مجھے تو تعزیہ دارا اپنا کر گئے اپنے — کہ جو شفیق تھے وہ دوست مر گئے اپنے
عبث تو تڑپے ہے کنجِ قفس میں مرغِ چمن — اسی تڑپ میں تو یہ بال و پر گئے اپنے
مرا مقام ہے اس سرزمیں پہ عاریتاً — اُدھر کو جانا ہے آخر جدھر گئے اپنے

کسے تو ڈھونڈھتا پھرتا ہے اے **فغاں** تنہا
کہ اس سرا کے مسافر تو گھر گئے اپنے

شبِ فراق نہ تنہا مجھے رُلاتی ہے — یہ صبحِ وصل بھی آنسو سے مُنھ دُھلاتی ہے
اگر میری زباں پر بارِ دیگر انتظار آوے — ابھی رونے پہ ظالم دل مرا بے اختیار آوے
دل زلف میں اُلجھا مجھے آرام یہی ہے — میں صیدِ بلاکش ہوں مرا دام یہی ہے
تار کی طرح کہیں زلفِ بتاں سے ٹوٹے — یا الٰہی دلِ بیمار بلا سے چھوٹے
ضعیف ہے دلِ بیمار اس قرینہ سے — اٹک کے آہ نکلتی ہے میرے سینہ سے
عشاق تیری گرمیِ بازار کر گئے — اس کو گراں بہا یہ خریدار کر گئے
اُٹھ چکا دل مرا زمانے سے — اڑ گیا مرغ آشیانے سے
دیکھ کر دل کو فرگئی مژگاں — تیر خالی پڑا نشانے سے
ہم نے پایا تو یہ ستم پایا — اس خدائی کے کارخانے سے
غیر از دوئی کے مانعِ دیدار کون ہے — وہ یار ہو گیا تو پھر اغیار کون ہے
بیمِ غضب رکھے ہے مجھے مغفرت سے دُور — گر وہ کریم ہے تو گنہگار کون ہے
جاگا نہ کوئی خوابِ عدم سے کہ پوچھتے — آسودگانِ خاک میں بیدار کون ہے
میں مر گیا پہ آہ نہ پوچھا **فغاں** مجھے — دردِ جگر کسے ہے یہ بیمار کون ہے

۲۰۸۔ فارغ۔ دہلوی۔ ہندوئیست از شاگردانِ میاں حاتم و از معتقدانِ مولوی فخر الدین۔ جوہرِ او از مطلعش پیداست

اشک آنکھوں سے جو نکلا سو وہ گوہر نکلا   بعد مدت کے میری چشم کا جوہر نکلا

۲۰۹۔ **فضل** دکھنی۔ شاہ فضل علی۔ معاصر شاہ نجم الدین آبرو بود۔

از وست ۲ شعر

۲۱۰۔ **فضلی** دکھنی۔ افضل الدین خاں۔ از قدماست۔ در تعریف یکے از شاہزاد ہائے دکھن مثنوی بہ محاورۂ دکن گفتہ یک بیت از انجاست:

عرق مونھ پہ جوں آرسی میں حباب   تبسم لباں پر جوں موجِ شراب

۲۱۱۔ **فرحت** ۔ شیخ فرحت اللہ۔ خواہ مخواہ توڑ مروڑ کر مطالب کا خون کیا ہے۔ علی ابراہیم نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ فرحت نہایت افلاس میں رہا اور انتقال کیا۔ صرف یہ جملہ ہے کہ:

"از دہلی بہ مرشد آباد افتادہ روزگارے بسر بردہ۔ در بعض اعیان رعایت حالش راقم آثم می نمود۔ تا آنکہ درہماں بلدہ ۱۱۹۱ھ از جہاں درگزشت۔" (۱۱۰ شعر)

(مقابلہ کرو لطف کے الفاظ)

فرحت تخلص شیخ فرحت اللہ نام۔ بیٹا شیخ اسداللہ کا۔ اولاد سے قاضی مظہر کے وہ قاضی مظہر کہ جانشین مرزا شاہ بدیع الدین مدار کے تھے۔ وطن بزرگوں کا ان کے ماوراءالنہر ہے لیکن فرحت مذکور نے دلّی میں پرورش پائی ہے اور عاشق مزاجی و دل بستگی ہی میں عمر گنوائی ہے

ہمیشہ بند عشق میں مسلسل مہ‌رویوں کے گرفتار اور سدا دردِ عشق سے بیگانہ خوبیوں کے یار۔ شاعرِ کہن مشق و ہم صحبت شعرائے نامدارِ شاہ جہان آباد۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "یہ عزیز میرا اخلاص مند تھا اور عسرت کا مورد گزند تھا۔ جب کہ دہلی سے مرشدآباد میں آیا۔ اور بطورِ سکونت کا وہاں ٹھیرایا، جو مجھ سے ہو سکتا تھا خبر گیرِ ان حال گاہ گاہ ہوتا تھا۔ غرض بہت تنگی معیشت کے ساتھ عزیز کا نباہ ہوتا تھا۔ آخر الامر ١١٩١ھ گیارہ سو اکانوے ہجری میں اُسی بلدے کے اندر انتقال کیا اور دارِ محن سے خلاف اپنے تخلص کے بہت مغموم گیا۔ زبانِ ریختہ میں اُس نے بہت کچھ کہا ہے۔ یہ منتخب اُس کے دیوان کا ہے:

گزرے اگر چمن میں وہ گلعذار اپنا — دیں چھوڑ بے کلی سے گُل شاخسار اپنا
تاثیر آہ میں نے نالے میں ہے اثر کچھ — ہووے وہ آہ یا رب کس طرح یار اپنا
جاوے کہیں بھڑک مت آتش سے دل کی ہر سے — رکھ دُور مجھ سے دامن اے کوہسار اپنا
اُس شوخ نے یہ پوچھا فرحت سے کل کہ تو نے — اس طرح کیوں گنوایا صبر و قرار اپنا
آنکھوں میں اشک بھر کر بولا نہ پوچھ ظالم — ہرگز نہیں ہے دل پہ کچھ اختیار اپنا

۲۱۲۔ **فرخ**، میر فرخ علی۔ از سادات اٹاوہ۔ بہ نجابت و سلامت طبع اتصاف دارد۔ از وست:

چشم سے نور گیا تن سے تواں جیسے صبر
عشق میں تیرے ہوا مجھ سے جدا کیا کیا کچھ

۲۱۳۔ **فراق**، دکھنی مرتضیٰ قلی خاں۔ ہندوستان نزا۔ در زمان محمد شاہ فردوس آرام گاہ از ملازمان توپ خانہ بود۔ بعد دولت نواب محمد علی خاں مہابت جنگ در مرشدآباد آمدہ بتوسل

آں سرکار متراتی گردید و دراں بلدہ سکنے گزید دآخر کار
بنا بر باقی زر سرکار بقید مہاراجہ شتاب رائے افتادہ
انتقال نمودؔ از دوستانِ مرزا محمد رفیع سودا و با راقم
آشنا بود - از وست - ۳ شعر

۲۱۴ - فراق دہلوی - میاں ثناء اللہ - از شاگردان خواجہ میر درد است
از وست :

دل دیوانۂ عاشق کو ناصح رنج راحت ہے
جراحت پر مری جو سنگ ہے سنگِ جراحت ہے

۲۱۵ فدا - دہلوی - سید امام الدین - شاگرد مرتضیٰ قلی خاں فراق تخلص مرد غریب
و آزادہ حال ست - در عہد نواب علی وردی خاں مہابت جنگ
مرحوم از دہلی بہ بنگالہ وارد شدہ سکنے اختیار کرد - اشعار خود را
در سنہ ۱۱۸۴ براقم نمودہ ازاں جملہ ایں ابیات مرقوم ست - ۹ شعر

۲۱۶ - فرحت - الہ آبادی - مرزا الف بیگ جد او از ولایت آمدہ اقامت
ہندوستان اختیار نمود - مشار الیہ جوانے ست فہمیدہ
بہ سپاہگری معاش می کند - الحال کہ سنہ ۱۱۹۶ ہجری ست
اشعار خود را از الہ آباد در بنارس براقم حقیر فرستادہ - الحال
در الہ آباد نظیر خود را ندارد - ایں اشعار زبدۂ افکار او ست ۱۱ شعر

۲۱۷- **فدوی** - دہلوی مرزا محمد علی -

ذرا سے مطلب کو بری طرح سے طول دیا ہے - ۵ سطر، ۴۰ شعر یہ چھوڑ دیا ہے: "بار اقم آشناست - اشعار منتخبۂ خود را بنا براین کہ در تذکرہ اثبات یابد فرستادہ بود -"

فدوی تخلص، میرزا محمد علی نام، معروف میرزا بجو، متوطن تھے اُس اُجڑے نگر کے جو کہ مشہور شاہ جہاں آباد کر کے - نظم ریختہ میں اُستاد ہے - تلاشِ معنی میں فکر رسا رکھتے تھے اور بیان حسن میں دل درد آشنا - علم موسیقی ہندی میں مناسبت بہت درست او تان کی سستی اور چستی کے جاننے میں نہایت چالاک و چپت - چند روز اُنھوں نے اوقات مرشد آباد میں بسر کی ہے - لیکن اس سیر و تماشے کے ساتھ جو کہ وضع اہل نظر کی ہے - آخر شہر عظیم آباد میں سکونت کا اتفاق ہوا - تو وضیع و شریف اس شہر کا ان کا مشتاق ہوا - فدویت میں معارف آگاہ شاہ گھسیٹا کے حاضر رہتے تھے اور فیض صحبت سے اُس عرفان پناہ کے کسب علوم ظاہری اور باطنی کا کرتے تھے - چنانچہ اُسی شہر میں اس کہن رباط مسافر کش ہستی سے دل اُٹھایا اور ایوانِ مہمانِ دوست عدم میں اسباب سکونت کا بھجوایا - زبان ریختہ میں شاعر شیریں بیاں ہے، یہ اُس کا منتخب دیوان ہے:

گر خاک پہ میری کبھی اے یار گزرنا | مت بھول کے ہرگز مع اغیار گزرنا

ایسا نہ ہو رندوں کی گزک ہو کہیں مندیل | میخانہ سے اے شیخ خبردار گزرنا

ضد دیکھو خوباں کی کہ اک آن کی خاطر | مر جائے جو عاشق تو نہ زنہار گزرنا

اُس بو کے تصدق ہیں کہ اُس گل کی گلی سے | ہے باد صبا کے تئیں سو بار گزرنا

کل یار کے کوچہ کی طرف گزرے گا فدوی
مت آج سے تو اُس طرف اغیار گزرنا

ہم کو تو جفا سے نہیں اے یار گزرنا پر تو بھی جفا سے نہ ستمگار گزرنا
تجھ کو انہیں آنکھوں کی قسم تیز نگہ ہے ٹک دل کو بچا سینے کے تو پار گزرنا
جب یار کے آگے سے چلے قافلہ دل کا اے اشک تو ہو قافلہ سالار گزرنا
گر ننگ و حیا تم نہیں جاتے تو نہ جاؤ ہے مجھ کو تو اس کوچہ سے لاچار گزرنا
شاید نظر آجائے کبھو در پہ تو سودا
فدوی کے تئیں ہو پس دیوار گزرنا

وہ کافر ہماری شب تار ہے جسے دیکھنا مہر کا عار ہے

۲۱۸ - **فدوی** - لاہوری - مردے بود بر خود غلط، برائے مباحثہ از مرزا محمد رفیع سودا بہ فرخ آباد آمدہ و ذلت کشیدہ بوطن خود برگشت - یوسف زلیخا بزبان ریختہ گفتہ و میر فتح علی شیدا - در ہجو او قصۂ بوم و بقال ضبط نمودہ - از وست - ۲ شعر

۲۱۹ - **فخر** - میر فخر الدین خلف اشرف علی خاں تذکرہ نویس - از شاگردان مرزا محمد رفیع سودا است - الحال کہ سال ہزار و صد و نود و شش ہجری ست در لکھنؤ بسر می برد از وست :

بات کیجئے غیر سے اور ہم سے منھ کو موڑئیے
ٹک خدا سے ڈر کے ان وضعوں کو اپنی چھوڑئیے

۲۲۰- **فروغ** - میر علی اکبر از تلامذۂ میر شمس الدین فقیرست - بفارسی ہم شعر می گوید و در طبابت و نجوم نیز دخلے دارد و از وست ۴ شعر

۲۲۱- **فیض** - دہلوی میر فیض علی - فرزند و شاگرد میر تقی میر ست - به سال یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجری اشعارش در بلدۂ بنارس از لکھنؤ طلبیده تحریر شد - ۸ شعر -

۲۲۲- **فریاد** - لاله صاحب رائے ولد لاله سندھیل - قوم کایتھ، ساکن لکھنؤ از شاگردان میر سوز ست - پیشتر قربان تخلص می نمود فی الحال متخلص به فریادست و در سنه ۱۱۹۶ ہجری ابیات او از لکھنؤ طلبیده اثبات یافت - ۴ شعر

حرف القاف

۲۲۳- **قائم** - شیخ محمد قائم - قائم کے کلام کی نسبت اپنی رائے کا اور سنہ وفات وغیرہ کا بھی اضافہ کیا ہے (۶ سطر ۱۰ شعر)

قائم تخلص، شیخ محمد قائم نام، متوطن چاند پور نہٹور کے۔ (غالباً صحیح نام محمد قیام الدین ہے) نظم ریختہ میں استاد مسلّم الثبوت تھے۔ ساتھ طبع بلند اور ذہنِ رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف کہتے ہیں کہ ابتدائے مشق میں مشورہ سخن کا انھوں نے خواجہ میر درد تخلص سے کیا ہے، اور آخر سخن سنجی میں اتفاق اصلاح کا ان کو میرزا محمد رفیع سودا سے ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے۔ راقم آثم کو

توطورِ گویائی کا اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے۔ طوطی کو اقرار تلخ گفتاری کا سامنے اُس شیریں مقال کے، اور خامۂ مانی کو اظہار فرسودہ زبانی کا روبرو اُس نازک خیال کے۔ صفائے بندش سے اُس کی آئینہ کو طلب صفائی دام اور خجالت سے اُس کلام رنگین کے گل کو شکستہ رنگی سے کام۔ آبداری اُس نظم صفاپرور کی رشک افزا آب گوہر کی، اور موجزنی اُس طبع معنی خیز کی حسد انگیز چشمۂ کوثر کی۔ افسوس ہے ایسے شخص کا اس جہان فانی سے اُٹھ جانا اور داغِ حسرت سے دلوں کو ارباب فہم کے جلانا۔ اُس عندلیب شاخسارِ سحربیانی نے شاید ۱۲۱۰ھ بارہ سو دس ہجری میں، اُدھر ہی نواح وطن میں اپنے، اس دارِ فانی سے سیر عالم باقی کی کی۔ اور عجب طرح کی ایذا جان کو اہل معنی کے دی۔ اگرچہ اقسام نظم میں کوئی قسم اُس شیریں کلام سے نہیں رہی ہے، لیکن رغبتِ طبیعت کے ساتھ غزل اور مثنوی بیشتر کہی ہے۔ دیوان ان کا بھرا ہوا اشعار آبدار سے ہے، یہ ان کے منتخب افکار سے ہے:

دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا
اُٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم
کیا کروں پر رہا نہیں جاتا

یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام اسی کا
پر دیکھیو لینا نہ کہیں نام کسی کا

خوباں کی طرف دیکھنے کا بندہ ہوں میں قائم
ملتے ہیں کہیں نام ہے بدنام کسی کا

بنی جھوؤں سے ڈرا چاہیئے کہ کہتے ہیں
کرے ہے کاٹ سرد ہی سے بیشتر ادنا

جب تک کہ ہے تو ہم ہیں ترے ساتھ ہمیشہ
جوں موج کہ نت لازمہ ہے آب رواں کا

عہدہ سے اُس صنم کے بر آیا نہ جائے گا
یہ ناز ہے تو ہم سے اُٹھایا نہ جائے گا

کعبہ اگر چہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

ہم نے ہر طرح ترے ہجر میں دل شاد کیا
ہچکی گر آئے تو سمجھے کہ ہمیں یاد کیا

کہاں ہے شیشۂ مے محتسب خدا سے ڈر
مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا

دل پا کے اُس کی زلف میں آرام رہ گیا
درویش جس جگہ کہ ہوئی شام رہ گیا

میں اس چمن سے اور یہ مجھ سے چمن گیا
لے دل میں اپنے حسرتِ سروِ چمن گیا

شیریں تو ساتھ خسرو کے کر ذوق سے معاش
پتھر تھا تیری چھاتی پہ سو کوہکن گیا

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی میں اور آپ ہی من گیا

روؤں گا زیرِ سایۂ دیوار بیٹھ کر
جس دن تری گلی میں کوئی داؤ بن گیا

زلف دیکھی تھی کس کی خواب میں رات
ہم سحر تک تھے پیچ و تاب میں رات

خوب نکلے ہم اُس کے کوچے سے
ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات

لیک خالی سی کچھ لگے ہے بغل
دل گرا شاید اضطراب میں رات

بھلا اے ابرِ مژگاں اب تو بس کر
ابھی تو کھل گیا تھا تو برس کر

بے شغل نہ زندگی بسر کر
گر اشک نہیں تو آہ سر کر

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی
اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

کیوں کیا مجھ کو تو صیّاد گرفتارِ قفس
میں نہ شائستۂ بلبل نہ سزاوارِ قفس

جب موج پہ اپنی آگئی چشم
دریا دریا بہا گئی چشم

اب کے جو یہاں سے جائیں گے ہم
پھر تجھ کو نہ منہ دکھائیں گے ہم

ہاں کیوں نہ ملیں گے تجھ سے ظالم
جب گالیاں نت کی کھائیں گے ہم

آزردہ ہو غیر سے لڑو یہاں
اس عہدے سے کب بر آئیں گے ہم

ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا
ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم

جوں چاہیے چاہ کا سررشتہ
قائم ہیں تو کر دکھائیں گے ہم

نہ دل میں آب ہے نہ نم رہا ہے آنکھوں میں
کبھی رو دئے تھے سو خوں جم رہا ہے آنکھوں میں

میں مر چکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کے لئے
حباب وار ذرا دم رہا ہے آنکھوں میں

میں کہا عہد کیا گیا تمہارا رات — ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

نگاہوں سے نگاہیں سامنے ہوتے ہی جب لڑیاں — یکایک کھل گئیں دونوں طرف سے دل کی پھر کلیاں

جب اُسے غیر سے ہو نین کھلانے کا شوق — سرمہ کے واسطے بھیجے ہے صفہاں مجھ کو

راہ کے بیچ جو رکھتا ہوں اُسے گھیر کبھو — ہنس کے کہتا ہے کہ اب چھوڑ مجھے پھر کبھو

اتنی اے دیدۂ دل مجھ پہ نہ بیداد کرو — دیکھیں کیا ہووے خدا کو تو ٹک اک یاد کرو

کبھی دکھا کے کمر اور کبھی دہاں مجھ کو — نپٹ بتنگ کیا تو نے اے میاں مجھ کو

تو اپنے واسطے اے باغباں نہ کاوش کر — نپٹ ہے سایۂ دیوار گلستاں مجھ کو

جو کہ چہلیں تھیں سو ہائے گئیں وہ یار کے ساتھ — سر ٹپکنا ہی پڑا اب در و دیوار کے ساتھ

ایک ہم خار تھے آنکھوں میں سبھی کے سو چلے — بلبلو خوش رہو تم اب گل و گلزار کے ساتھ

میں ہوں دیوانہ سدا کا نہ مجھے قید کرو — جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

تھی شرط مجھے اُس سے تو اک رات بسے کی — کیا ہے کہ دل اُس زلف سے ہرگز نہ بھر آیا

تیغ چڑھ اُس کی سان پر آئی — دیکھیں کس کس کی جان پر آئی

دہن کو تیرے پایا بات کہتے — ہماری جزرسی میں کیا سخن ہے

دل ڈھونڈھتا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے — یاں راکھ کا اک ڈھیر اور اک آگ دبی ہے

میں جاتا ہوں کعبہ سے اب دیر کو — بھلا یہ بھی دیکھوں خدا کیا کرے

مردن دشوار ہیں یہ جان بے تقصیر ہے — حسرت دل سو طرف سے اُس کی دامنگیر ہے

قتل کرنے سے مرے تو بھی ہوا کچھ منفعل — غرق آب شرم ہیں اب تک دم شمشیر ہے

مر جائیے کسی سے یہ اُلفت نہ کیجیے — جی دیجیے تو دیجیے پر دل نہ دیجیے

مرا کوئی احوال کیا جانتا ہے — جو گزرے ہے مجھ پر خدا جانتا ہے

یاس ہیں تجھ غم کے ہیں اپنی بھی غم خواری کی — دل دیا تجھ کو تو میں نے کچھ گنہگاری نہ کی

دم بدم اس رنجش بیجا کو کیا کہتے ہیں شیخ — دل دیا تجھ کو تو میں نے کچھ گنہگاری نہ کی

بعد خط آنے کے اُس سے تھا وفا کا احتمال — لیک واں تک عمر نے اپنی وفاداری نہ کی

دل مرا دیکھ دیکھ جلتا ہے — شمع کا کس کا دل پگھلتا ہے
گندمی رنگ جو ہے دنیا میں — میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہے
ہم نشیں ذکرِ یار کر کچھ آج — اس حکایت سے جی بہلتا ہے

گو ہم سے تم ملے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے — کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

زاہد درِ مسجد پہ خرابات کی تو نے — جی بھی یہی چاہے ہے تھا کرامات کی تو نے
ایدھر تو میں نالاں ہوں اُدھر غیر نہ جانیں — اب کس سے مری جان ملاقات کی تو نے

مرا جی تجھ کو کیا پیارا نہیں ہے — پر اتنا بھی تو ناکارہ نہیں ہے

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائم — مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

کیا ہی مکھڑا ہے یہ کہ جس کے حضور — آئینہ کی قلعی اُدھڑتی ہے
قائم آیا ہے پھر وہ بن ٹھن کر — دیکھیں کس کس کی یاں بگڑتی ہے

رباعی

کیا پشم ہی دنیا کہ یہ اربابِ نعیم — بے قرب کریں ہم کو دکھا کر زر و سیم
مسجد میں خدا کو بھی نہ کیجے سجدہ — محراب جو خم نہ ہو برائے تعظیم

مثنوی بردیہ

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید — صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
ان دنوں چرخ پہ نہیں ہے مہر — گود میں کانگڑی سے رکھے ہے سپہر
پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے — سبز وہ شال کی رضائی ہے
دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات — کالے کمل میں رات کاٹے ہے رات
چرخ کی اطلسی قبا ہے ہمیش — نہیں یہ کہکشاں سے ہے واتا کیش

ندی پر آ کے بیٹھے جو بگلا پروں سے اپنے اوڑھے ہو دگلا
برف کو چوں میں یوں پڑی ہی صاف جوں کہ اُڑتا ہے پنبۂ ندّاف
کہرے کو دیکھ کہتے تھے سب یار ٹھنڈ سے ہی فلک کے جی میں غبار
پر جو دیکھا ہے غور کریں آپ نکلے ہی منہ سے آسماں کے بھاپ
باد چلتی ہے بسکہ ٹھنڈا اور سخت روز شب کانپتے رہے ہیں درخت
گرچہ سرما سے خاص و عام ہیں شل پر کہوں کیا میں حالِ اہلِ دول
لپٹے رہتے ہیں روئی میں مجبور جس طرح ناشپاتی و انگور
جا کے حلوائی کو جو دیکھو کہیں برفی چھٹ کچھ دکاں میں اُس کے نہیں

قائم اب سردی کا ہے یہ مذکور
شعر ہو گر خنک تو رکھ معذور

مخمس

شیخ تو نابود ہووے یا ترا پندار نیست بتکدہ ویراں ہوں یا ہوں برہمن یکبار نیست
کام کیا ہے مجھ کو گو ہوں راہب و دیندار نیست کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنّار نیست

عاشقوں کے رونے کی کچھ اور ہی ہوتی ہے دھن دیکھ ہم روتے ہیں سختِ دل جو جی چاہے تو چن
ہم نہ کہتے تھے تجھے ظالم کہ آ یہ بات سن ابر را با دیدۂ گریانِ من نسبت مکن
نسبتِ بارندگی دارد و لے خونبار نیست

رباعی

دیکھ حال مرا اُٹھا کے سو سو حیلے ساتھی بھاگے ہر اک طرف کو جی لے
کہتی تھی جو کفش میں نہ چھوڑوں گی قدم سو اُس کے بھی ہو چکے ہیں کتنے ڈھیلے

۲۲۴ - **قبول** - عبدالغنی بیگ موطنش کشمیر - از مشاہیر شعرائے فارسی است
ریختہ بطور تفنن می گفت - از وست -

حاضری بن محل نہیں کھاتا بیگمی ہی پنیر منعم کا

۲۲۵ - **قدر** - دہلوی - محمد قدر - بعہد دولت محمد شاہ فردوس آرامگاہ
از دام ننگ و نام رستہ دل ہا و باشی و بے قدری البتہ بود
از وست (۲ شعر)

۲۲۶ - **قسمت** - ایں مطلع بنام او منسوب ست واحوالش معلوم نیست :

زمیں پر مت پٹک اس کو نہ یہ سنگ نہ گل ہے (؟)
وائے اے بے مروت یہ کسی کم بخت کا دل ہے

۲۲۷ - **قلندر** - لالہ بدھ سنگھ - گویند بہ یکے از ارباب طرب عاشق بود
و بہ علت عشق از ملت خود برآمدہ قلندرانہ بسر می برد -
از وست - ۴ شعر

۲۲۸ - **قربان** - میر جیون - از شاگردان مرزا محمد رفیع سودا - نوجوانے بود
در زمرۂ سپاہیاں معاش می کرد - ناگاہ در فیض آباد میانِ
فوجِ انگریزی افتادہ وانہ بدعت آں جماعہ غیر از جاں دادن
چارہ ندانستہ مردانہ خود را کشتن داد - از وست - (۲ شعر)

۲۲۹ - **قناعت** - لاہوری - مرزا محمد بیگ ولد حسن بیگ - از شاگردانِ

مرزا جعفر علی حسرت ست - در نولا کہ سنہ ۱۱۹۶ ہجری باشد مشارٌ الیہ در لکھنؤ می گزراند - ایں ابیات از انجا طلبیدہ تحریر نمودہ شد - ۲ شعر

۲۳ - قدرت - دہلوی شاہ قدرت اللہ -

علی لطف نے ایک اضافہ کیا ہے یعنی صرف تاریخ وفات کا جس کو غلطی سے واوین کی عبارت میں رکھا گیا ہے -

(۷ سطر ۱۲۵ شعر)

قدرت تخلص، شاہ قدرت اللہ نام ساکن شاہ جہان آباد کے مشہور سخنوروں میں سے تھے - رشتہ دار تھے میر شمس الدین فقیر کے - صاحب مذاق تھے چاشنیِ درد و تاثیر کے نظم ریختہ میں ذہن رسا رکھتے تھے - خاطر سخن گستر اور طبع معنی آشنا رکھتے تھے - طرز مضمون آفرینی سے ماہر، اور اک شگفتگی و برشتگی کلام سے اُن کے ظاہر - اکثر فکر اشعار فارسی کی بھی کرتے تھے، لیکن نظم ریختہ پر مرتے تھے - تازہ کرنے میں مضمون کے اپنے ہم عصروں میں ممتاز، اور صفائی میں بندش کی نازک خیالیوں سے ہند کے دمساز تھے - وارستہ مزاجی کے یار، اور آزادہ حالی سے سروکار - ایک مدت سے دلّی کو چھوڑا تھا اور وارد مرشدآباد تھے، اکابر اور اعزّہ اُس شہر کے سب ان سے برسرِ عنایت و امداد تھے - علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ مجھ سے ان کو اخلاص اور اتحاد تھا - واقعی عزیز اپنے طور کا استاد تھا - شاید سنہ ۱۲۰۵ بارہ سو پانچ ہجری میں اُسی بلدے کے اندر انتقال کیا - اور طبع کو صاحب طبعوں کے حد سے زیادہ پُر ملال کیا " دیوان میں اُسی صاحب قدرت کے ہر قسم کے اشعار ہیں - یہ غزلیں ان کی منتخب اشعار ہیں ؎

ہنگامۂ پرہیز و ورع اب بسر آیا اے بادہ کشاں مژدہ کہ پھر ابرِ تر آیا
کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے شاید تہِ مژگاں کوئی لختِ جگر آیا
غفلت میں کٹی شام جوانی تری صد حیف پیری میں تو ٹک چونک کہ وقتِ سحر آیا

ترے حضور میں جب قصدِ عرضِ حال کیا ہجومِ گریہ نے میری زباں کو لال کیا
میں داغ تازہ ہیں توڑے یہاں تلک ناخن کہ ایک بدر کا کاسہ تر از ہلال کیا
ہوا ہے اُس کے گلو میں گرہ دمِ اعجاز ترے لبوں نے مسیحا سے کیا سوال کیا

ٹوٹی کمندِ بخت کا وہ زور رہ گیا جب بامِ دوست ہاتھ سے کچھ دور رہ گیا
اوپر سے زخم گرچہ مرے ہو چلے بھلے ناسور تھا جگر میں سو ناسور رہ گیا

مدتوں سے رخنۂ دل یہاں جو منت مسدود تھا اک ذرا کھولا تو دیکھا خانۂ پُردود تھا
کبریائی کا جو دیکھا میں نے جس جا پر ظہور اپنی اپنی حد میں جو پشہ تھا اک نمرود تھا
حال قدرت پوچھتا ہے کچھ تو ظالم مجھ سے سن اُس کے بالیں پر دعا کو آج ہی موجود تھا
آہ جو اٹھتی تھی دردِ دل سے تھی لپٹی ہوئی اشک جو گرتا تھا سو لختِ جگر آلود تھا

بیتابیوں سے یہ دل بیتاب رہ گیا اپنی تپش میں جل کے یہ سیماب رہ گیا
آنسو تھمے ہیں پر نہیں سوکھی ہے چشمِ تر دریا اُتر گیا ہے پہ گرداب رہ گیا

ہم پہ ایامِ مصیبت آج پھر آنے لگا یار گھر جانے لگا لے وائے گھر جانے لگا
جب مسیحا دشمنِ جاں ہوں تو کب ہو زندگی کون رہ بتلا سکے جب خضر بہکانے لگا
مجھ کو غفلت نے خبر ایامِ فرصت کی نہ دی آہ جب جاتے رہے دن تب میں پچھتانے لگا
کب تلک اے نالہ زیرِ لب رہیں گے تو گرہ حوصلہ باقی نہیں بس جی تو گھبرانے لگا

دل سدا سینہ میں جلتا ہی رہا لختِ دل آنکھوں سے ڈھلتا ہی رہا
تونے گو مجھ کو دلاسے میں رکھا جی مرا تو بھی تو گھلتا ہی رہا

دل ہوا اسیرِ زلفِ سیہ فام رہ گیا صیدِ ضعیف مر کے تہِ دام رہ گیا

جب دیکھتا ہے مجھ کو تو دیتا ہے گالیاں　　اپنے نصیب کا یہ ایک انعام رہ گیا
آگے نہ چل سکا ترے کوچے کو چھوڑ کر　　خورشید جا کے تا بہ لبِ بام رہ گیا
قدرت کس آسرے پہ کٹے گی یہ زندگی
آنے سے اب تو نامہ و پیغام رہ گیا

آتش فروز دل ہے تا حسن شعلہ رو کا　　ہر اشک ہے شرارہ ہر آہ ہے بھبوکا
ڈھونڈھے ہے ہر پاس اب کیا سینہ میں غمزدوں کے　　مدت سے لٹ چکا یہاں سامان آرزو کا
کشتہ ہوں جان و دل تیرے خدنگ کا میں　　بحرِ کماں میں ہے گا پیاسا مرے لہو کا

تشنہ لب مرتا ہے نت موجِ دمِ شمشیر کا　　لے غرورِ ناز کچھ بھی فکر اس نخچیر کا
خوابِ غفلت لے گئی تھی ان دنوں دل کو ابھی　　آہ پھر کس نے یہ چھیڑا سلسلہ زنجیر کا
رنگ خونِ تشنگاں جس جا سے اُڑ سکتا نہیں　　ہوں اسیرِ ناتواں اُس خاکِ دامن گیر کا

گھر سے جس وقت وہ غارتگرِ ایماں نکلا　　کفر سے گبر گیا دیں سے مسلماں نکلا
وہ دل جمع کر اُٹھا جو بغل سے اپنی　　تو بہ زیرِ شکنِ زلفِ پریشاں نکلا

اس چشم سے ہو کے آب نکلا　　سینے سے دلِ خراب نکلا
جو نالہ جگر سے پار نکلا　　لے سیخ پر اک کباب نکلا
خط آیا و لے ہمارے خط کا　　منھ سے نہ ترے جواب نکلا

بیت الحزن میں شب کہ ترا انتظار تھا　　کھٹکا ہر ایک دل کا مرے جی کے پار تھا

ادھر بھی ایک بار جفا کی عناں کو پھیر　　دل ہے خدنگِ دستِ جگر ہی سناں طلب
دستِ بُردِ ظلم سے تیرے ہیں جتنے ہم خراب　　اس قدر بھی ہوئے گا عالم میں کوئی کم خراب
زخم سے دل کے ابھی اے چارہ گر بہتا ہے خون　　مت ڈبوبے فائدہ پھائے نہ کر مرہم خراب

کھڑے رونا کھڑے سر کو پٹکنا　　خوشا ایامِ اوقاتِ محبت

ہرزہ گردی سے رہائی کے چھڑا　　پھر مجھے زنداں میں اے زنجیر کھینچ

جان ہے وابستہ اُس پیکاں کے ساتھ — میرے پہلو سے نہ اپنا تیر کھینچ

ذرا قفس سے قفس تو ملا کے رکھ صیاد — کہ تا اسیر کریں مل کے ایک جا فریاد

جہاں نظر پڑے پاؤں تلے ملے کاغذ — سمجھ کے نامہ مرا ہاتھ ہیں نہ لے کاغذ
میں کیوں کہ اُس کو لکھوں خط جب اشک و آہ سے یہاں — ادھر جلے قلم اور اُس طرف گلے کاغذ

کسے جز خونِ دل میخانہ میں منظور ہی ساغر — مری آنکھوں میں تجھ بن دیدۂ ناسور ہی ساغر

آہ روئے پاک تیرا کس طرح آوے نظر — تختِ دل جب چھا رہا ہو دیدۂ نمناک پر
یہ دلِ شوریدہ جب سے ساتھ ہے زیرِ زمیں — شورِ محشر ہی رہا قدرت کی مشتِ خاک پر

تجلی جلوہ چاہے تو صفائے سینہ پیدا کر — اگر دیدار کا طالب ہے تو آئینہ پیدا کر

ہے نالۂ شام آتش و آہِ سحر آتش — کیا زیست ہو اپنی اِدھر آتش اُدھر آتش
جز داغ تدارک نہیں اس داغِ جگر کا — آتش کے جلے کو نہ کرے یہ جگر آتش
چاہے کو اگر داغ سے چھاتی کے چھڑا دل — خاشاک کے پہلو میں یہ چھپے آن کر آتش

چل بسے دنیا سے بن دیکھے ترا دیدار حیف — لے چلے حسرت بھرا یہاں سے دلِ افگار حیف
جرم پہ تیری محبت کے ہمیں کرتے ہیں قتل — حفظ جاں کے واسطے گر کیجئے انکار حیف

مرگ پہلی ہی جب تلک آئے فراق — ورنہ کیا جانوں کہ سر پہ کیا بلائے فراق

زخمِ پہلو نے نہ پائی آہ دلِ ناکام تک — حیف پہنچا ہے نہ اپنا کارِ شوق انجام تک
صبح کے ہوتے ہی ہووے جس کی یہ حالت تباہ — آہ وہ بیچارہ پھر جیوے گا کیونکر شام تک
کر چکا ہے کام اپنا یہاں تو دردِ انتظار — جب تلک پہنچے ہی قاصد اُس بتِ خود کام تک

ہم نہ کہتے تھے کہ قدرت مت چمن کی راہ چل
لے گئی آخر ہوائے گل شکنجِ دام تک

رنگ کچھ اور ہی بدلتا ہے مرا بیتاب دل — ہے گھڑی آتش کا پرکالہ گھڑی سیماب دل

گرے تھے آ کے اس در پہ سمجھ کر اپنا مامن ہم — اگر تو ہے نہیں راضی تو جاویں آہ کس کن ہم

ہوا یوں پھر گئی اس بزم کی اپنے نصیبوں سے
گنے جاتے ہیں اور سب دوست تیرے ایک دشمن ہم

شبِ ہجراں کو قدرت اس طرح ہم روز کرتے ہیں
کبھی سر کو پیٹتے ہیں کبھی کرتے ہیں شیون ہم

جوں نقشِ قدم ہیں ترے کوچے خاک نشیں ہم
تا مٹ نہ چکیں آپ سے چھوڑیں نہ زمیں ہم

نسبت ہے ہماری تری جوں سایۂ خورشید
جس جا نہیں تو ہم ہیں جہاں تو ہے نہیں ہم

گئے وہ دن کہ پلک مارتے یاں دریا بہے
اب بصد خونِ جگر چشم کو تر کرتے ہیں

تیرے جاں سوختہ خورشید قیامت کے تئیں
ہر سحر پنبۂ ناسورِ جگر کرتے ہیں

بھیج مت پنبۂ ناسور تو قدرت کے حضور
یہ علاج اور ہی زخموں پہ اثر کرتے ہیں

ابرو ترے کہتے ہیں کہ میں تیغِ دو سر ہوں
عاشق کا یہ دعویٰ ہے کہ میں سینہ سپر ہوں

شایستۂ دنیا نہ سزاوار ہوں دیں کا
اے وائے میں قدرت نہ ادھر ہوں نہ اُدھر ہوں

دل سے کہا سناں نے کہ سینہ میں یاں رہوں
ناوک یہ پوچھتی ہے بھلا میں کہاں رہوں

قدرت بزیرِ خاک بھی آرام کب ملے
یہ درد و داغ ساتھ ہی میرے جہاں رہوں

آگ اُس داغ کو لگیو کہ نمک سود نہیں
پھوٹے وہ آنکھ جو لختِ جگر آلود نہیں

مرحبا آتشِ دوری کہ جلایا ایسا
جل بجھے سر سے لے پاؤں تلک اور دود نہیں

زخم پر زخم لگے تب ہو تسلّیِ دل کی
حوصلے پہ مرے اک زخم کچھ افزود نہیں

شام کو دھوتا ہوں سو خونِ جگر سے آستیں
صبح خوں آلودہ ہے پھر چشمِ تر سے آستیں

تو بھی کم ابرِ بہاری سے نہیں اے چشمِ تر
کر دے اب رشکِ چمن خونِ جگر سے آستیں

لختِ دل اور اشک ہرگز خاک پر گرنے نہ دے
بھر لے اے قدرت تو اس لعل و گہر سے آستیں

جنوں تیرے ناخن مگر گھس گئے ہیں
کہ عقدہ پڑا ہے بکارِ گریباں

ٹپکنے لگے اشک گلگوں مژہ سے
پھر آئی ہے فصلِ بہارِ گریباں

قافلے کے قافلے اس راہ میں جوں نقشِ قدم
ہو گئے پامال تیرے حسرتِ پابوس میں

بہ نہ کر مرہم سے داغِ سینۂ پُر نور کو
کوئی بجھاتا ہے ارے ظالم چراغِ نور کو

داغ نے دل کو مرے تنہا نہ چھوڑا اک دم / زخمِ سینہ سے سدا الفت رہی ناسور کو
تب مزا دیوے گا قدرت زخمِ سینہ پر نمک / دے سرِ ناخن سے پہلے آشتی انگور کو
نہ جا اس بزم سے ہرگز چھٹک مت طرفِ داماں کو / نہ دے برباد اے ظالم غبارِ خاکساراں کو
ہوا دستِ جنوں سے تار تار ازبس کہ پیراہن / گریباں ڈھونڈھتا ہے دامن کو اور دامن گریباں کو

تم نے تو منھ چھپایا اُس زلفِ عنبریں میں / یہ شامِ غم ہماری اب کس طرح بسر ہو

میں رکھا ہے ابرو کماں کے نشاں کو / ہما چھیڑیو مت مرے استخواں کو
گلوگیر ہے یاں تلک ناتوانی / کہ سینہ سے لب تک نہیں رہ فغاں کو
اُڑائی زبس خاک ماتم میں دل کے / کیا ہم نے آخر زمیں آسماں کو

نوحہ کشتی سے خبردار کہ یاں چھاتی ہے / مرہمِ تازہ کہ ناسورِ کہن چھوٹے ہے

کس کی نیرنگی یہ برقِ خاطرِ مایوس ہے / جو شرر دل سے اُٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے
صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یاں سے کر گئے / اب وداعِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے / (قطعہ) کیا ہی ملکِ روم و کیا ہی سرزمینِ روس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے / چل دکھاؤں تو کہ قیدِ آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف / جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے / یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و مکنتِ دنیا سے آج / کچھ بھی ان کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسبیحِ ریا
آجِ رہنِ جامِ مے پھر خرقۂ سالوس ہے

سینہ اُس کا ہی دل اُس کا ہی جگر اُس کا ہے / تیرِ بیداد جدھر رخ کرے گھر اُس کا ہے
لختِ دل نوکِ مژہ پر نہ سمجھ اے ہمدم / تخمِ غم دل میں جو بویا تھا ثمر اُس کا ہے

نہ تھی تابِ نگہ جب لگ گیا وہ دور آنکھوں سے / نہ ہونا چشم کا بہتر تھا ایسی کور آنکھوں سے

جہاں جاوے وہ نورِ دیدہ آنکھوں کے مقابل ہے
جدا ہوتے نہیں جاوے نگہ کو دور آنکھوں سے

زباں قدرت کی ضعفِ ہجر سے ازبس ہے لکنت میں
اشارت بات کی کرتا ہے جوں رنجور آنکھوں سے

کر اقلیمِ قناعت کا سفر تا تجھ پہ روشن ہو
کہ چشمِ مور سے بھی تنگ تر ملکِ سلیماں ہے

لبِ قدرت سے جز فریاد کچھ ریزش نہیں کرتا
یہ کچھ شاعر نہیں ہے اپنے دل کا مرثیہ خواں ہے

نہ واقف کارواں سے ہوں نہ کچھ آگاہ منزل سے
گیا میں وادیٔ الفت کو لے اک جنبشِ دل سے

گئے وے دن کہ بہتے تھے پڑے نالے ان آنکھوں سے
سرِ مژگاں تلک اک اشک لے آتا ہے مشکل سے

کرے تو ذبح جب تک اور کو یہ مفت مرتا ہے
نہ ہو غافل ارے صیاد صیدِ نیم بسمل سے

غنیمت بوجھ ملنے کو کہ یہ عالم اک افسوں ہے
کدھر فرہاد شیریں ہے کدھر لیلیٰ و مجنوں ہے

تو کیا ساماں پوچھے ہے کہ تجھ بن کیونکہ گزرے ہے
یہ سر ہے اور زانو آستیں اور چشمِ پر خوں ہے

آساں نہ کٹے گی یہ جدائی کی جو شب ہے
مشکل ہے قیامت ہے مصیبت ہے غضب ہے

دلِ پر داغ ہے اور حسرتِ پابوسی ہے
دستِ امید ہے اور دامنِ مایوسی ہے

دل گم گشتہ خبردار کہ یاں سینہ میں
تیر بیداد سا اور پئے جاسوسی ہے

دمِ جاں بخش کی اس کے جو پڑی ہے یہ دھوم
لبِ عیسیٰ نے مگر تیری زباں چوسی ہے

جس جگہ جلوہ ترا مایۂ بے ہوشی ہے
یاد میں اپنے اگر ہے تو فراموشی ہے

آہ یہ کون سی منزل ہے کہ رکھتے ہی قدم
نقشِ پا سے مرے سجدہ کو ہم آغوشی ہے

سرگشتہ ترے لئے جہاں ہے
اے خانہ خراب تو کہاں ہے

جو زخم کہ ہو چکے نہ ناسور
وہ زخم نہیں وبالِ جاں ہے

قدرت ٹک کھول چشمِ عبرت
گر فکرِ سراغِ رفتگاں ہے

جو نقشِ قدم ہے اس زمیں پر
آئینۂ حالِ رہرواں ہے

اشک اب آنے ستی کچھ تھم رہے
تختِ دل مژگاں پہ شاید جم رہے

اب تو اس منزل سے نہیں اٹھتے قدم
ہمرہاں آگے چلو تم ہم رہے

ہر آن اک ستم ہی ہر لحظہ ایک جفا ہی — کوچہ ترا ہی ظالم یا دشتِ کربلا ہی
ملتا نہیں کسی سے اس پر ہی کیا مصیبت — یا رب یہ دل ہمارا کس سے جدا ہوا ہی
ہو گرد باد جیدھر ہم کو اُدھر ہے جانا — صحرا میں گمرہوں کا یہ خضرِ رہنما ہے

حرف الکاف

۲۳۱- **کلیم** - دہلوی شیخ محمد حسین - کوئی اضافہ نہیں - علی ابراہیم نے یہ کبھی نہیں لکھا کہ " باوصف اس خوش گوئی کے کلام مشہور بہت کم رکھتا ہے " یہ لطف کا اضافہ ہے - ۵ سطر ۲ شعر

کلیم تخلص شیخ محمد حسین نام شاہ جہان آبادی مشہور سخنور ہے دلّی کا اور قرابتیوں میں میر تقی میر تخلص کے تھا - ایک رسالہ عروض و قافیہ کا اس نے زبان ریختہ میں لکھا ہے - اور فصوص الحکم کا ترجمہ بھی زبان ہندی میں کیا ہے - ایک نثر اور بھی رنگین زبان ریختہ میں ریختۂ قلم معنی رقم رکھتا ہے - لیکن باوصف اس خوش گوئی کے کلام مشہور بہت کم رکھتا ہے - عہد دولت میں احمد شاہ بن فردوس آرام گاہ کے ایام اس کے شعر و شاعری کا تھا اور زمرہ پردازانِ شاہ جہان آباد کے ساتھ ہم صفیر و ہم نوا تھا - چنانچہ دلّی ہی میں اس خرابۂ دارِ فانی سے گزرا اور مقیم بیت المعمور کا شانۂ باقی کا ہوا - صاحب دیوان اور شاعرِ شیریں بیان تھا - یہ اُس کلیم طور سخندانی کے کلام سے ہے:

گو روضۂ رضواں کو میں اک آن میں دیکھا — جب گل کی طرح جھانک گریبان میں دیکھا
لگتی ہے اب تو قلقلِ مینا سے دل کو ٹھیس — وے دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا
قبر میں بھی لئے ہمراہ گیا اپنے کلیم — آہ کیوں دردِ دل اپنا نہ کسی کو سونپا

رکھتا ہے زلفِ یار کا کوچہ ہزار پیچ — اے دل سمجھ کے جائیو ہے راہ مار پیچ
ہو چکا حشر گئی دوزخ و جنت کو خلق — رہ گیا میں ترے کوچے میں گرفتار ہنوز
پوچھ مت غم کی داستاں اے دل — کہ پڑا لوٹ آسماں اے دل
پیری کی بھی سیر کر گئے ہم — اُس پل سے بھی بس گزر گئے ہم
واں غصہ ہوئے رقیب پر تم — یاں مارے ادب کے مر گئے ہم
بات اُس کی زبان پر آئی — پھر خرابی جہان پر آئی
غرورِ حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہنچے — غرض ہم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے
اُس کے ابرو کی اگر تصویر کھینچا چاہیے — اوّل اپنے قتل پر شمشیر کھینچا چاہیے
عرق ہے منہ پہ ترے یا گلاب ٹپکے ہے — عجب ہے مجھ کو کہ شعلہ سے آب ٹپکے ہے
تجھے میں آنکھوں میں کیوں کر رکھوں کہ ہے برسات — پھر ایسا گھر کہ یہ خانہ خراب ٹپکے ہے

رباعی

گلرو تو چمن میں آپ سے نہ گیا — یہ دل بھی گلی سے بے کلی سے نہ گیا
جو کوئی گیا دل کو گیا چھوڑ یہاں — دل سے تو کوئی تیری گلی سے نہ گیا

رباعی

دنیا کے ہاتھ سے جو دل ریش ہیں ہم — اس واسطے یاں عاقبت اندیش ہیں ہم
دنیا داری و نوکری محنت و کسب — جب کچھ نہ بنا کہا کہ درویش ہیں ہم

۲۳۲- کمترین - دہلوی- از منسلکان نواب عماد الملک غازی الدین خاں بود- گفتارش بطور آبرو و طبعش اکثر مایل ہجا بود گویند شہر آشوبی در ہجو ہر قوم گفتہ- چنانچہ چند بیت از اں نگارش می رود- (۳ شعر)

۲۳۳۔ شاہ کاکل دہلوی۔ معاصر آبرو بود۔ ترک نوکری کردہ لباس
فقر در بر نمود و تکیہ در چوک سعد اللہ خان داشت از وست

(۳ شعر)

۲۳۴۔ کافر، دہلوی۔ میر علی نقی۔ اوایل تسکین و جنون تخلص می کرد و آخر بہ سبب
نامقیدی کافر تخلص قرار داد۔ ہر شعرے کہ بر دلش می خورد
می گفت کہ ایں ٹپکہ ست۔ برایں جہت کافر ٹپکہ مشہور شد
مولف اوراق مکرر او را در مرشد آباد دیدہ و اشعارش
شنیدہ است۔ آنقدر مایۂ سخنوری نداشت کہ تعریفش تواں نگاشت

از وست ۲ شعر

۲۳۵۔ گریاں۔ دہلوی میر علی امجد ولد میر علی اکبر۔ از شاگردانِ شاہ
قدرت اللہ قدرت و میر ضیاء الدین ضیاست۔ از وست

(۳ شعر)

۲۳۶۔ گماں۔ دہلوی۔ نظر علی خاں۔ از دوستاں اشرف علی خاں فغاں ست
دریں زماں کہ عہد شاہ عالم بادشاہ ست۔ شنیدہ شد کہ در
فیض آباد بسر می برد۔ از وست۔ (عبداللہ)

۵ شعر

حرف اللّام

۲۲۷- **لطفی** دکھنی۔ از قارما بود۔ این بیت بنام او مشہورست و احوالش معلوم نیست۔

میں عشق کی گلی میں گھائل پڑا ہوں تم پر
جوبن کا ماتا آکر مجھ کو کھندل گیا ہے

۲۲۸- **لسان** - میر کلیم اللہ۔ مشق سخن را آگاہ بود۔ بعہد احمد شاہ بادشاہ ارتحال نمود۔ از وست:

جدا ہو مجھسے مرا یار یہ خدا نہ کرے خدا کسی کے تئیں یار سے جدا نہ کرے

حرف المیم

۲۲۹- **میر**، میر محمد تقی - علی لطف نے بہت اضافہ کیا ہے۔ ان کی پہلے کی صرف آٹھ سطریں علی ابراہیم کا کچھ ترجمہ ہیں۔ علی ابراہیم کے لکھتے وقت (۱۱۹۶) میر دہلی ہی میں تھے تذکرہ لکھ چکے تھے۔

(۱۴ سطر -- ۴۰ ۵ شعر)

میر تخلص، نام نامی اُس نگین خاتم سخن آفرینی کا میر محمد تقی ہے متوطن اکبر آباد کے

سراج الدین علی خاں آرزو تخلص آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دور کے تھے۔ ابتدائے سنِ شعور سے پرورش انھوں نے دارالخلافہ شاہ جہان آباد میں پائی ہے اور خان مذکور کے فیضِ صحبت سے نظمِ ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائی ہے۔ تازگی مضمون کی اور علو معانی کا بیان سے ان کے ظاہر ہے، فی الحقیقت کہ شاعر مذکور لطافتوں سے ریختہ کی بخوبی ماہر ہے۔ جو شخص کہ نظارہ گاہِ سخن میں چشمِ خوردہ بیں رکھتا ہے اور چاشنی خرد سے امتیازِ ذائقۂ تلخ و شیریں رکھتا ہے۔ تو وہ اس بات کو جانتا ہے اور اس رمز کو پہچانتا ہے کہ میر شیریں مقال ہیں، اور ریختہ گویانِ سابق و حال میں، نسبت خورشید و ماہ ہے، اور فرق سفید و سیاہ ہے، بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا۔ غرض اس تردد سے زبان قلم کی اور اس خراش سے عارضِ قلم کی مراد یہ ہے کہ ناقدردانی سے اغنیا کی اور ناسمجھی سے اہلِ دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے اور ہوا شہرستانِ معنی طرازی اس مرتبہ فاسد کہ میر سا شاعر جو کہ سحرکاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے۔ جس ایام میں کہ درخواست صاحبانِ عالی شان کی زبان دانانِ ریختہ کے مقدمہ میں کلکتے سے لکھنؤ کو گئی تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی، لیکن علتِ پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے اور جوانانِ نومشق مربی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبیعتوں سے کبھی نہیں خالی ہے، اکثر اہلِ لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست حمالی ہے، کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہلِ تمیز ہیں کہ آج بھی بوڑھے کے سامنے نوجوان غور کے میں مویز ہیں۔ اب بھی جو بوجھ تمکنتِ معنی کا جز ثقیل طبع سے تراندکر کے وہ دکھلاتا ہے، جوان اگر کوہ بوقبیس ہے تو تحمل سے اُس کے کمر جُھکاتا ہے۔ بہر تقدیر غرض جب میرزا محمد رفیع سودا بلدۂ لکھنؤ میں اس دارِ فانی سے عالمِ باقی کو سدھارے تو میر کو شاہ جہان آباد میں تھے ۱۱۹۷ گیارہ سو ستانوے ہجری میں رایات عزم اس صاحبِ شکر

مضامینِ تازہ کے حرکت میں آئے اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے روزِ ملازمت خلعتِ فاخرہ دیا، اور تین سو روپے مشاہرہ مقرر کرکے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کیا۔ اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا۔ اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہدِ وزارت میں آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ اقسامِ نظم میں یہ صدر نشین بارگاہِ سخندانی ہر قسم چکیدۂ خامۂ معجز نما رکھتا ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظمِ غزل میں یدِ بیضا رکھتا ہے۔ قصیدہ تو ختم میرزا محمد رفیع سودا پر ہوا، ہاں طرزِ مثنوی کی بھی ان کی بہت خوب ہے، خصوصاً دریائے عشق، جو ان کی مثنوی ہے، اک جہان کے مرغوب ہے۔ یہ رہنما قومِ سخن سرمایہ گان کا مالک چار کتاب پر دلیل و برہان ہے۔ یعنی صاحبِ چار دیوان، خوش بندش، خوش بیان ہے۔ مثنویاں بھی متعدد ان سے ثبتِ جریدۂ روزگار ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخبِ افکار ہیں:۔

اس دور میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا

اُمیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یار قیامت کو کیا ہوا

چمن میں گل نے جو کل دعوئے جمال کیا
جمالِ یار نے منہ اُس کا خوب لال کیا

بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
چمن کو یمنِ قدم نے ترے نہال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے حال کیا

بتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

دل کا نہیں ٹھکانا حالت جگر کی گم ہے
تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے
ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے بت خانے
نگاہِ مست نے ساقی کے انتقام لیا

وہ کج روش نہ ملا راستے میں ہم سے کبھو
نہ سیدھی طرح سے اُن نے مرا سلام لیا

پیغام غم جگر کا گلزار تک نہ پہنچا
نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہنچا

اُس آئینہ کے مانند زنگار جس کو کھا جائے
کام اپنا اُس کے غم میں دیدار تک نہ پہنچا

لبریز شکوہ تھے ہم لیکن حضور اُس کے
کار شکایت اپنا گفتار تک نہ پہنچا

یوسف سے لے کے تا گل اور گل سے لے کے تا شمع
یہ حسن کس کو لے کے بازار تک نہ پہنچا

گل کو محبوب میں قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر پڑا جو میر
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

گزرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا
خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں
مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا

یک قطرہ خون ہو کے مژہ سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

سر سے باندھا ہے کفن عشق میں تیرے یعنی
جمع ہم نے بھی کیا ہے سر و ساماں کیسا

دل پہنچا ہلاکت کو بہت کھینچ کسالا
لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ

گزرے ہے لہو واں سرِ ہر خار سے اب تک
جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

دل کے جانے کا نہایت غم رہا
غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

تجھ کو میرے حال سے تھی آگہی
نالۂ شب سب کو خبر کر گیا

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

کالے سرکشاں جہان میں کھینچا تھا ہم نے سر
پایانِ کار مور کا خاکِ قدم ہوا

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کچھ کہ یہاں ہے سو افسوس ہی جوانی کا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

عشق کو حوصلہ ہے شرط ورنہ
بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

جو یہ دل ہے تو کیا سرانجام ہوگا
تہِ خاک بھی خاک آرام ہوگا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے وہ آگے درد تھا

عاشق ہیں ہم تو میرؔ کے بھی ضبطِ عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

خوبی کو اُس کے چہرے کی کب پہنچے آفتاب
ہے اِس میں اُس میں فرق زمین آسمان کا

کام پل میں مرا تمام کیا
غرض اُس شوخ نے بھی کام کیا

تیرے کوچے کے رہنے والوں نے
یہیں سے کعبہ کو سلام کیا

وصفِ خط و خال میں خوباں کے میرؔ
نامۂ اعمال سیہ کر گیا

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

تو اب گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا

مجھے کام ہر دم ہے رونے سے ناصح
مرے مُنھ کو کب تک تو دھوتا رہے گا

مرا خوں تجھ پہ خوں ثابت کرے گا
کنارے بیٹھ کے ہاتھوں کو دھونا

وصیت میرؔ نے مجھ کو بھی کی تھی
کہ سب کچھ ہونا اک عاشق نہ ہونا

کیا بعدِ مرگ یاد کروں گا وفا تجھے
سہتا رہا جفا ہی میں جب تک جیا کیا

مغاں مجھ مست بن پھر قلقلِ مینا نہ ہووے گا
مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

آرام عدم میں نہ تھا ہستی میں نہیں چین
معلوم نہیں میرا ارادہ ہے کہاں کا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں جو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

کس کا کعبہ، کس کا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے تیرے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں بیٹھا رات کو تھا مے خانے میں
جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا

کاش اب برقع منہ سے اٹھاوے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ موندے پر اُن نے گو دیدار کو عام کیا

یہاں کے سفید و سیہ میں دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

زندگانی بھی ایک وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ضعف یہاں تک کھنچا کہ صورت گر
رہ گیا ہاتھ میں قلم لے کر

کام آنے کا نہیں ایک بھی یارہ آخر کار
ہاتھ سے جائے گا سر رشتۂ کار آخر کار

مشتِ خاک اپنی جو پاماں ہے یہاں اس پہ نہ جاؤ
سر کو کھینچے گا فلک تک یہ غبار آخر کار

میرؔ گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک
جس کی لے دام سے تا گوشِ گل آواز ہے ایک

ناتوانی سے نہیں بال فشانی کا دماغ
ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک

گوش کو ہوش سے ٹک کھول کے سن شورِ جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل
اک مشت پر پڑے تھے گلشن میں جائے بلبل

سیر کر عندلیب کا احوال
ہیں پریشاں چمن میں کچھ پر و بال

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں
وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں

بے قراری جو کوئی دیکھے ہے کہتا ہے یہی
کچھ تو ہے میرؔ کہ اک دم تجھے آرام نہیں

چلا نہ اٹھ کے وہیں پھر تو چپکے چپکے میرؔ
ابھی میں اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہو کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں

ناز بتاں اٹھا چکا دیر کو میرؔ ترک کر
کعبے میں جا کے بیٹھ میاں تیرا اگر خدا نہیں

گردش فلک کی کیا ہے جو دور قدح میں ہوں
دیتا رہوں گا چرخ مدام آسماں کو میں

عاشق ہے یا مریض ہے پوچھو تو میرؔ سے
پاتا ہوں زرد روز بروز اس جواں کو میں

صد تمنائے یار رکھتے ہیں
تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں

پھیر کرتے ہیں میرؔ صاحب عشق
ہیں جواں اختیار رکھتے ہیں

دن گزرتا ہے مجھے فکر ہی میں تا کیا ہو
رات جاتی ہے اسی غم میں کہ فردا کیا ہو

خاک میں لوٹوں کہ لوہو میں نہاؤں ہوں میرؔ
یار مستغنی ہے اس کو مری پروا کیا ہو

عشق کو نفع نہ بیتابی کرے ہے نہ شکیب
کرے تدبیر جو یہ درد وہ دوا رکھتا ہو

ہائے اے زخمی شمشیر محبت کا جگر
درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

یارب کوئی ہو عشق کا بیمار نہ ہووے
مرجائے وے اس کو یہ آزار نہ ہووے

زنداں میں پھنسے طوق پڑے قید میں مرجائے
پر دام محبت میں گرفتار نہ ہووے

اس واسطے کانپوں ہوں کہ ہے آہ بہت سرد
یہ باؤ کلیجے کے کہیں پار نہ ہووے

مانگے ہے دعا دیکھ مجھے خلق یہ ظالم
یارب کسی کو اس سے سروکار نہ ہووے

صحرائے محبت ہے قدم دیکھ کے رکھ میرؔ
یہ سیر سر کوچہ و بازار نہ ہووے

جو دے آرام ٹک آوارگی میرؔ
تو شام غربت اک صبح وطن ہے

عشق میں بے خوف و خطر چاہیے
جان کے دینے کو جگر چاہیے

قابل آغوش ستم دیدگاں
اشک سا پاکیزہ گہر چاہیے

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

نہیں وسواس جی گنوانے کا — ہائے رے ذوق دل لگانے کا
دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا — اور بھی وقت تھا بہانے کا

اب جو اک حسرتِ جوانی ہے — عمرِ رفتہ کی یہ نشانی ہے
اُس کی شمشیر تیز ہے ہمدم — مر رہیں گے جو زندگانی ہے
یاں ہوئے میرؔ ہم برابر خاک — واں وہی ناز و سرگرانی ہے

ادا کھینچ سکتا ہے بہزاد اُس کی — وے تصویر کھینچے گا یہ ہم نے مانی

گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی — رشک سے جلتے ہیں یوسف کے خریدار کئی

کیا حال بیاں کریئے عجب طرح پڑی ہے — وہ طبع تو نازک ہے کہانی یہ بڑی ہے
کیا فکر کروں میں کہ ٹلے آگے سے گردوں — یہ گاڑی مری راہ میں بے طرح اڑی ہے
ہے چشمکِ انجم طرف اُس مہ کے اشارے — دیکھو تو مری آنکھ کہاں جا کے لڑی ہے
وہ دن گئے جو پہروں لگی رہتی تھیں آنکھیں — اب یاں نہیں مہلت کوئی پل کوئی گھڑی ہے
ایسا نہ ہوا ہوگا کوئی واقعہ آگے — اک خواہشِ دل ساتھ مرے جی کے گڑی ہے
جاتے ہیں چلے متصل آنسو جو ہمارے — ہر تار نگہ آنکھوں میں موتی کی لڑی ہے

رباعیات

اب عشق میں میرؔ پاؤں دھرتا ہے گا — سب زیست منغص اپنی کرتا ہے گا
یارو چلو سب چل کے اسے سمجھاویں — افسوس کہ نوجوان مرتا ہے گا

خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے — ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر — مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

اب وقتِ عزیز کو جو یوں کھوؤ گے — پھر سوچ کے غفلت کے تئیں رؤ گے

کیا خوابِ گراں پہ روز و شب مائل ہو　　جا گو ٹک میرؔ پھر بہت سوئے گے

دل غم سے ہوا گداز سارا اللہ　　غیرت نے ہمیں عشق کی مارا اللہ
ہے نسبتِ خاص تجھ سے ہر ایک تئیں　　کہتے ہیں چنانچہ سب ہمارا اللہ

تسبیح کو، توں سنبھالا ہم نے　　خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے
اب آخرِ عمر میرؔ جی کی خاطر　　سجّادہ گرو رکھنے نکالا ہم نے

۲۴۰ **مظہر** جان جاناں - علی لطف نے دوسرا پارہ (پیراگراف) اضافہ کیا ہے
پہلا علی ابراہیم کا ترجمہ ہے - علی ابراہیم نے شہادت کے
قصّہ کو بالکل سادہ الفاظ میں لکھدیا ہے کہ: "گویند بہ سبب
تعصب مذہب منع تعزیہ سید الشہدا علیہ السلام می نمود - بدیں
جہت ز دست یکے از ساکنانِ دہلی سنہ یک ہزار و یک صد و نود و
چہار ہجری کہ عمرش قریب صد بود مقتول شد" (۷ سطر ۸ شعر)

مظہر تخلص، میرزا مظہر جان جاناں کر کے مشہور تھے - مشہور سخنوروں میں دلّی کے نظم و نثر ریختہ میں نہایت خوش بیان اور انداز گفتگو میں نادر زبان تھے - اصل وطن ان کا اکبر آباد ہے اور دلّی ان کے نشو و نما کی بنیاد ہے - قناعت اور استغنائے طبیعت کے ساتھ مشہور اور علم و عمل سے فقہ کے معمور تھے - حسن پرستی سے دل بستگی تمام رکھتے تھے اور عشق حقیقی و مجازی سے کام - انعام اللہ خاں یقینؔ اور فقیہ صاحب درد مندانِ کے شاگردانِ رشید سے کہاتے ہیں اور میر عبد الحی تاباںؔ تخلص بھی علی ہذا القیاس اسی طرح گنے جاتے ہیں -

کہتے ہیں کہ ہفتم روز عاشورہ کو لبِ بام یہ اپنے گھر میں سرِ راہ بیٹھے تھے اور کوئی سردار رہیلوں کا بھی آیا تھا واسطے ان کی ملاقات کے، کہ ناگاہ گزر شدّوں کا ان کے زیرِ بام سے ہوا۔ اُس روہیلے نے کھڑے ہو کر سینہ زنی بھی کی، اور مواقف سلام سے ہوا اور میرزائے مذکور جس طرح بیٹھے تھے اُسی طرح بیٹھے رہے، بلکہ متبسّم ہو کے فرمانے لگے کہ "بارہ سو برس جس مقدمہ کو ہو چکے ہوں ہر سال اُسے زیادہ کرنا کیا بدعت ہے اور لکڑیوں کو سلام و تسلیم کرنا نہایت عقل کی خفت ہے"۔ یہ گفتگو بجنسہ وہ لوگ جو کہ علم اور شدّوں کے ساتھ تھے اُنھوں نے سُنی اور تعصب کی مرزائے مذکور کے امام باڑوں میں اور محفلوں میں دو تین شب گفتگو رہی۔ آخر شب شہادت کو کہ عبارت شب چہاردہم عاشورہ سے ہے کوئی شخص ان کے دروازے پر آیا اور ان کو باہر بلوایا۔ جب باہر آئے تو بے گفتگو ایک چوٹ طپنچے کی نذر کی اور کام ان کا پورا کر کے نلوہ راہ اپنے گھر کی لی۔ سن بھی ان کا قریب سو برس کے تھا ایسا زخم کاری کھایا۔ لیکن استقلال طبیعت سے پھر اپنے تئیں کوٹھے کے اوپر پہنچایا۔ سنہ ۱۱۹۴ گیارہ سو چورانوے ہجری تھے کہ اُس روشن سازِ مسائلِ صدیقی نے اور اُس مصقلہ پرداز احکامِ فاروقی نے اس آئینۂ زنگار آلودِ دنیا سے مُنہ پھیر لیا اور سفر خلفائے راشدین کے منازل کے طریقت پر کیا۔ یہ اشعار ان کے نتائجِ افکار سے ہیں:

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا — اس قدر جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

نہیں تجھ غم کہ یوں ملتا نہیں ہمایُں گس میرا — کہ میں روتا ہوں دل کی بیکسی پر ہائے دل میرا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار — ہائے کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو کیا ہے کام گلشن سے ولیک — جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

۱؎ کسی نے کیا بے مثل تاریخ آپ کی وفات کی کہی ہے عاش حمیداً مات شہیداً
لطف یہ ہے کہ یہ الفاظ حدیث نبوی ہیں ۱۲۔

مرتا ہوں میر نوائے گل پر میں ہر سحر　　سورج کے ہاتھ چونری و پنکھا صبا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دل نازک کے تئیں مرے　　یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ
خدا کے واسطے ان کو نہ ٹوکو　　یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے　　ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

۲۴۱ - **محقق** دکھنی ظاہرا از قدما بود - این مطلع بطرزِ محاورۂ متاخرین
بنام او منسوب ست :

تم ہر کسی سے وعدۂ دیدار مت کرو　　اپنی زباں سے جھوٹ کا اقرار مت کرو

۲۴۲ - **مزمّل** - محمد مزمل - معاصر شاہ آبرو بود - تخلص او شہرتے دارد -
در دہلی رحلت نمودہ ازوست :

نسیم تن جس کا نام ہوتا ہے　　اُس کو سونا حرام ہوتا ہے

۲۴۳ - **مخلص** - رائے انند رام وکیل نواب اعتماد الدولہ وزیر بود - از تلامذۂ
سراج الدین علی خاں آرزوست - اکثر شعر فارسی و گاہے
ریختہ می گفت ازوست :

آنے کی دھوم کس کی گلزار میں پڑی ہے
ہاتھ ارگجی کا پیالہ نرگس لئے کھڑی ہے

۲۴۴ - **موزوں** - عظیم آبادی مشہور بمہاراجہ رام نارائن از جانب
حکّام بنگالہ نائب صوبہ عظیم آباد بود - و نسبت شاگردی

بہ جناب شیخ محمد علی حزیں داشت۔ اشعار فارسی می گفت
و نثر رنگین می نوشت بعہد دولت نواب عالی جاہ میر محمد قاسم
خاں مرحوم مورد تقصیر شدہ معزول و در گنگا مغروق
گردید گاہے ریختہ می گفت۔ از وست:

ابر تو ہوے خجالت سے پانی پانی
مت مقابل ہو میرے دیدۂ خونبار کیساتھ

۲۴۵۔ منعم برادر محمد قائم، قائم تخلص۔ از مشاہیر سخنوران نیست از وست:

بھولی نہیں ہے مجھکو بتوں کی ادا ہنوز
دل کی نگیں پہ نقش ہے نامِ خدا ہنوز

۲۴۶ میر مدد اللہ۔ ولد میر حمزہ علی از سخنوران زمان محمد شاہ فردوس
آرام گاہ بود و در موسیقی مناسبتے داشت۔ گاہے
ریختہ می گفت از وست: (۳ شعر)

۲۴۷ مضمون شیخ شرف الدین۔ صرف دلّی میں مرنے کا ذکر
لطف کے یہاں زیادہ ہے۔
(۴ سطر ۲۲ شعر)

مضمون تخلص، شیخ شرف الدین نام، متوطن جاجمؤ کے تھے۔ جاجمؤ ایک
قصبہ ہے قصبوں میں سے اکبر آباد کے جس ایّام میں کہ وطن سے اپنے یہ وارد شاہجہاں آباد
میں ہوئے تھے، تو زینت المساجد میں آن کر اُترے تھے۔ طور ان کی بود و باش کا

پھر وہیں رہا ہے اور اتفاق اصلاح کا سراج الدین علی خاں آرزو سے ہوا ہے۔ ازبسکہ شیخ مذکور علّت سے نزلہ کے مُنھ میں ایک دانت نہیں دھرتے تھے تو خان آرزو انھیں شاعر بیدانہ کہا کرتے تھے۔ دلّی میں نظم وجود کو انھوں نے ناموزوں بوجھا ہے اور مضمون عالی انھیں سیرِ وجود کا وہیں سوجھا ہے۔ بیشتر حسن ان کے کلام میں ایہام کا ہے۔ یہ منتخب ان کے کلام کا ہے؛

افسوس مار جھٹ پٹ دل کو رکھے ہیں اٹکا — کس ساحروں سے سیکھا زلفوں نے تیری لٹکا

خوبوں کو جانتا تھا گرمی کریں گے مجھ سے — دل سرد ہو گیا ہے جب سے پڑا ہے پالا

نہیں ہے زاہدوں کو مے ستی کام — لکھا ہے اُن کی پیشانی میں سرکا

ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا — صبرِ ایوّب کیا گریۂ یعقوب کیا

کوچے میں بے وفا کے مارے گئے ہیں عاشق — نکلا ہے ایک مضموں بھاگوں سے اپنے جیا

ترا مکھ ہے سرچشمۂ آفتاب — نہ لاوے ترے حسن کی ماہ تاب

جس طرح سے رہے ہے مال کے اوپر کالا — یوں رہے زلف ترے مُنھ کے اوپر مار کے پیچ

گر یہی دار ہے کامل کو سرتاج — ہوا منصور سے یہ نکتہ حل آج

ایک تو تھا ہی وہ مہ رو خود پسند — ہو گیا آرسی کے تئیں دیکھ دوچند

تجھ بن زبس کہ پانی جاری کئے ہیں رو کر — چشموں سے میں اب اپنے بیٹھا ہوں ہاتھ دھو کر

تیرِ مژگاں برستے ہیں مجھ پر — آبِ پیکاں کا اس طرف ہی ڈھال

کیفی ہو کر جو مجھ سے رہا ہے وہ شوخ — جو پوچھتا ہوں بات تو کہتا ہے چل بچل

احوال پیش دلبر کچھ مت کہو ہمارا — آتا ہے نام میرا سُن کر اُسے پسینا

شرم سے پانی ہو جاویں سب رقیب — جو مرا یوسف نکلے آ چاہ سے

وہی دلدار خوش آتا ہے جو ہووے بانکا — خوب لگتی نہیں وہ تیغ جو خمدار نہیں

کیا ہوا جو خط مرا پڑھتا نہیں — جانتا ہے خوب وہ مضمون کو

اُس دہاں ہیچ سخن رکھتا ہوں ——— مجھ پہ اس بات کو اثبات کرو
جب سے چاہا ہے ترا چاہِ ذقن ——— آب چشموں سے مرے جاری ہے
نظر آتا نہیں وہ ماہ رو کیوں ——— گزرتا ہے مجھے یہ چاند خالی
چلا کشتی میں جب آگے سے وہ محبوب جاتا ہے ——— کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے
یہ اشک آنکھوں میں قاصد کس طرح یک دم نہیں تھمتا ——— دلِ بیتاب کا شاید لئے مکتوب جاتا ہے
مرے آئینۂ دل سے ترا نقش ——— جو دیکھا تو کسی صورت نہ جائے
مضمون تو شکر کر کہ ترا نام سن رقیب ——— غصّے سے بت سا ہو گیا لیکن جلا تو ہے

۲۴۸ - **محزون**، مولوی سید محمد حسین از سادات موسوی و عمدۂ تلامذہ مولوی محمد برکت مرحوم ست ۔ از مدتے ترک موطن خود نمودہ در الہ آباد سکنے گزیدہ ۔ راقم آثم میرزا کو را دیدہ ۔ بغایت سنجیدہ اطوار و گرم جوش دخویش تقریرہ بربا دبار یافتہ۔ در نظم فارسی و ریختہ طبع موزونی داشت ۔ ایں ازاں والا تبار ست (۱۰ شعر)

۲۴۹ **محسن** ۔ اکبر آبادی ۔ محمد محسن برادر زادہ میر محمد تقی میر واز خویشان و تربیت یافتگان سراج الدین علی خاں آرزو ست ۔ در نیولا کہ عہد شاہ عالم بادشاہ است در سرکار نواب سالار جنگ انسلاک دارد از وست :

(۴ شعر)

۲۵۰۔ مستمند، دہلوی۔ شاگرد فقیہ صاحب درد مند۔ در عظیم آباد و مرشد آباد می گزراند۔ این خاکسار او را ندیدہ۔ اشعار او را از بیاضے رقمے کردہ از وست: (۷ شعر)

۲۵۱۔ مخلص۔ مرشد آبادی مخلص علی خاں۔ لطف نے صرف سنہ وفات کا اضافہ کیا ہے۔ (۵ سطر ۵۰ شعر)

مخلص تخلص۔ مخلص علی خاں نام، بھانجے نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ کے ساکن مرشد آباد۔ میر باقر کر کے مشہور تھے۔ جوان خندہ رو اور کشادہ پیشانی، ہمیشہ خوش وقت اور خوش زندگانی بنگالے میں بہت کیفیت کے ساتھ انھوں نے گزر کی ہے، اوقات بیشتر عیش و کامرانی میں بسر کی ہے، شب و روز عیش و عشرت سے کام تھا، اور رات دن وقفِ احباب گردنِ صراحی اور لبِ جام تھا۔ زبانِ ریختہ میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ چنانچہ دیوان بطور اساتذہ ترتیب بھی دیا ہے۔ لیکن کثرتِ عیش سے ازبسکہ دھیان رہا کہیں کا کہیں ہے، کلام ان کا خالی لغزش سے نہیں ہے شاید سنہ ۱۲۰۷ بارہ سو سات ہجری میں بلدۂ مذکور کے اندر دام ہستی کی کشاکش سے رہائی پائی ہے، اور سیر چمنستانِ عدم کی عین تعیش میں فرمائی ہے۔ یہ اشعار اس ستودہ کردار کے ہیں ؎

مدِ بسم اللہ ابرو ہے رخِ عنوان کا
حسنِ معنی کیوں نہ مفتوں ہو مرے دیوان کا

اب ٹک تو اس کو آکے جفا کار دیکھنا
مرتا ہے کوئی دم میں گرفتار دیکھنا

ہمارے قتل کرنے سے تجھے آرام کیا ہوگا
میاں اس ظلم کا تو ہی سمجھ انجام کیا ہوگا

بدی میں یاں تلک مشہورِ دنیا ہی مرا مخلص
پھر اس بدنام سے آگے کوئی بدنام کیا ہوگا

ہاتھ ملتا ہے کہ میرے دل کے ہوتے حیف ہے
کیوں کفِ پا ہیں ترے رنگِ حنا سے آشنا

یہ پوچھو خضر اسمٰعیل سے گر تم نہیں واقف
حیاتِ جاوداں بہتر ہے یا سر کو فدا کرنا

ترکِ الفت یہ بتوں کی مجھے مقدور نہ تھا
ورنہ کعبہ مرے بت خانہ سے کچھ دور نہ تھا

مخلص کیا دریافت یہ ہیں سنگِ محک سے
جو عیب کسی کا کہے منہ اُس کا ہو کالا

آخر یہ دل ہمارا کچھ داد کو نہ پہنچا
جز نالہ کوئی اس کی فریاد کو نہ پہنچا

ہو گئے داغ نمک دان مرے اے کانِ نمک
جب ستی لب کا ترے شور پڑا کان میں آ

اگر یاد کر ہوے لب کو ترے
نہ ہو مست کو یہ خمارِ شراب

زخمِ دل سینے کو کہتا ہے مرے کام آتا
باقی رہتا جو کوئی تار گریبان کے بیچ

گئے یہ بال و پر برباد صیّاد
قفس سے اب نہ کر آزاد صیّاد

دیکھیو نرگس نہیں پھولی یہ باغ و دشت میں
دور سے آنکھیں خزاں کے تئیں دکھاتی ہے بہار

دل خستہ و سودا زدہ تدبیر ہے نازک
دیوانہ زبردست اور زنجیر ہے نازک

محبت میں تری جا کر پھنسا دل
دریغا ہائے دل واحسرتا دل

تھی یہ خوشی کہ ہوگا مرے دل کا غم تمام
وہ تو ہوا نہ کم یہ ہوئے ہائے ہم تمام

کیوں عبث میں علاجِ داغ کروں
خانۂ دل کو بے چراغ کروں

کیوں نہ ہر دم مری آنکھوں سے چوئے ہائے لہو
داغ ایسا نہیں کوئی دل میں جو ناسور نہیں

منظور بندگی مری ہو تجھ کو گو نہیں
میں دست کش ہوں تجھ سے یہ ہوتا ہی سو نہیں

ملی جب غنچے لب سے آنکھ تو نے صحنِ گلشن میں
شگفتہ ہو گئیں گلزار میں نرگس کی سب کلیاں

کیوں کیا جھاڑ کے نوبت غبارِ دامن
کچھ نہ اتنا تھا میاں وہ ترا بارِ دامن

نہ لی آخر خبر اس نیم بسمل کی کبھی تو نے
تجھے صد آفریں صیّاد یوں ہی صید کرتے ہیں

جن کو دولت ہی شہادت کی تمنا مخلص
تیغِ بیداد کو وہ بالِ ہما کہتے ہیں

گرم جوشی سیتی مخلص سے ملے ہی جب یار
رشک سے اُس کے رقیبوں کے جگر جلتے ہیں

ستم سے ترے آشنا کم رہے ہیں
نہیں ہیں کہ اب تک کہ یہاں تھم رہے ہیں

کہتے تو ہو ملنے کی آتی ہیں ہمیں گھاتیں
جھوٹے ہو میاں تم تو کہنے کی ہیں یہ باتیں

روتے روتے جو کبھی ہوش میں آجاتا ہوں
شرم سے اپنے میں جیسے کہ موا جاتا ہوں

اُس کے یہ ظلم و ستم کچھ نہ کیے جاتے ہیں
نہ ہمیں چھوڑے بنے ہے نہ سہے جاتے ہیں

کہتا ہے تو جو ہر دم شمشیر ہے اور میں ہوں
یہ طشت ہے اور سر ہے تقصیر ہے اور میں ہوں

مخلص ترے کے یار بہت ہیں گے مشتری
تم بھی اگر ہو اُس کے خریدار کچھ کہو

آئینہ رو کے دل میں کوئی راہ کیا کرے
دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کرے

عاشق سوائے رونے کے اور کام کیا کرے
جس کا جلا ہو دل سو وہ آرام کیا کرے

قاصد کو دیکھ دور سے دیتا ہے گالیاں
ایسی پری کو پھر کوئی پیغام کیا کرے

مرے دل میں اتنا بسا آکے تو ہے
مجھ کو پڑی اپنی اب جستجو ہے

ڈرتا ہوں محبت مری اظہار نہ ہووے
کہ مجھ سے کہیں آزردہ وہ دلدار نہ ہووے

دل کو مرے ہرگز کبھی آرام نہ ہووے
آغوش میں میرے جو دل آرام نہ ہووے

یہ مشتِ خاک اُڑ جاتی ہی جب مخلص سے ملنے کو
بگولے آگے آتے ہیں اسے لینے کو ہاموں سے

کیونکہ ہووے گی زندگی اب آہ
دل کی نوبت تو جان پر آئی

نہیں یک دل سلامت اس میں پایا
شکن اس زلف کی کیا دل شکن ہے

چمن میں قد نے ترے طرح جلوہ جب ڈالی
نہال و گل نے کہا "ظلّہ العالی

ڈرتے ہو دامن آہ کے شعلہ سے جل نہ جائے
عاشق کی خاک پر نہیں آتے میاں کبھی

کوئی اپنے اسیروں سے تغافل یوں بھی کرتا ہے
قفس میں مر گئے ہم یہ خبر صیّاد کو پہنچے

سحر روتے لہو اور کرتے شام آہِ رسا گزری
کبھی تو نے نہ پوچھا آہ اس مخلص پہ کیا گزری

مخلص سا وفادار کوئی ہم نے نہ دیکھا
اس طور کا بندہ نہیں ہوتا ہے خدا دے

رباعیات

رہتا ہے غضب مجھ پہ تو ہر شام و پگاہ　　کرتا ہے تو ثابت مری گردن پہ گناہ
تمہید نہیں اتنی بھی ظالم درکار　　مطلوب اگر سر ہے مرا بسم اللہ

ناصح میں عجب دیکھی مروت تیری　　عاشق کے ستانے میں ہے رغبت تیری
دل غم سے نہیں بھرا ہے اتنا میرا　　جو اس میں سماوے یہ نصیحت تیری

۲۵۲ - **مایل**، دہلوی، محمدی - دریں زماں کہ عہد شاہ عالم بادشاہ است
در مرشد آبادمی گزراند ازوست: ۲ شعر

۲۵۳ - **مایل**، عظیم آبادی - میر ہدایت علی - سیاحت بلاد دکن نمودہ واز
ایام صبا الیٰ یومنا ہذا مایل ریختہ گوی بودہ - گویند بسیار شاغل
بہ عشق مجازی ست - بدیں جہت مایل بتامل بتکمیل ایں فن
نمی شود - بمتانت و سلامت طبع انصاف دارد ازوست ا ۱ شعر

۲۵۴ - **مسکین**، عظیم آبادی - لالہ تخلص گویند اشعار بسیار گفتہ - اما نصیبہ از
تحسین نیافتہ ازوست:

روئے زمیں پہ جتنے بے یاد حق ہیں پھرتے
وے آدمی نہیں ہیں مٹی کی مورتیں ہیں

۲۵۵ **منتظر**، الہ آبادی - خواجہ بخش اللہ گویند - درسال یک ہزار و یک صد
و نود ہجری بہ عظیم آباد آمدہ، باز بموطن خود رفت سلیم الطبع و

درد مند و خلیق بود از دست : ۳ شعر

۲۵۶۔ **مرزائی** ۔ محمد علی خاں ولد نعیم اللہ خاں از مکان و منسلکان وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بود۔ طبع موزوں و مناسبتے در موسیقی داشت۔ از دست : ۲ شعر

۲۵۷۔ **مخلص**، بدیع الزمان خاں۔ بحسن صورت و سیرت موصوف۔ در سرکار نواب شجاع الدولہ وزیر منسلک بود۔ گاہے ریختہ منظوم می نمود از دست :

۲۵۸۔ **محشر**، موطنش کشمیر و مسکنش لکھنو ست طبع موزونے دارد از دست :

۲۵۹۔ **مفتول**، الہ آبادی۔ کاظم علی ۔

۲۶۰۔ **مجذوب**، دہلوی۔ مرزا غلام حیدر۔ بہت زیادہ اور اہم اضافہ کیا ہے۔ ۳ سطر ۲ شعر

مجذوب تخلص، میر غلام حیدر نام۔ شاہ جہاں آبادی۔ بیٹا سرتاج شعراے بلند مقام، میرزا رفیع سودا شاعر شیریں کلام کا ہے۔ آشنا پرستی اور یک رنگی کے ساتھ موصوف، دردِ دل اور گداز طبیعت میں مشہور و معروف۔ نظم ریختہ میں صاحب دیوان ہیں اور حسن ترکیب میں ناظم رنگین بیان۔ تلاش سے معنی تازہ کے حتی الامکان نہیں گزرتے ہیں، اور باندھنے سے مضامین مشہور کے حتی المقدور کنارہ کرتے ہیں۔ دو دیوان جواب میں میر تقی میر کے انھوں نے کہے اور مقدور بھر سرانجام جواب سے غافل نہیں رہے۔ غرض بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں ساتھ عسرت معاش کے لکھنؤ میں جیتے ہیں مصرع لختِ دل کھاتے ہیں اور خونِ جگر پیتے ہیں۔

یہ منتخب افکار اس ستودہ اطوار کا ہے:

خوباں سے جو دل ملا کرے گا | دھڑکا ہے یہی کہ کیا کرے گا
عداوت سے تمھاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں | بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں
نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی | تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں
آوے ہی مسیحا مرے بالیں پہ تو کیا ہو | بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو
اشک آنکھ میں ہو عشق سے تا دل میں غم رہے | یہ گھر ہے وہ خراب کہ آتش میں نم رہے
چھوٹے اگر قفس سے تو خاموش ہم صفیر | صیاد نے سنا یہ ترانا تو ہم رہے

۲۶۱ - **محترم**، دہلوی۔ خواجہ محمد محترم برادر خواجہ محمدی خاں مرحوم در عالم محبت یکتا و بموزونیِ اشعار طبعش رسا بود۔ در مرشد آباد از منسلکان عالی جاہ نواب میر محمد قاسم خاں مرحوم بود۔ از دوستان معارف آگاہ شاہ گھسیٹا و راقم آثم ست۔
(۲ شعر)

۲۶۲ - **مضمون**، سید امام الدین خاں۔ پدرش سید معین الدین سرجوگی رسالہ والا شاہی بود۔ (۲ شعر)

۲۶۳ - **مصحفی** - بہت زیادہ اور بہت اہم اضافہ کیا ہے۔ (۳ سطر - ۱۲ شعر)
مصحفی تخلص غلام ہمدانی نام ساکن امروہے کا۔ اپنی قوم کا اشراف ہے، سچ تو یہ ہے کہ گفتگو اس کی بہت صاف صاف ہے، بندش نظم میں اس کے ایک صفائی و شیرینی ہے اور معنی بندش میں اس کے بلندی اور رنگینی۔ ایک مدت شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد سلطنت میں مقیم شاہ جہاں آباد کا رہا ہے۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ایک

چودہ برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے، ضیق معاش تو وہاں ایک مدت سے نصیب
اہلِ کمال ہے، اسی طور پر درہم برہم اُس غریب کا بھی احوال ہے۔ دیوان اس عزیز کا
بھرا ہوا نظم کے جمیع اقسام سے ہے۔ یہ اس کے منتخب کلام سے ہے:

پیری میں اور بھی ہوئے غافل ہزار حیف — بے اختیار لے گئی ہم کو یہ خوابِ صبح

ہوئی ہے بسکہ یہ فصلِ بہار دامن گیر — چلیں چمن سے تو ہوتا ہے خار دامن گیر

سمجھ کے رکھیو قدم دل جلوں کی تربت پر — مبادا ہو کوئی تیرا شرار دامن گیر

آگیا خط پہ سرِ مو نہ گیا ناز ہنوز — ہے اسی ڈھب پہ نگاہِ غلط انداز ہنوز

ایک دن رو کے نکالی تھی وہاں کلفتِ دل — اب تلک دامنِ صحرا ہے غبار آلودہ

زبس آئینہ رو ہے طفلِ حجّام — نہیں بن دیکھے اُس کے دل کو آرام

جو دیکھیں انگلیاں وہ گوری گوری — بنا خورشید پانی کی کٹوری

وہ جس کے روبرو ناگاہ آیا — اُسے حیرت نے آئینہ دکھایا

ملا جب آئینہ کو ایسا نائی — بنائی چارہ ابرو کی صفائی

نہ کھینچے خامہ مو اُس کی تمثال — کہ وہ ہے عاشقوں کی ناک کا بال

سُنے ہے مصحفی اب تو بھی فی الحال — منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

۲۶۴ - **محب** - دہلوی شیخ ولی اللہ از شاگردان مرزا محمد رفیع سودا
و دوستان مہربان رندست۔ شنیدہ شد در فرخ آباد بسر می برد
از وست۔ ۲ شعر

۲۶۵ - **منشی** - غلام احمد از تلامذہ مرزا مظہر جانجاناں اصلش قصبہ دادری
از مضافات سرکار نارنول ست۔ پیشتر واقف تخلص داشت،

طبعش در نظم فارسی در ریختہ رسا و نثر را زیبا می نویسد
از وست ؛ (۲ شعر)

۲۶۶۔ **مجروح** ۔ منشی کشن چند۔ اصلش کشمیر و مولدش ہند ست از تربیت یافتگان مرزا مظہر جان جانان ست۔ الحال کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجری ست۔ در لکھنؤ بعزت می گزراند
از وست۔

۲۶۷۔ **محنت**، دہلوی۔ مرزا حسین علی بیگ ابن مرزا سلطان بیگ باشندہ مغل پورہ شاہ جہاں آباد۔ (۱۰ شعر)

۲۶۸۔ **مروت**، سنبھلی خلف شیخ محمد کبیر طبیب از منسلکانِ نواب فیض اللہ خاں و شاگردانِ جرأت تخلص ست الحال کہ سنہ ۱۱۹۶ ہجری باشد شنیدہ شد کہ در رام پور می گزراند از وست ؛

۲۶۹۔ **محبت**۔ نواب محبت خاں .... آخر میں کچھ اضافہ ہے لیکن یہ چھوڑ دیا ہے کہ :

"در لکھنؤ اقامت و مراسلہ با راقم وارد۔ چنانچہ در کمال محبت اشعار خود با مثنوی موسوم باسرارِ محبت کہ حکایت عشق .. .. .. فرستادہ" (۱۰ سطر، ۷۰ شعر)

محبت تخلص، نواب محبت خاں نام۔ خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ہیں، حسب و نسب کی طرف سے کثرت شہرت کے باعث نہیں محتاجِ بیان کے ہیں جوان خوش ظاہر و خوش رو ہیں، اور خوش اختلاط و خوش خو حسن خلق سے معمور اور مروت

جواں مردی کے ساتھ مشہور۔ فقط خوش مزاجی خلقی کے باعث انھوں نے شیوہ سخنوری کا اختیار کیا اور خوش استعدادی طبعی کے سبب طبع بیگانہ خو کے تئیں لطافت معنی سے یار کیا جمیع اقسام نظم میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور اصلاح سخن کی میرزا جعفر علی حسرت تخلص سے لی ہے۔ معاصرین اپنے میں مشہور ہیں ساتھ خوش بیانی کے، اور روشن طبیعتوں میں شہرت رکھتے ہیں ساتھ روشن زبانی کے۔ قصہ سسی پنو کا فرمانے سے ممتاز الدولہ مستر جانسنین بہادر کے انھوں نے نظم کیا ہے اور نام اس مثنوی کا اسرار محبت رکھا ہے۔ بعد نواب حافظ رحمت خاں کی شکست کے، جو لکھنؤ میں آئے، تو اسی ایام سے بس طور بود باش کی وہیں ٹھیرائی۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت اعزاز و اکرام کیا تھا، اور مشاہرہ بھی معقول کر دیا تھا۔ بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، اُسی شہر میں بود و باش رکھتے ہیں، اور مضامین تازہ کی ہمیشہ تلاش رکھتے ہیں۔ دیوان ان کے نظم کے سب اقسام ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب کلام ہیں:

جب تلک وہ بتِ خود کام نہیں آنے کا
دلِ بیتاب کو آرام نہیں آنے کا

مجھ کو خطرہ ہے خدا یہ نہ کرے جو اس کا
دیوے قاصد کہیں پیغام نہیں آنے کا

کیا خوشی کیجئے یار کہ وہ خورشید لقا
صبح آوے گا تو پھر شام نہیں آنے کا

کوئی ڈھب بھی تجھے آتا ہے وفاداری کا
یا کہ سیکھا ہے یہی شیوہ ستم گاری کا

دیکھا اک جھڑکی میں اے یار کوئی بھی ٹھہرا
کیا ہی اغیار کو دعویٰ تھا تری یاری کا

قید ہو بیٹھے ہوا دو بوں جہاں سے آزاد
میں تو بندہ ہوں محبت کی گرفتاری کا

دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ اے صبا تک
میرا غبار کیجو برباد اس طرح کا

مذکور جو محفل میں ہوا دوش کسی کا
سنتے ہی ٹھکانا نہ رہا ہوش کسی کا

شب کہ مجلس بیچ وہ غارت گرِ ہر خانہ تھا — تھے جو باہم آشنا ایک ایک سے بیگانہ تھا

جس گھڑی گل رو مرے تو جلوہ فرمانے لگا — غنچۂ تصویر بھی خجلت سے مرجھانے لگا
یہ بڑھا دیوانہ پن اپنا کہ ناصح دل ہوا — تھا مرا ہمدرد لیکن مجھ کو سمجھانے لگا

عاشقوں میں مجھے لکھا تو نے — آج چہرہ مرا بحال ہوا
تری گلی سے دل افگار جو گیا سو گیا — عدم کے کوچہ سے اے یار جو گیا سو گیا
تو اُس کے گھر کو تو ہنستا ہوا چلا اے دل — یہ ہے وہ قہقہۂ دیوار جو گیا سو گیا

دل جو جاتا ہے چلا جائے کہیں مجھ کو کیا — اُس کی رسوائی کو کہتا ہوں نہیں مجھ کو کیا
چشمِ حیراں سے کہاں دل کو ملے لذتِ دید — مری آنکھیں جو تجھے دیکھ رہیں مجھ کو کیا
منزلِ اول ہے ابھی عشق کی اے تاب و تواں — چھوڑ جاتے ہو تم افسوس نہیں مجھ کو کیا

دل دیں گے رونمائی دستور ہے ہمارا — کیا کیجئے یہی کچھ مقدور ہے ہمارا
اللہ رے تکبر سنتا نہیں سخن بھی — یہاں تک وہ بت عزیز و مغرور ہے ہمارا
جاتے ہیں جلد پہنچنے توسن کو عمر کے ہم — کیا کیجئے محبت گھر دور ہے ہمارا

غیر کو یاد تو زنہار نہ رکھ اے پیارے — بھول جا مجھ کو بھی لیکن یہ مری بات نہ بھول

دید زمانہ کرتے ہیں ہم چشم خانہ میں — اُڑتا ہے اپنا مرغِ نگہ آشیانے میں
دل خشک ہو کہاں ہے بہیں اشک چشم سے — فوارہ تب چھٹے جو ہو پانی خزانے میں

نزع میں دم ترے پاس آنے کا ہم رکھتے ہیں — دم میں دم جب تک اپنے ہے یہ دم رکھتے ہیں
آپ کچھ غیر دل کو چھپ چھپ کے رقم کرتے ہیں — یہ جو جھوٹ ہووے تو ہم ہاتھ قلم کرتے ہیں

سرخئ اشک کبھی اور کبھی زرد ہے رو — تو نے اے عشق عجب رنگ دکھایا مجھ کو
بیٹھنے دیوے نہ وہ بزم میں اپنے جو مجھے — تو اُٹھا لیجیو اے بارِ خدایا مجھ کو

ساقی ہمیں گھٹا جو برستی نظر پڑی ۔ یاد آئی ہے وہیں وہیں مستی نظر پڑی
بوسے کی بھی عوض نہ خریدی یہ غضب ہائے ۔ اُس کو متاعِ دل مری سستی نظر پڑی
یا تھا فلک پر اُس کا دماغ اب ہی خاک پر ۔ دل کی عجب بلندی و پستی نظر پڑی
تمنا یار سے ہیہات نہ کہنے میں نہیں آتی ۔ غرض یہ کیا کہوں کچھ بات کہنے میں نہیں آتی

مخمس

کون سے روز میں سر سنگ سے مارا نہ کیا ۔ ہجر میں تیرے میں کب جیب کو پارا نہ کیا
پر مرض کا مرے تو نے کبھی چارا نہ کیا ۔ درد دل سے تو میں کس رات پکارا نہ کیا
نہ کیا میری طرف تو نے گزارا نہ کیا

یوں ہی آ نکلے تھے محفل میں تمھارے ہم تو ۔ آپ کے دیکھ چکے سب سے اشارے ہم تو
مر گئے ہائے اسی رشک کے مارے ہم تو ۔ آ لگے گو رکے اس غم سے کنارے ہم تو
تو بھی غیروں سے میاں تم نے کنارہ نہ کیا

وله

ساری شب یہ ہتی ہی مجھ میں اور دلبر میں خوشی ۔ کہ آسے میں جام بھر بھر دوں پیوں وہ مجھ کو کبھی
یک حرفِ ناز اُس کا سُن نہیں رہ جی میں جی ۔ چھیڑتا ہوں جب میں اُس کو تب یہ کہتا ہی ابھی
پاس سے ہم تیرے ان باتوں سے اب اُٹھ جائینگے

مثنوی

کہی القصّہ پھر بندے سے یہ بات ۔ اگر ضائع نہ ہووے اس میں اوقات
تو مضموں کر کے اس قصّہ کا معلوم ۔ یہ ہی مثنو ر کر تو اس کو منظوم

یہ بات اتنے لیے تجھ سے کہی ہے — کہ مشق اس کی بہت تجھ کو رہی ہے

تجھے اس عشق کے ہیں کار معلوم — محبت کے ہیں سب اسرار معلوم

پیا ہے تو نے بھی جام محبت — سراپا تو ہے ہم نام محبت

ترے اشعار سن کر سب سخنداں — محبت کا اسے کہتے ہیں دیوان

سراپا کیا لکھوں اس شمع رو کا — کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سراپا

عیاں یوں موئے سر تھے عنبر آلود — کہ جیسے شمع کے شعلہ پہ ہو دود

دوپٹا چاند تارے کا زری باف — جو اوڑھے تھی کہ اپنی پٹیاں صاف

سماں ہوتا تھا یوں جیسے فلک پر — شب دیجور میں چمکے ہیں اختر

گندھی چوٹی نظر اس شکل آوے — کہ جوں مارِ سیہ لہریں دکھاوے

بہت تھا دلوں کا اس میں مسکن — چھپا ہے کہ اک سانپ اور کئی من

نگہ بر فلک کی اُس جبیں پر — کہ اک ابرِ سیہ جیسے ہو منہ پہ

دو دنداں آب دار اس سیم بر کے — کہ سوراخ ان سے ہیں دل میں گہر کے

کروں کیا خوبیِ لب کی میں تقریر — قیامت اس پہ تھی مسّی کی تحریر

تبسم میں نظر اس رنگ وہ آئے — کہ غنچہ جیسے نافرماں [?] کا کھل جائے

زباں کھولوں اگر وصفِ دہاں پہ — سخن ہو جائے گم میری زباں پر

کوئی [?] کیا کیا جھکاوے عشق آں آہ [?] — جیسے چاہِ زنخ کی اس کے ہو چاہ

نہیں گردن کی کچھ تعریف ہوتی — وہ ہے گویا صراحی دار موتی

حنا سے سرخ تھا یوں پنجۂ ماہ — کہ جوں خوش خط لکھیں سرخی سے اللہ

بھلا دوں کس سے نسبت ان کچوں [?] کو — جو میداں حسن کے سے لے گئی گو

عیاں وہ گلشنِ خوبی میں ہیں یوں | کہ جیسے دو انار اک شاخ میں ہوں
اگر دیکھے انہیں نامرد ذاتی | عجب کیا وہ بھی اپنی کوٹے چھاتی
جو وصف اُس ساقِ سیمیں کا سُنے ہے | یہ حسرت شمع رو رو سر دُھنے ہے
قدِ موزوں وہ اپنا جب دکھا جائے | اور اُس کی فندقِ پا تک نظر آئے
تو حیرت سے ہوں یہ سب کو پہ دیکھے | بنِ شمشاد میں غنچے نہ دیکھے
جھنک خلخال کی تھی کیا قیامت | کہ ہر سو جس سے برپا تھی قیامت
جو ہوٹک فرشِ گُل پہ گرمِ رفتار | رگِ گُل پشتِ پا سے ہو نمودار

٢٧٠ - مرزا - دہلوی معروف بہ نواب مرزا ملقب بہ محمد حسن خاں احترام الدولہ ابن نواب اشرف خاں نواده نواب صمصام الدولہ خان دوران و خواہر زاده سید فضائل علی خاں بقید و برادر کہتر رستم علی خاں رستم تخلص ست کہ در حرف الرا مذکور شد الحال کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجری است در بلدۂ بنارس اقامت دارد۔ اشعار بسیار از افکار خود براقم خاکسار فرستاده ازوست۔ (٢٨ شعر)

٢٧١ - مرزا - دہلوی مرزا علی رضا از قرابتیان نواب حسین الدین خاں نائب جہانگیر نگر ست۔ مدّتے در صوبۂ بہار و بنگالہ گزرانیده الحال کہ سنہ ١١٩٦ ہجری ست در بنارس براقم آثم نموده۔ ایں چند بیت ازاں جملہ ممتاز ست۔

۲۷۲- مجنوں۔ شاہ مجنوں از اولاد رائے بشن ناتھ دیوان محمد شاہ فردوس آرام گاہ است گاہے خاقی و گاہے مجنوں تخلص می کند نسبت شاگردی با میر محمد تقی میر دارد۔ گویند بہ آزادہ حالی سر و پا برہنہ در لکھنؤ بسر می برد راقم خاکسار در ینولا کہ ۱۱۹۶ہجری ست اشعار او را از لکھنؤ طلبیدہ قلمی نمود از وست (۱۰ شعر)

۲۷۳- مجنوں، حمایت علی۔ اصلش دہلی و مسکنش مرشد آباد از شاگردانِ شاہ قدرت اللہ قدرت تخلص است۔ ساقی نامہ بحکم نواب مبارک علی خاں مبارک الدولہ بہادر گفتہ۔ از نظم ریختہ سلیقہ دوستی دارد۔ با راقم آثم آشناست۔ از وست (۷ شعر)

۲۷۴- معین، بداؤنی، شیخ معین الدین از تلامذہ مرزا محمد رفیع سوداست فکرش در اقسام ریختہ قادر و رغبت طبعش در مناظرہ وافر الحال کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجریست شنیدہ شد در لکھنؤ بسر می برد از دست۔ (۳ شعر)

۲۷۵- مدعا۔ دہلوی، میر عوض علی۔ بصفات حمیدہ آراستہ۔ در عبارت و انشا دستے رسا داشتہ۔ با حافظ الملک حافظ رحمت خاں مرحوم بعزت می گزرانید۔ قصیدۂ ریختہ در کتخدائی نواب محبت خاں سلک نظم کشیدہ بغایت تسلط و اقتدار گفتہ د

زبان افغانی داخل آں کردہ از موزوناں قرار دادہ است

(۱۰ شعر)

۲۷۶۔ **مدہوش**، میر غنی نماں، نبیرۂ خواجہ محمد باسط مغفور و شاگرد میر سوز ست بموزونی طبع رغبتے بہ نظم ریختہ دارد از وست:

لیا جس ناز سے تو نے مرا دل
خدا جانے ہیں اس کو یا ترا دل

۲۷۷۔ **مصیب** الہ آبادی موسوم بہ شاہ قطب الدین از افاضل و اولاد شاہ حضرت اللہ الہ آبادی ست۔ بزرگی خاندان ایشاں عیاں ست مشار الیہ بصفات حمیدہ موصوف و بہ مسافر نوازی مصروف بود۔ محبتے با راقم آثم داشتہ اکثر بہ نظم عربی و فارسی وگاہے بموزونی طبع ریختہ می پرداختہ از وست:

کون گلشن میں کہو مشک کی بو لاتی ہے
کہتے ہیں زلف کے کوچہ میں صبا جاتی ہے

۲۷۸۔ **ممتاز** دہلوی حافظ فضل علی از شاگردانِ مرزا محمد رفیع سودا ست در امائل خود ممتاز و مستثنیٰ بود۔ مثنوی در تعریف لاٹھی بہ بحر مخزن اسرار گفتہ فکرش استوار ست۔ از وست۔

(مثنوی کے شعر بھی ہیں ــــ ۱۶ شعر)

۲۷۹۔ **مشتاق**، دہلوی میر حسن۔ الحال کہ عہد شاہ عالم بادشاہ است

عمرش بکہولت رسیدہ وسکونت در فیض آباد اختیار کردہ
بغربت وانکساری می گزراند از وست (۳ شعر)

۲۸۰ - مشتاق عظیم آبادی - محمد قلی خاں خلف ہاشم قلی خان ست کہ یکے از
عمدہ ندیمان نواب زین الدین احمد خاں ہیبت جنگ بہادر
صوبیدار عظیم آباد بودہ و مشتاق مذکور جوانیست بہ سلامت
ذہن و اخلاق حمیدہ موصوف و بعلم موسیقی ماہر اشعار
بسیار گفتہ ایں ابیات از افکار اوست (۴ شعر)

۲۸۱ - منّت دہلوی میر قمر الدین -
بہت اچھا اضافہ گیا ہے - یہ چھوڑ دیا -
"از دوستانِ راقم آثم ست" (۸ سطر - ۳۲ شعر)

منت تخلص، میر قمر الدین نام - شاہ جہان آبادی - سلسلہ ان کے نسب کا ماں کی طرف سے سید جلال بخاری کو پہنچتا ہے - وہ سید جلال جو بیٹے تھے سید عضد یزدی کے جن کا احوال مفصل تذکرۂ کاشی میں لکھا ہے - قرابتوں کی تقریب اور پیوندوں کے سبب سے تربیت منت مذکور نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے گھرانے میں پائی ہے اور کیفیت راہ طریقت معرفت کی فخر العارفین مولوی فخر الدین قدس سرہٗ کی خدمت سے اٹھائی ہے - عقدے فن شعر و شاعری کے میر شمس الدین فقیر تخلص کی فیض صحبت سے ان پر کھلے، اور میر نور الدین نوید تخلص کی برکت مجالست سے دقیقے سستی و چستی نظم کے طے ہوئے - صفائی بندش و حسن بیان میں فی الحقیقت استاد اور موشگافی معنی میں قلم اس کا رشک خامۂ بہزاد - زبان فارسی میں کلکِ عنبر سلک نے ان کے بہت کچھ لکھا ہے - نظم و نثر ملا کے قریب لاکھ

بیت کے کلیات ان کا ہے مثنویاں متعدد انھوں نے کہیں اور کتابیں منثر تالیف کیں چنانچہ شکرستاں کرکے ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بطور گلستان کے مشہور ہے، اور جواب اگر گلستان کا کہیں تو کیا مقدور ہے۔ ۱۱۹۱ سنہ گیارہ سو اکانوے ہجری میں ویرانیِ شاہ جہان آباد کے باعث لکھنؤ میں ان کا آنا ہوا، اور میر محمد حسین فرنگی لقب کی بار فروشی کے سبب مشتاق ان کا وہاں ایسا زمانہ ہوا۔ بعد چندے مربی گری سے میر مذکور کے ممتاز الدولہ مسٹر جانسین بہادر کی سرکار میں توسل انھوں نے حاصل کیا، اور رفاقت میں صاحب مذکور کی کلکتے آکر عماد الدولہ گورنر مسٹر ہسٹین جلادت جنگ بہادر کی اعانت کے باعث پیشگاہ نظامت سے صوبہ بنگ کے خطاب ملک الشعرا کا لیا۔ بعد ایک مدت کے رفیق مہاراجہ ٹکیٹ رائے کے ہوئے اور چند ایام زندگی کے اپنے طور پر بسر کئے۔ ۱۲۰۶ سنہ بارہ سو چھ ہجری میں نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خاں بہادر اور مہاراجہ ٹکیٹ رائے واسطے کچھ سوال و جواب معاملات کے لکھنؤ سے کلکتے جو تشریف لائے، تو میر قمر الدین منت بھی ساتھ آئے۔ ایک تین چار روز تپ محرق ان کو عارض ہوئی، اور بغیر جان کے لئے وہ تپ نہ گئی چنانچہ کلکتہ اس سید غریب الدیار کا مدفن ہوا، اور تاریخ رستخیز قیامت دہی مسکن ہوا۔ یہ خلاصہ افکار اس منتخبِ روزگار کا ہے ؎

خشک نالے ہو گئے بہنے سے دریا تھم رہا
چشم میں اپنے نہیں اک عمر سے کچھ نم رہا

مے کدہ سے ٹل گئے اہل ہوس پی پی کے جام
انگبیں وہ ہوں کہ اس پیر مغاں میں جم رہا

کوتہ ہے اس کی زلف سے دستِ صبا ہنوز
عقدہ ہوا یہ دل کا ہمارے نہ وا ہنوز

گل نکلتے ہیں زمیں سینی برنگِ شعلہ
کون دل سوختہ جلتا ہے تہِ خاک ہنوز

گر نقشِ دوئی مٹائیں گے ہم
سچ کہیو کہ کیا کہائیں گے ہم

مصری سے وہ ہونٹ ٹک دکھا دے — کچھ گھول کے پی نہ جائیں گے ہم
اس آنے کا کچھ بھی لطف پیارے — ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم
آئینۂ دل جو تھا وہ ٹوٹا — کیا اب تمھیں منھ دکھائیں گے ہم

نت کوہِ آتشیں کو چھاتی سے پیلتے ہیں — کچھ عاشقی نہیں ہے ہم جی پہ کھیلتے ہیں
دل ہم ستم زدوں کا ہے واجب الترحم — اس نیم قطرہ خوں پر سو زخم جھیلتے ہیں
خوانِ کرم پہ تیرے ہے سیر ایک عالم — ہم بے نصیب اب تک پاپڑ ہی بیلتے ہیں

منت ایسے کو دل دیا تو نے — اے مری جان کیا کیا تو نے

مدعی اس سے سخن ساز بہ سالوسی ہے — پھر تمنا کو یہاں مژدۂ پابوسی ہے
ہے مری طرح جگر خون ترا مدت سے — اے حنا کس کی تجھے خواہشِ پابوسی ہے
تہمتِ عشق عبث کرتے ہیں مجھ پر منت — ہاں یہ سچ ملنے کی خوباں سے تو اک خو سی ہے

کوئی اس بد فراجی پہ تمھارے پاس کیا بیٹھے — ادھر ٹک ہم نے دم مارا ادھر تم منھ بنا بیٹھے
یہیں سے ہمرہانِ قافلہ اپنی تو رخصت ہے — کہ اس وادی میں ہم تو ضعف سے جوں نقشِ پا بیٹھے
کھڑے رہیے جو اس کی بزم میں تو یوں لگے کہنے — دکھاتا ہے یہ اپنے پاؤں کیوں ناحق کھڑا بیٹھے
جو اتنی بات سن کر بیٹھ جاویں تو لگے کہنے — ہنسی سے کہتے ہی اک بات کے بس آپ آ بیٹھے

نہ آوے باز یہ بندہ تو منت بدگمانی سے
تکلف برطرف گر ساتھ اس بت کے خدا بیٹھے

کہاں ہم کو عرضِ غمِ دل رو ہے — گرہ زیرِ لب نغمۂ آرزو ہے
قدم رکھ گیا کون سینہ پہ اپنے — گلِ داغ میں آج مہندی کی بو ہے
سناتا تھا میں حالِ دل اس کو منت — کہا چل بے یہاں سے یہ کیا گفتگو ہے

آہو سے تری چشم کی کب چھوٹیں یہ تشبیہ | جب تک کسی ساغر کو نہ آنکھیں نہ دکھائے
اُٹھ جائے کسی کے جو دلِ صاف سے پردا | پھر آئینہ دنیا میں کبھو منھ نہ دکھاوے

بندے کو خدا کے نہیں جز دل شکنی کام | کیا سنگ ہے دل شیشے کا اشکستہ ہے

رباعیات

منت یک بار عشق سے توبہ کر | یارو ناچار عشق سے توبہ کر
اب تک مردودِ دین و دنیا رہتا | آجاتے نہ دے یار عشق سے توبہ کر

منت جوں شمع دل جلا جاتا ہے | روکا کب غم کا ولولا جاتا ہے
کیا جانے کیا خلش ہے سینہ میں آج | ہر سانس کے ساتھ جی چلا جاتا ہے

منت اے جان ان بتوں کو مت پوج | مت کھو ایمان ان بتوں کو مت پوج
ان باتوں پر پتھر پڑیں تیری ظالم | اللہ کو مان ان بتوں کو مت پوج

---

۲۸۲ - **مغموم** - نو سوم بہ رام جیون ساکن لکھنؤ - از دل برشتگان ہموم عشق و منسلکان سرکار نواب مختارالدولہ مسٹر جانسن بہادر است در یک ہزار و یک صد و نود و نہ ہجری با راقم آثم در بنارس ملاقی شد و اشعار خود را بیادگار آورد تا در تذکرہ اثبات یابد - این ابیات ازانجاست

حرف النون

۲۸۳- ناجی - محمد شاکر- ایک لفظ اضافہ نہیں (۴ سطر، ۲۲ شعر)

ناجی تخلص، نام اس کا محمد شاکر تھا۔ شاہ جہان آبادی۔ شاہ نجم الدین آبرو تخلص کا معاصر تھا۔ محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے وقت میں اس نے شہرت پائی ہے اور بطور قدما کے طرز ایہام میں کرتا طبع آزمائی ہے۔ خوش طبعی اور ظرافت سے بیشتر سروکار رکھتا تھا اور عالم کی ہجو کرنا شعار رکھتا تھا۔ شیوۂ قدیم میں صاحب دیوان ہے، اور وضع سابق میں شاعر خوش بیان ہے لیکن ازبسکہ غیر مروّج طرز ایہام ہے، کلام ان کا نامقبول طبائع خاص و عام ہے۔ یہ منتخب اوراق اُس کہنہ مشاق کا ہے۔

قوسِ قزح سے چرچا کرتا ہے تجھ بھواں کا — شاید کہ سر پھرا ہے اب پھر کر آسماں کا

نہ پوچھو خود بخود اُس عارضِ خورشید کی خوبی — لیا ہے داد حُسن ماہ مہ رویوں سے کر چندہ

مجھکو باتوں میں لگا معلوم نیں کیا کیا کیا — لے چلا جی کے تئیں مُنھ دیکھتا میں رہ گیا

تری نگاہ کی کثرت سے اے کماں ابرو — ہمارے سینہ میں تودا ہوا ہے تیروں کا

مت کر آزاد دامِ زلف سے دل — بال باندھا غلام ہے تیرا

سخن سن اُس بُتِ کافر ادا کا — جیا ہوگا کوئی بندہ خدا کا

رنگ تیرا گندمی دیکھ اور بدن مخمل سا صاف — ہوش کھو کر آدمی بھولے ہیں اپنی خورد و خواب

دی ہے دریا اوپر مجھے مچھی — لا اُتارا ہے میں اُسے کس گھات

محبت سوں علیؑ کی دیکھ ناجی — ہوا ہے دل مرا اب حیدر آباد

یک بار جو بغل میں لوں اُس سرو قد کے تئیں — بالا بتاؤں خضر کی عمر ابد کے تئیں

عاشق کو روتے دیکھ چڑھا مت بھواں کے تئیں — برسات میں اُتار رکھے ہو کماں کے تئیں

زلف کیوں کھولتے ہو دن کو صنم | مکھ دکھایا ہے تو مت رات کرو

ہی غرض ملنے میں نہ الفت کچھ اس بے درد کو | پوچھتا ہے کانِ زر عاشق کے رنگِ زرد کو

غم نہیں گر دلبری سے دل کو لے جاتا ہے وہ | پاس میرے تب تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ

ان بتوں کو ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہے | یہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہے

وظیفہ راگنی کے سُر میں زاہد کفر ہی مت پڑھ | نہیں تسبیح تیرے ہاتھ میں یہ راگ مالا ہے

ہوا جب آئینہ میں جلوہ گر میں تب لیا بوسہ | بڑا آیا اپنے قابو میں تو پھر منھ دیکھنا کیا ہے

انا الحق بولنے لگتا ہے اُس کے زخم کا بسمل | کٹاری آبدار اس شوخ کی منصور خانی ہے

اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں | عارضی میری زندگانی ہے

تصور سے ترے رُخ کے گئی ہی نیند آنکھوں سے | مقابل جس کے ہو خورشید کیونکر اُس کو خواب آوے

٢٨٤ - **نظام** - مخاطب بہ نواب عماد الملک غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ ست - بعہد احمد شاہ بن محمد شاہ بخطاب بخشی الملک در زمان عالمگیر ثانی بخطاب وزیر الممالک اختصاص یافتہ - و بعد چندے بنیانِ سلطنت برانداختہ - بالجملہ در شجاعت و مہارت بعض از فنون و سرعت فہم از امرائے این عہد ممتاز ست - خط را زیبا مینویسد - و زبانش با اکثر محاورہ آشنا - در نولا کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و پنج ہجری باشد شنیدہ شد کہ از نتائج اعمال بجانب سند در کمال تفرقہ می گزراند - شعر فارسی و ہندی می گوید - ازوست :

(٢ شعر)

۲۸۵ - **نعیم** - دہلوی نعیم اللہ - علی لطف نے حاتم کے ساتھ مقابلوں کے ذکر کا اضافہ کیا ہے -

(۲ سطر - ۴ شعر)

نعیم تخلص، نعیم اللہ نام، متوطن شاہ جہان آباد معاصر محمد حاتم حاتم تخلص کا تھا۔ چنانچہ اکثر مشاعروں میں گفتگوئیں طنز و ایما کی ان کے درمیان آئیں ہیں اور مکرر غزلیں اُنھوں نے باہم لڑائی ہیں۔ ایک دن محمد حاتم نے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی، اور مطلع میں غزل کے طنز محمد نعیم پر کی ؎

جس دن سے کوئے یار کا حاتم مقیم ہے
بد تر اسے خزاں سے بہار نعیم ہے

جب دورہ پڑھنے کا محمد نعیم تک پہنچا تو اُنھوں نے بھی مطلع غزل یہ پڑھا ؎

طلب نہ ہو تو سلیماں کی کچھ بھی خاتم ہے
لب سوال نہ ہووے تو ہیچ حاتم ہے

غرض نعیم مذکور نے مرتے دم تک دلی نہ چھوڑی اور شاہ جہان آباد ہی میں سیر جنت النعیم کی کی۔ ایک دیوان مختصر زبانِ ریختہ میں اُس کمتر اُستاد سے ہے۔ یہ اُس کے طبع زاد سے ہے۔

اس وقت ٹک اے یار و گفتار نہ کیجئے گا
اُس فتنۂ عالم کو بیدار نہ کیجئے گا

احوال میرا سن کے کہنے لگا وہ ظالم
اب جائیے بس زیادہ تکرار نہ کیجئے گا

خیال کر کے ترے مو کمر کو روتا ہوں
وہ کیوں نہ رووے پڑے جس کے بال آنکھوں میں

دیکھ آئینہ خانے میں گر تجھ کو نہیں باور
تجھ سے تو جہاں میں بھی دلدار بہت ہوں گے

۲۸۶ - **میر غلام نبی** بلگرامی خواہر زادہ میر عبد الجلیل بلگرامی۔ بعلوم متداولہ و موسیقی ماہر۔ گویند بزبان ہندی دو ہزار و چہار صد دوہرہ گفتہ کہ پہلو بہ دوہرہائے بہاری می زند۔

(۲ شعر)

۲۸۷-نثار-اکبرآبادی-میر عبدالرسول-آبائیش از منصبداران فرخ سیر بادشاہ بودند-واد بسیار سنجیدہ اطوار و دوست از میر تقی میر بود گویند از صحبتِ میر مذکور بموزونیِ طبع مشہور شد از دست. (۵شعر)

۲۸۸-نثار دہلوی-سدا سکھ-از ابیاتش انچہ بنظر آمدہ ایں بیت امتیازے داشت:

کیا سنگار رجھانے کو کس کے تم نے چشم
کہ بال بال دُرِ اشک جو پروے ہیں

۲۸۹-ندیم-دہلوی شیخ علی قلی اُستادِ اشرف علی خاں فغان ست از دہلی بمرشد آباد آمدہ بہ سرکار نواب میر جعفر خاں انسلاک داشت و ہمدراں عہد وفات یافتہ-مرثیۂ سید الشہدا علیہ السلام اکثر می گفت-از دست:

بے قرارِ عشق کو ہے زندگی نقصِ کمال
مر چکی سیماب تب کہتے ہیں یہ اکسیر ہے

۲۹۰-نادر دہلوی ساکن کوٹلہ فیروز شاہ-معاصر محمد شاہ مرحوم بغایت کم فکر بود از دست: (۲شعر)

۲۹۱-نالاں-دہلوی-میر احمد علی خود را از تلامذۂ مرزا رفیع سودا می شمرد راقم در مرشد آباد اورا دیدہ استعدادے نداشت از دست: (۲شعر)

۲۹۲-**نالاں**۔ عظیم آبادی۔ میر وارث علی خلف میر ارزانی موطنش قصبۂ بہار ست۔ اما سکنے در عظیم آباد اختیار کردہ بسر داری شیشہ گراں اعتبار دارد۔ جوان سنجیدہ اطوار از تربیت یافتگان مرزا اشرف علی خاں فغان ست۔ الحال کہ سال یک ہزار و یک صد و پنج ہجری باشد در ہماں بلدہ بسر می برد (۲۵ شعر)

۲۹۳-**نجات**۔ دہلوی شیخ حسن رضا۔ بعد ویرانی شاہ جہاں آباد کہ بردست احمد شاہ درّانی اتفاق افتادہ۔ وارد عظیم آباد گردیدہ و مدتے در جوار عاطفت عمی حاجی احمد علی قیامت تخلص بسر بردہ و الحال از چند سال در دہے از دہات سرکار سارن مضاف صوبۂ بہار سکنے اختیار کردہ۔ بغایت سلیم الطبع و سنجیدہ اطوار و از دوستانِ ایں خاکسار ست مرثیۂ سید الشہدا علیہ السلام بیشتر و دیگر اقسام نظم را کمتر می گوید بدیں جہت فکرش مرتبۂ تمامی حاصل نہ کردہ۔ ایں چند اشعار از وے ستودہ اطوار ست۔ (۳ شعر)

۲۹۴-**نزار**۔ خواجہ محمد اکرم از شاگردانِ میر محمد تقی میر ست (۳ شعر)

۲۹۵-**نالاں**۔ دہلوی۔ محمد عسکر علی خاں از شاگردانِ حاتم ست:

تھا منتظر کہ یار کا پیغام آگیا ✤ قاصد تو آج زور میرے کام آگیا

حرف الواؤ

۲۹۶ - ولی - دکھنی شاہ ولی اللہ - اصلش گجرات - در شعرائے دکن مشہور و ممتاز ست - گویند در زمان عالمگیر بادشاہ بہ ہندوستان آمدہ مستفید از شاہ گلشن گردید - از مشاہیر ریختہ گویاں، و اول کسے ست کہ دیوانش در دکن مشہور و مدوّن گشتہ این ابیات منتخب دیوانِ اوست"

(ان ہی چند الفاظ کا ترجمہ لطف نے اس طریقہ سے کیا ہے کہ مطلب بدل جاتا ہے!) ۲۰ شعر

ولی تخلص، شاہ ولی اللہ نام، دکھنی وطن بزرگوں کا اس کے گجرات ہے شاعر بلند مقام تھا۔ اول زبان ہندی میں دیوان اس عزیز نے جمع کیا ہے اور نظم ریختہ کو سرزمین دکن میں رواج اس نے دیا ہے۔ شعرا دکن میں مشہور و ممتاز ہے، اور اپنے معاصروں میں سربلند اور سرفراز۔ عالمگیر بادشاہ کی سلطنت میں ہندوستان کی طرف آیا، اور میاں گلشن کے فیض خدمت سے فائدہ انواع و اقسام کا اٹھایا۔ خوب داد تلاش معنی کی دی۔ آخر اس بیتِ بے معنی بے وجود سے راہ کاشانۂ عدم کی لی۔ یہ اشعار اُس سربلند افکار کے ثبت جریدۂ روزگار ہیں۔

پھر میری خبر لینے کو صیّاد نہ آیا ‏ شاید کہ اُسے حال مرا یاد نہ آیا

بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں / کام ہے تجھ چہرۂ گل نار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں / تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

گزر ہے تجھ طرف ہر بوالہوس کا / ہوا دھاوا مٹھائی پر مگس کا

صحنِ گلشن میں جب خرام کیا / سروِ آزاد کو غلام کیا

پھرتے ہیں سیہ مست ہو شمشیرِ نظر سے / بن بندہ اُن انکوں کو پکڑ کون سکے گا
ہے نقش کناری کا ترے جامہ کے اوپر / دامن کو ترے ہاتھ لگا کون سکے گا

جب تجھ عرق کے وصف میں جاری قلم ہوا / عالم میں اُس کا نام جوا ہر رقم ہوا
نقطہ پہ تیرے خال کے باندھا ہے جن نے دل / وہ دائرے میں عشق کے ثابت قدم ہوا

خدا نے مُنھ پہ ترے بابِ حسن باز کیا / قدِ بلند کو تیرے تمام ناز کیا

تخت جس بے خانماں کا دشت ویرانی ہوا / سر اوپر اُس کے بگولا تاجِ سلطانی ہوا

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سے آزاد / طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ
حاکمِ وقت ہے تجھ گھر میں رقیب بدخو / دیو مختار ہوا ملکِ سلیمان میں آ
بسکہ مجھ حال سوں ہمسر ہے پریشانی میں / درد کہتی ہے مرا زلف ترے کان میں آ

شغل بہتر ہے عشق بازی کا / کیا حقیقی و کیا مجازی کا
ہر زباں پر ہے مثلِ شانہ مدام / ذکر تجھ زلف کی درازی کا

دلِ صد پارہ تجھ پلک سوں بندھا / خرقہ دوزی ہے کام سوزن کا

آیا ہے نقل لینے ترے مُنھ کی تاب کی / تارِ خطوط سیتی بنا مسطر آفتاب کی

بجا ہے گر شہیدِ سرو قد کو / بنا دیں چوب سے طوبیٰ کے تابوت

نکلا ہے بے حجاب ہو بازار کی طرف / ہر بوالہوس کی گرم ہوئی ہے دُکان آج

کیا ہے دفع مرے دردِ سر کو رونے نے / ہوا ہے حق میں مرے خونِ دیدہ صندلِ سرخ

رحم بے جا ستم برابر ہے / تو رقیباں اوپر کرم مت کر

جو آیا مست ساقی جام لے کر
گیا یکبارگی آرام لے کر

میں اُس کو جوں نگیں کرتا ہوں سجدہ
جو کوئی آتا ہے تیرا نام لے کر

میں نہ جانا تھا کہ تو نادان ہے
دل دیا تھا تجھ کو دانا بوجھ کر

ہوں گرچہ خاکسار و لے ازرہِ ادب
دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز

لب دلبر پہ جلوہ گر ہی خال
حوضِ کوثر پہ جوں کھڑا ہو بلال

صنم کے لعلِ لب وقتِ تکلّم
رگِ یاقوت ہی موجِ تبسّم

نہ جا آنکھوں میں آ مجھ دل میں اے شوخ
کہ ہی خلوت میں اُس کے خوف ہر دم

ٹک ولی کو صنم گلے سے لگا
تجھ کو ہے بندہ پروری کی قسم

اُس کے دہنِ تنگ کی تعریف کو میں نے
صنعت سے ولی دیدۂ عنقا پہ لکھا ہوں

خوبیِ اعجازِ حسنِ یار گر انشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

کیا کہوں تجھ قد کی خوبی سروِ رعنا کے حضور
خود بخود رسوا ہی اُس کو اور کیا رسوا کروں

سر کروں جب وصف تیرے جامۂ گل رنگ کا
جامہ زیبوں کو بہ رنگِ جامۂ دیبا کروں

رات کو آؤں اگر تیری گلی میں اے حبیب
زیورِ لب ذکرِ سُبحَانَ الَّذِی اَسرٰی کروں

آرزو دل میں یہی ہے وقت مرنے کے ولی
سرو قد کو دیکھ سیرِ عالمِ بالا کروں

ایک بار اگر بات مری گوش کرے تو
ملنے کو رقیبوں کے فراموش کرے تو

غیرت سے کرے چاک گریباں دلِ پُرخوں
گر گل کی حمائل کو ہم آغوش کرے تو

اے جان ولی وعدۂ دیدار کو اپنے
ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے تو

ایسے نصیب میرے کہاں ہیں ولی کہ آج
اُس گل بدن کو اپنے گلے ہار کر رکھوں

خوش قداں دل کو بند کرتے ہیں
نام اپنا بلند کرتے ہیں

اے سامری تو دیکھ مری ساحری کے تئیں — شیشہ میں دل کے بند کیا ہوں پری کے ت[ئیں]

صحبتِ غیر میں جایا نہ کرو — درد مندوں کو کڑھایا نہ کرو

اک دل نہیں آرزو سے خالی — ہر جا ہے محال اگر خلا ہے

کیوں کہ کپڑے رنگوں میں تجھ غم سے — عاشقی میں لباس ہوتا ہے

رہیں گے خاک ہو تیری گلی میں — وفاداری ہماری اس قدر ہے

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن — باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

اب خلاصی عشق سے ممکن نہیں — دامِ دل زلفِ ودامی پوش ہے

نشّہ بخشِ عاشقاں وہ ساقیِ گلفام ہے — جس کی آنکھوں کا تصور بیخودی کا جام ہے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے — عشق کا اعتبار کھوتی ہے

ترا مُنھ مشرقِ حسن انوری جلوہ جمالی ہے — لبیں جامی، جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے

مت تصور کرو مجھ دل کو کہ ہرجائی ہے — چمنِ حسنِ پری رو کا تماشائی ہے

گل رخاں کیوں نہ کہیں تجھ کو سکندر طالع — جلوہ گر بر میں ترے جامۂ دارائی ہے

شیخ مت گھر سوں نکل آج تو خوباں کے حضور — گول دستار ترا باعثِ رسوائی ہے

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق
کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

دل چھوڑ کے یار کیوں کہ جاوے — زخمی ہو شکار کیوں کہ جاوے

چھوڑ اے شوخ طرزِ خود کامی — مت ہو ہر دیدہ باز کا دامی

جب تک نہ ملے شرابِ دیدار — آنکھوں کا خمار کیوں کہ جاوے

تجھ لب و زلف کے تماشے کو — چل کہ آئے ہیں مصری و شامی

۲۹۷ - ولایت، دہلوی۔ نام گرامیش میر ولایت اللہ ابن میر باقی

خوستی از مریدانِ حضرت خواجہ جعفر و برادر کلاں محتشم علی خاں حشمت ست بہ شجاعت و مروت و استقلال از نوادرِ روزگار بود۔ ایں خاکسار را ہنگام فترات نواب میر محمد قاسم خاں مرحوم بآں سیّد عالی مقدار اتفاق ملاقات وداد بغایت وقار و عزت مشاہدا فتاد در سن کہولت بعہد دولت نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ مرحوم رحلت نمودہ ایں ابیات یادگار اوست۔

(۳ شعر)

۲۹۸- **وارث**، الہ آبادی، محمد وارث بخوش فکری انصاف داشتہ راقم آثم در فترات نواب عالی جاہ میر محمد قاسم خاں مرحوم اورا در الہ آباد دیدہ است بہرہ از علوم رسمیہ داشتہ۔ ازوست۔

(۴ شعر)

۲۹۹- **ولی** دہلوی۔ مرزا محمد ولی۔ اضافہ نہیں کیا مطلب ضبط کردیا ہے۔)

(۳½ سطر، ۱۵ شعر)

ولی تخلص، میرزا محمد ولی نام، متوطن شاہ جہان آباد کے بھتیجے ہیں۔ شاہ اسرار اللہ صاحب ارشاد کے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے احوال اس خجستہ کردار کا کہ "جوانِ آزاد حال اور دوست ہے اس خاکسار کا۔ سنہ ۱۱۹۴ گیارہ سو چورانوے ہجری میں بلدۂ مرشد آباد کے اندر جائے قرار رکھتے تھے، اور بیشتر شغل اشعار، زبانِ ریختہ میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہے، اور دیوان بھی ان کا منتظم ہوا ہے۔"

یہ منتخب افکار اس ستودہ اطوار کا ہے:

نشۂ مے سے مرا پژمردہ دل گلشن ہوا — یہ چراغِ مردہ فیضِ آب سے روشن ہوا

دل تجھے منظور ہو اُس کا اگر دیکھنا — جان سے دھو ہاتھ کو تب تو ادھر دیکھنا
زلف کو ہے کھولتا اپنے وہ منہ پر ولی — ملتی ہے آپس میں اب شام وسحر دیکھنا

آہ کا اُس کو کچھ اثر نہ ہوا — میرے اس نخل میں ثمر نہ ہوا
بے کسی پہ مری کہے کوئی — تجھ بن اے نالہ نوحہ گر نہ ہوا

صحبتِ نیکاں کرے دل میں بدوں کے کیا اثر — قند کب شیریں کرے ہوئے اگر بادام تلخ
کیا تمنا اُس شکر لب سے تو رکھتا ہے ولی — ہو گیا فرہاد کا شیریں سے آخر کام تلخ

تھی آشنا نہ تیغ سے اُس کی کمر ہنوز — ہم تب سے ہاتھ پر لئے پھرتے ہیں سر ہنوز
آنکھیں بھی انتظار میں پتھرا گئیں ولی — قاصد پہ اُس صنم کی نہ لایا خبر ہنوز

میری زبانِ تر سے نہ ہو تازہ کام خشک — کب سیرآبِ تیغ سے ہووے نیام خشک

کبھی جو زلف اُٹھاوے تو منھ نظر آوے — اسی اُمید میں گزری ہے صبح وشام ہمیں

زندگی کی اُس نے کچھ لذت ولی جانی نہیں — جس کے دل میں دردِ عشقِ دلبرِ جانی نہیں

چاہے کیوں کر کہ یہ جی تن سے نکل جانے کو — پھر نہ آیا جو گیا اُس کی خبر لانے کو

عیاں گر کردوں دل کے سوزِ نہاں کو — لگے آگ جوں شمع میری زباں کو

کبھی درد کی چاشنی کو نہ بھولے — ہما کھاوے میرے اگر استخواں کو

حد سے زیادہ رشتۂ الفت ہی مختصر — ایسا نہ ہو کہ اس میں پڑے اب جدا گرہ

ہجر کی مارے ہی ڈالے ہے شبِ تار مجھے — کب دکھاوے گا خدا صبحِ رخِ یار مجھے
دانۂ خال دکھا کر کیا تو نے صیّاد — زلف کے دام میں آخر کو گرفتار مجھے

جس جگہ عشق رخش تاختہ ہے — وہاں رستم حواس باختہ ہے
نگہِ گرم سے پری رو کے — شیشۂ دل مرا گداختہ ہے

جو اس لعل میگوں سے مدہوش ہووے
اُسے ہردو عالم فراموش ہووے
بند قبا چمن میں جو وہ یار واکرے
لے برگِ گل کو ہاتھ میں پنکھا صبا کرے

۳۰۰- **وفا** - لالہ نونن رائے ہمین برادر راجہ گلاب رائے دیوانِ نجیب الدولہ نجیب خان ست اشتغال بہ تحصیل فضائل داشتہ طبعش مائل نظم افتادہ است۔ ازوست: (۲ شعر)

۳۰۱ **وحشت** - دہلوی۔ میر ابوالحسن نبیرۂ تیر انداز خاں از شاگردانِ مرزا محمد رفیع سودا است: (۲ شعر)

۳۰۲- **وحشت** - میر بہادر علی۔ از منسلکان سرکار نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ مرحوم بود۔ گویند بارہ ماسہ بطور ریکتہ کہانی گفتہ۔ اما بنظر مولّف نرسیدہ ازوست: (۲ شعر)

۳۰۳ **واقف** - دہلوی شاہ واقف از درویشان صاحب کمال ست بہرہ از علوم رسمیہ دارد و درعہدِ دولت نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ بہ تہمت خواندن دعوت در پہرۂ سپاہیان افتادہ بود و دراں حال غزلے گفتہ مطلعش اینست:

وقت آیا ہے کہ ہوں شاہ و گدا پہرے میں
بے خطا پہرے میں اور اہلِ خطا پہرے میں

آخر کار از قید نجات یافتہ۔ الحال کہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری باشد در لکھنؤ اقامت دارد۔ ازوست: (۱۰ شعر)

۳۰۴- وصل - مرزا اسحاق ولد حاجی ابراہیم ابن آقا مدبر اصفہانی ست
از مدتے در لکھنؤ بسر می برد و نسبت شاگردی باشاہ ملول دارد
الحال کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجری ست
اشعار آں ستودہ اطوار از لکھنؤ طلبیدہ مرقوم نمودہ شد
اکثر مرثیہ می گوید و گاہے بغزل ریختہ می پردازد۔
ایں اشعار از وست : (۶ شعر)

۳۰۵- وہم - میر محمد علی خلف میر محمد تقی خیال کہ صاحب بوستان خیال ست
دریں روزہا در لکھنؤ می گزراند و در سرکار نواب وزیر الممالک
آصف الدولہ بہادر انسلاک دارد۔ از وست :

جا کہے اُس سے آشنا اب کوئی
ہے ترے غم سے جاں بلب کوئی

۳۰۶- والہ - دہلوی میر مبارک علی پسر ارشد شاہ قدرت اللہ قدرت
تخلص ست از علوم ظاہر اصلا بہرہ مند نیست اما بحض
موزونیت طبع و فیض صحبت شاہ مذکور ریختہ
می گوید و در مرشد آباد اقامت دارد۔ از وست

ہوئی ہے مشتعل میرے دلِ بیتاب میں آتش
نہ دیکھی تھی کسی نے اب تلک سیماب میں آتش

حرف الہا

۳۰۷- ہدایت - دہلوی شیخ ہدایت اللہ (کوئی اضافہ نہیں)

(۳ سطر ۸۵ شعر)

ہدایت تخلص شیخ ہدایت نام اس مرد کا۔ شاہ جہان آبادی معتقد اور شاگرد خواجہ میر درد کا ہے۔ ایک مثنوی انھوں نے بنارس کی تعریف میں بہت خوب لکھی ہے اور داد مضمون تراشی کی دی ہے۔ شاعر فصیح بیان ہے اور ناظم شیریں زبان۔ دیوان مختصر زبان ریختہ میں بطرح زادسے اس کے ہے، اور گم شدگان راہ معنی کو بشیر ہدایت اس کہن استاد سے ہے یہ منتخب کلام اس شاعر بلند مقام ہے۔

جب لوں ہوں ترا نام ٹپک پڑتا ہی آنسو ۔۔۔ جس طرح کہ سمرن کا ڈھلک جاتا ہے منکا
جسے کہ زلف سیہ نے تری ڈسا ہوگا ۔۔۔ غرض وہ مرہی گیا ہوگا کیا جیا ہوگا

جوں غنچہ ترے وصف میں ہوں سر بگریباں ۔۔۔ ہے منھ میں زباں پر نہیں مقدور سخن کا
نہ رحم اس کے ہے جی میں نہ دل میں اپنے صبر ۔۔۔ ہماری گزرے گی کیونکر الٰہی کیا ہوگا
ہو گیا ہوں میں زرد جوں خورشید ۔۔۔ ظاہرا وقت ہے اخیر مرا

تمام صبر و دل و دیں تو یار لوٹ گیا ۔۔۔ نہ خلف وعدہ کیا پر ترا نہ جھوٹ گیا
بلا ہی زور ہے اس دختِ رز کا اے ساقی ۔۔۔ خمار جس کا مرے ہاتھ پاؤں کوٹ گیا
ملا ہے جا کے یہ آخر کو سادہ رویوں سے ۔۔۔ اگرچہ آئینہ تھا دل یہ ہم سے پھوٹ گیا
ہے آدمی کو بھی قیدِ حیات اک زنداں ۔۔۔ کسی نے خوب کہا ہی موا سو چھوٹ گیا

آتش سے داغ دل کی سراپا میں جل گیا ۔۔۔ گلزار ہو کے گیا کہ بدن سارا پھل گیا
رو دوسے ہے کیا جوانی یہ اپنی کہ بے خبر ۔۔۔ شب کیا گزر گئی ہے کہ اب دن بھی ڈھل گیا

لب پر ہزار حرف شکایت کا تھا ہجوم
مکھڑے کو دیکھتے ہی پہ کچھ دل بہل گیا

ہر لخت دل گلے کا مرے ہار ہو گیا
گل تھا پر اپنی چشم میں یہ خار ہو گیا

ہے کس کے جی میں خواہش سیر چمن یہاں
سینہ تمام داغوں سے گلزار ہو گیا

آیا ہوں تنگ کشمکش دام زلف میں
یارو میں کس بلا میں گرفتار ہو گیا

بوسہ طلب کیا تھا فقط اور کچھ نہیں
میں اتنی بات کہتے گنہگار ہو گیا

کچھ ان دنوں ہے حال ہدایت ترا تباہ
کیوں میری جان کیا تجھے آزار ہو گیا

عالم کو تیری چشم نے بیہوش کر دیا
جس کی طرف نظر گئی مدہوش کر دیا

جاتا رہا ہوں آپ بھی میں اپنی یاد سے
کیا جانیے کہ کس نے فراموش کر دیا

مجلس میں اس کی رات ہدایت نے سوز دل
یہاں تک کہا کہ شمع کو خاموش کر دیا

نے جم رہا جہاں میں نہ یہ جام رہ گیا
مردوں کا اس جگہ میں مگر نام رہ گیا

کوئی پھرا نہ ملک عدم سے تو اب تلک
پایا جہاں کسو نے کچھ آرام رہ گیا

دیکھا جو تیرے چشم و دہن کو تو شرم سے
منھ اپنا لے کے پستہ و بادام رہ گیا

آتی ہے آج تجھ سے تو کچھ اور بوئے نسیم
رات اس چمن میں کون گل اندام رہ گیا

کیا دن تھے وہ بھی آہ ہدایت کہ جن دنوں
راتوں کو اپنے پاس وہ گلفام رہ گیا

مدت ہوئی ہے اب تو ملاقات بھی نہیں
آنے سے ملکہ نامہ و پیغام رہ گیا

اک دن بھی مہربان نہ وہ بے وفا ہوا
اے آہ و نالۂ سحری تم کو کیا ہوا

ہر ایک دانۂ انگور یہاں شراب ہوا
ولے یہ آبلہ اپنا نہ کامیاب ہوا

نہ صحن باغ میں لگتا ہے جی نہ صحرا میں
ہوا ہوں آہ میں یارب کس انجمن سے جدا

دیکھا اس کی چشم مست کو دل تو بہک گیا
بس میری جان وہی پیالوں میں جھک گیا

دیکھا نہیں ہے ہم نے ہدایت کو ان دنوں
شاید کسی جگہ پہ دل اس کا اٹک گیا

عشق میں خوباں کے ہے طرزِ ستمگاری بہت — آہ دلداری ہے کم یہاں اور آزاری بہت
مار ڈالا ہند کے کافر اداؤں نے ہمیں — حسن میں ان کے نمک اور طرح داری ہے بہت

نہ ملے کارواں سے ہم اے وائے — گرچہ کتنا جرس پکار رہا

یا رہے ہم میں ہدایت جلوہ گر — جس طرح ہو گوہرِ یکتا میں آب
پر نہیں معلوم ہرگز آپ کو — آب میں دریا ہے یا دریا میں آب

تیری زلفوں کی کچھ چلی تھی بات — روتے روتے ہی گزری ساری رات

دل تو سمجھائے سمجھتا ہے کبھو — پر ہدایت چشم تر کا کیا علاج

کٹتی ہی نہیں یہ ہجر کی شب — یا رب کیا آج سو گئی صبح

تو نے گر قتل کیا ہم کو صنم خوب کیا — ہاں میاں سچ ہے کہ ایسے ہی گنہگار تھے ہم
قیس دوں مر گیا فرہاد کی وہ شکل ہوئی — آہ اس کوہ و بیاباں میں کئی یار تھے ہم

تم نہ فریاد کسی کی نہ فغاں سنتے ہو — اپنے مطلب ہی کی سنتے ہو جہاں سنتے ہو

عصا لے ہاتھ آئی سُن تجھے گلشن میں آئی ہے — یہ نرگس باوجود اس کے کہ ہے معذور آنکھوں سے

چولی مسک رہی ہے اور آنکھیں ہیں رسمسی — سچ کہیو ہم سے رات پیارے کہاں رہے
کرتا نہیں ہے جانے کو دل کوئے یار سے — گو اس میں جی رہے نہ رہے ہم تو یہاں رہے

کیا خاک کو مری کہیں گلشن میں جا نہ تھی — پر چشم تجھ سے ہائے مجھے یہ صبا نہ تھی
سیرِ چمن ہوا و مے و صحبت و طرب — ایسی گئی کہ ہم سے گویا آشنا نہ تھی
گلشن کو دوستی کے میں دیکھا چمن چمن — جز بوئے خونِ دل کہیں بوئے وفا نہ تھی

ضعف سے بیٹھا میں جوں نقشِ قدم تو کیا ہوا — گرد باد آسا مری طینت میں ہے آوارگی

ہونے جب صد عیش و عشرت ہم کو تیرا دید ہے — مل گئے جس دن گلے تیرے اسی دن عید ہے

دل مرا کیوں کر ہو غافل گور سے — گھر نظر آتا ہے اپنا دور سے
آنکھ سے آنسو کبھو تھمتا نہیں — چشم بھی کیا کم ہے یہ ناسور سے

دل نہ کر تو شکوۂ جورِ بتاں — فائدہ کیا یار اس مذکور سے

گر نت یہی جور اور جفا ہے — بندے کا بھی اے بتاں خدا ہے

غرض یہی ہے مجھے اشک کے بہانے سے — کہ مہرباں ہو وہ یارب کسی بہانے سے
برنگ اشک اُسے آبرو ہے دنیا میں — جو اپنے گھر میں ہے محفوظ آب و دانے سے
وہ کیا کرے کہ محبت کا اقتضا ہے یہی — وگرنہ فائدہ اُس کو مرے ستانے سے
کہیں جو مہر و وفا ہو جہاں میں یا اخلاص — الٰہی اٹھ گئی یہ رسم کیا زمانے سے
میں چھوڑتا ہوں کوئی اُس کو مثل حلقۂ در — یہ سر لگا ہے مرا اُس کے آستانے سے

آنکھوں نے تری جس کے تئیں مست کیا ہو — وہ شورِ قیامت ستی ہشیار نہ ہووے
آتا ہے مجھے رحم ترے حال پہ زاہد — اے وائے اُس اوپر کہ جو مے خوار نہ ہووے

کیا کہوں تجھ سے ہدایت کہ مری شام و سحر — یاد میں زلف و رخِ یار کے کیوں کر گزری
دن گزرتا ہے مجھے روزِ قیامت سے دراز — رات گزری تو شبِ مرگ سے بدتر گزری

پختہ مغزانِ جنوں سے ہر کسی کو جنگ ہے — جو ثمر نکلا سو پامالِ جفائے سنگ ہے
عشق نے تیرے مجھے یاں تک کیا ہے ناتواں — تا بہ لب آنا نفس کو راہِ صد فرسنگ ہے
ان دنوں کچھ تو ہدایت ہو گیا ہے زرد سا
ظاہرا عاشق کسی پر ہے ترا کیا رنگ ہے

صدقے ترے گلعذار جی سے — اک جی ہے ہیں کیا ہزار جی سے
کھٹکے ہے تری مژہ ہر اک وقت — نکلا نہ کبھو یہ خار جی سے

گھر سے نکلے ہے تو جی ساتھ نکل جاتا ہے — کوئی قامت ہے کہ یہ آہ دلِ محزوں ہے

زلف کج منہ اوپر جو چھوڑی ہے — کیا صید ہے نکلتا تھوڑی ہے
چشمۂ خوں ہے دامنِ دریا — آستیں کس نے یاں نچوڑی ہے
شاخِ گل خم نہیں کسو نے کیا — ہاتھ معشوق کی مڑوڑی ہے

عمر کوتاہ کارِ عمر دراز ‏ ‏ سانگ ہے بہت رات تھوڑی ہے

ایک وہ ماہ رو غائب ہے نظر سے ورنہ ‏ ‏ وہی تارے ہیں وہی ماہ وہی گردوں ہے

ہیں خوب سیر کی جگ میں ہر ایک بستی کی ‏ ‏ بنا خراب ہو بنیادِ بت پرستی کی

ہمیں نشیب و فرازِ زمانہ سے کیا کام ‏ ‏ جو سر بلند ہیں اُن کو ہی فکر پستی کی

جی تو گلشن میں بھی نہیں لگتا ‏ ‏ کس کی مجلس سے ہم اُداس گئے

جب سُنا میں نے غم ہدایت کا ‏ ‏ سنتے ہی بس مرے حواس گئے

جاؤں نکل میں دشت میں یا شہروں میں پھروں ‏ ‏ کوئی ایسی شکل ہووے کہ ٹک جی بہل سکے

شہیدِ تیغِ ابرو ہے اسیرِ دامِ گیسو ہے ‏ ‏ ہدایت بھی تو کوئی زور ہے شہدا شکستہ ہے

رباعی

ثابت کوئی اپنے جسم و جاں سے نہ پھرا ‏ ‏ یک شخص ہزار کشتگاں سے نہ پھرا

کوچہ تو ترا رہِ عدم سے نہیں کم ‏ ‏ جو کوئی گیا تو پھر وہاں سے نہ پھرا

رباعی

دل عہدِ شباب ہو چکا ہے باقی ‏ ‏ پیری ہے سو اس میں کیا رہا ہے باقی

ہوتا ہے کوئی دم میں یہ دور اب آخر ‏ ‏ شب گزری ہے روز رہ گیا ہے باقی

۳۰۸- **ہادی** دہلوی - زبانی شیخ فرحت شنیدہ شد کہ استعداد نداشتہ این بیت بنام او مشہور ست:

نقد دل دے کے میں لیا بوسہ

یہ تو سودا دیئے لئے ہی بنی

۳۰۹- **ہویدا** - میر محمد اعظم برادر میر محمد معصوم دہلوی ست اکثر مرثیہ

امام حسین علیہ السلام می گوید و بہ سبب نومشقی کمتر فکر ریختہ
می کند۔ با مولف آشناست ایں ابیات نامزد اوست (۳ شعر)

۳۱۰ - ہدایت - ہدایت علی معاصر شیخ فرحت اللہ فرحت بود۔ از وست۔

ڈھلے ہی پڑتے ہیں باہر ہر اک طفل سر شک
رکھوں میں کب تک ان کو سنبھال آنکھوں میں

۳۱۱ - ہمدم عظیم آبادی۔ خلف میر محمد حیات حسرت ست۔ اشعار
خود را از نظر شاہ قدرت اللہ قدرت و دیگر موزونان
مرشدآباد می گزراند و درمیان بلدہ اقامت دارد۔
از دوستان فقیر ست۔ از وست : (۱۶ شعر)

۳۱۲ - میر ہنگا دہلوی۔ شنیدہ شد بر یکے تعلق خاطر داشت۔ رقیبانش
بہ حسد کشتند۔ ایں رباعی یادگار اوست (۲ شعر)

۳۱۳ - ہاتف میرزا محمد۔ شنیدہ شد در دہلی اقامت دارد۔ درویشانہ
بسر می برد :

مت پوچھ ہمنشیں کہ جہاں میں کہاں رہے
دل جس جگہ کہ لگ گیا اپنا وہاں رہے

حرف الیا

۳۱۴ - یقین دہلوی، انعام اللہ خاں - کوئی اضافہ نہیں (۷سطر۲۲۵)

یقین تخلص، انعام اللہ نام شاہ جہان آبادی۔ بیٹا اظہرالدین خان، اور نواسا شیخ مجدد الف ثانی کا تھا۔ شاگرد میرزا مظہر جان جانان کا، مشہور اور منظور نظر مرزائے مذکور اکثر یہ گمان باشندگانِ شاہ جہان آباد تھا، کہ یقین فن شعر و شاعری میں محض بے استعداد تھا مرزا مظہر خود شعر کہتے تھے اور نام اس کا داخل اشعار کرتے تھے۔ مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت میں بہ سبب کسی حرکت نامعقول کے وہ صادر نہ ہوئی تھی یقین سے، باپ نے اس کے اس کو قتل کیا، اور نعش کی اس کو دریا میں بہا دیا۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اس عمل شنیع کا گزرا تھا۔ اس کے باپ کے دھیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں۔ یقین نے اس مقدمہ میں باپ کو متنبہ کیا۔ ایک دن اُس نے خفا ہو کر اس بیچارے کا جی ہی لیا۔ علم غیب کا بدرستی خدا کو ہے اور یقین گمانوں کا بالکنہ اس خالق ارض و سما کو ہے۔ بہر حال یقین مذکور کا کلام طبائع کے مرغوب ہے اور اشعار اس کے جاں خراش و دل کوب۔ یہ ابیات آب دار اُس کا خلاصۂ افکار ہیں ؎

نہ مرتا میں اگر صدقے ترے جانے کے کام آتا — گرسنہ ناز کا تھا گالیاں کھانے کے کام آتا

میں تو ظاہر نہ کروں اُس کی جفا کو لیکن — چھپ سکے کیوں کہ یقیں زخم نمایاں میرا

مجھے گر حق تعالیٰ کارفرمائے جہاں کرتا — بتوں کو میں بہ زور ان بیکسوں پر مہرباں کرتا

نہ دیتا عیش کی خسرو کو فرصت قصر شیریں میں — جو میں ہوتا بجائے شیر جوئے خوں رواں کرتا

اگر ہرگز نہ میں اُس شوخ کی خاطر نشاں ہوتا — خدا جانے وفا میرے کے حق میں کیا گماں کرتا

زباں فولاد کی ہو تب جواب کوہ کن دیوے — ستم ہوتا اگر پرویز کو عشق امتحاں کرتا

نہیں معلوم اب کے سال میخانے پہ کیا گزرا — ہماری توبہ کرنے سیتی پیمانے پہ کیا گزرا

برہمن اپنے سر کو پیٹتا تھا دیر کے آگے — خدا جانے مری صورت سے بتخانے پہ کیا گزرا

یقیں کب میرے سوز دل کی کوئی داد کو پہنچے — کہاں ہے شمع کو پروا کہ پروانے پہ کیا گزرا

ہیں زخم مرے کاری اس سینے سے کیا ہوگا
اب مرنا ہی بہتر ہے اس جینے سے کیا ہوگا

اگر تجھ کو زلیخا دیکھتی سب کچھ بسر جاتی
تماشا ماہِ کنعانی کا اُس کو خواب ہو جاتا

سر پہ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا
ہمیں ظلِّ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا
مرا دل مر گیا جس دن سے نظارہ سے باز آیا
یقیں پرہیز اگر کرتا تو یہ بیمار بہتر تھا

تنگ دل کو کب بھلی لگتی ہے بستاں کی ہوا
باغ سے یوسف کو رنگیں تر ہے زنداں کی ہوا

نہ آبِ تیشہ فرہاد اپنے خوں میں گر ملا سکتا
تو ایسے رنگ سے کب نقشِ شیریں کو بنا سکتا

یہ عشقِ سرشکن فرہاد پر لایا جو کچھ لایا
وگرنہ کون ایسی فتح خسرو کو دلا سکتا

تجھ آنکھوں سے اُتر کر دل نہ کرتا شور کیا کرتا
یہ شیشہ طاق سے گرتا نہ ہوتا چُور کیا کرتا

یہ دل ایسا خرابِ کوچۂ بازار کیوں ہوتا
اگر ملتا نہ اتنا گل رخوں سے خوار کیوں ہوتا
تری اُلفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ
یہ ایسا کارِ آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا
یقیں اُمید جینے کی نہیں تیری ان آنکھوں سے
اگر پرہیز تو کرتا تو یوں بیمار کیوں ہوتا

گرا میں آنکھ سے تیری جہاں کے ہاتھ کیا آیا
مجھے پٹکا زمیں پر آسماں کے ہاتھ کیا آیا
نہ کہتی رازِ دل تو اتنی رسوائی بھلا سہتی
فضیحت کر کے مجھ کو اس زباں کے ہاتھ کیا آیا

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کا بند
برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطّر ہو گیا

دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک
دیکھا سو اس زمیں میں چمن کا نشاں نہ تھا

اس قدر غرق لہو میں یہ دلِ زار نہ تھا
جب حنا کو ترے پاؤں سے سروکار نہ تھا
حسن کا عشقِ زلیخا سیتی کچھ چل نہ سکا
ورنہ وہ پاک گہر قابلِ بازار نہ تھا
دل مرا عشق کے دھڑکوں سے ہوا جاتا ہے
یہ وہ دل ہے کہ کوئی ایسا جگروار نہ تھا
دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس
کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

اتنا کوئی جہاں میں کبھو بے وفا نہ تھا
ملنے میں تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا
ناصح جو یہ نصیحتِ بیجا ہے میں سُنی
معذور رکھیو مجھ کو مرا دل بجا نہ تھا

خفیف مجھ سے اُلجھ کر عبث ہوا واعظ
کہ میں تو مست تھا اُس کو بھی کیا شعور نہ تھا

تری آنکھوں کی کیفیت کو مے خانہ سے کیا نسبت
نگہ کی گردشوں کو دورِ پیمانے سے کیا نسبت

بتاں کی مجھ سے خاطر جمع ہے یہاں تک کہ کہتے ہیں
کہاں اس دام سے یہ صید جا سکتا ہے کیا قدرت

ہمارا شور سن مجنوں کو بھولی طرز نالے کی
کوئی شیروں کے منھ پر نے بجا سکتا ہے کیا قدرت

شیشۂ دل کے تئیں اپنے سنبھالے رکھ یقیں
پھر کرے گا کون اُس کے پھوٹ جانے کا علاج

سو جگہ سے دل گریباں پھاڑ دیوانے کی طرح
زلف کی زنجیر میں آخر پھنسا شانے کی طرح

جی نکل جاتا ہے میرا جب کبھو آتی ہے یاد
وہ قسم کھا کر اُسی ساعت مکر جانے کی طرح

خار سے مژگاں کے جی ڈرتا ہے میرا بے طرح
رکھ مری آنکھوں پہ دیتے ہو کفِ پا بے طرح

فصل گل بھی آن پہنچی دیکھیے کیا ہو یقیں
اب کے چلتا ہے جنوں پر دل ہمارا بے طرح

گرچہ شیریں شیخ کے ہے وجد میں آنے کا شور
پر قیامت بانمک ہوتا ہے مے خانہ کا شور

آہ و نالہ پر نہیں موقوف شہرت عشق کی
کس قدر ہے اس خموشی ساتھ پروانے کا شور

دل ہمیں کہہ کر چلا تھا اپنے جانے کی خبر
پھر نہ دی ہم کو کسی نے اس دیوانے کی خبر

بلبلیں سہم چلی جاتی ہیں باغوں کی طرف
کچھ تو اُڑتی سی سنی ہے گل کے آنے کی خبر

نیں پہنچتا ضعف سے نالہ مرا صیاد تک
کون دے اس ناتواں کی آب و دانے کی خبر

توقع دے کے مت کہہ نا اُمیدی کے سخن بس کر
جوابِ تلخ مت دے مجھ کو اے شیریں دہن بس کر

جو لوہا جس نہ دے اُس کو لگانا ہاتھ کیا حاصل
بہت کی تو نے اس تیشہ کی خدمت کوہکن بس کر

خال گورے منہ کا لیتا ہے مرے دل کو چرا
اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پھرتے ہیں چور

گریباں پھاڑتے ہیں دیکھ خوبانِ چمن کیوں کر
نہ کیجے چاک ناصح اس ہوا میں پیرہن کیوں کر

کوئی محنت کوئی لذت اُٹھاوے یار سے کوئی
کھو اپنے تئیں ضائع نہ کرتا کوہکن کیوں کر

تعجب سخت رہتا ہے یقیں اس بات کا مجھ کو
کہ اتنا بولتے ہیں تلخ یہ شیریں دہن کیوں کر

بعد مرنے کے ہوں میں گور میں غمناک ہنوز
گرد پھرتے ہیں مری خاک کے افلاک ہنوز

منہ پہ کھاتا ہے اسی طرح سے تلوار کہ بس
دل مرا عشق میں ایسا ہے جگر وار کہ بس

نزع میں دیکھ مجھے یار جھجک کر بولا
کیا بری طرح سے مرتا ہے یہ بیمار کہ بس

آپ کو بیچ کے یوسف نے زلیخا کو لیا
کیا خریدار یہ پایا ہے خریدار کہ بس

آپ سے ہم نے مقرر کی ہے اپنی جا قفس
ورنہ ٹک پھڑکیں تو ہو جاوے تہ و بالا قفس

تنگ تو کرتا ہے پر ہم جو کہیں جلتے رہیں
تو پڑا منہ دیکھتا رہ جائے گا تنہا قفس

آج دیکھی ہے میں وہ لطف کی بیداد کہ بس
سر پہ آیا مرے اس طور سے جلاد کہ بس

جی میں آتا ہی تری چھب کو دکھا دیجے آپ سے
باغ میں اتنا اکڑتا ہے یہ شمشاد کہ بس

کچھ پر و بال میں طاقت نہ رہی جب چھوٹے
ہم ہوئے ایسے برے وقت میں آزاد کہ بس

تو نہ تھا حیف یقیں ورنہ دیوانہ ہوتا
آج اس طرح کا دیکھا ہے پری زاد کہ بس

عاقبت تن پروری ہوتی ہے گردن کا وبال
کس قدر پہلوئے چرب اپنے سے دکھ پاتی ہے شمع

اہل نور آہن دلوں کو دیکھ شرماتے ہیں سخت
دیکھ کر گل گیر کی صورت کو ڈر جاتی ہے شمع

بہ نہیں ہوتا کسی مرہم سے اس سینہ کا داغ
ہو گیا ناسور آخر یار دیرینہ کا داغ

ہم تو مرتے ہیں گے اور بجھتا ہے الفت کا چراغ
دیکھئے پھر ہووے کب روشن محبت کا چراغ

خاندانِ درد مجھ سے کیوں نہ ہو روشن یقیں
ہے مرا ہر داغ سینہ میں مصیبت کا چراغ

ناصح سے مجھ کو غم نے کیا شرمسار حیف
سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف

دل نہیں کھنچتا ہے بن تیرے بیاباں کی طرف
خوش نہیں آتا نظر کرنا غزالاں کی طرف

اس ہوا میں رحم کر ساقی کہ بے جام شراب
دیکھ کر چھاتی بھری آتی ہے باراں کی طرف

سحر کے ڈورے جو سنتے تھے سو یہ دیکھے یقیں
دل کھنچا جاتا ہے اس زلفِ پریشاں کی طرف

آئینہ ہوتا ہی اس روئے درخشاں کا حریف
ماہ بن اور کون ہو خورشید تاباں کی طرف

بہت جینے کی تدبیر اہلِ عرفاں کے نہیں لائق — کہ پینا آبِ حیواں شانِ انساں کے نہیں لائق

رشک سے لگ گئی ہے پروانے کے جیسی تن کو آگ — لگیو اے فانوس ایسی تیرے پیراہن کو آگ
جلتے بتوں سے کل ان تیلیاں کپڑوں کے ساتھ — جی دھڑکتا ہے مبادا لگ اُٹھے دامن کو آگ

چمن میں مجھ سے دیوانے کو لے جانے کا کیا حاصل — دکھا کر گل جنوں کو شور پر لانے کا کیا حاصل
جنھیں بابوں کی پھانسی وے ہی وے ہرگز نہیں جیتے — جو زنخوں میں پھنسا دل اُس کے غم کھانے کا کیا حاصل
ہمارے درد کی دارو اگر کچھ ہے تو دلدار ہے — یہ سب کچھ سن کے ساقی بات پی جانے کا کیا حاصل

ہم نہ کہتے تھے کہ مت چھیڑ ان دونوں دھاروں کے تئیں — خط کی صورت میں پڑا آخر نہ آہوں کا وبال
اس تغافل ساتھ میرے سامنے سے درگزر — بے طرح پڑتا ہے حسرت کی نگاہوں کا وبال
ہاتھ لگتا گر زنانِ مصر کو یہ آفتاب — خواب ہو جاتا اُنھیں اُس ماہِ کنعاں کا خیال

مے ہوئی آخر رہی تدبیر غم کی ناتمام — کس سے دل خالی کریں اب ہو چکا ملنا تمام
تیری آنکھوں میں نشہ نے اس طرح مارا ہے جوش — ڈالتے ہیں جس طرح بدمست مے خانے میں دھوم

کروں کیوں کر میں قیدِ زلف سے چھٹنے کی تدبیریں — پڑی ہیں میرے ہر انگشت میں چوبِ شانہ زنجیریں
ہمیں بھی بات کہ آتی ہے لیکن دل نہیں حاضر — حیا سے دور ہی ناصح خموشی ساتھ تقریریں

یقیں اقبال ہاتھ آیا نہیں کچھ جی کے جانے سے
نہیں ہووے گی ہم فرہاد کو سو بار سر چیریں

چمن میں شاخ ہل جاتی ہے جیسے گل کے ہلنے سے — لچک جاتا ہے دم لیتے نزاکت اس کو کہتے ہیں

زخم بن مجھ کو کچھ اس لاگ سے مقصود نہیں — عشق پھیکا ہے اگر داغ نمک سود نہیں
ہے اُسی تیغ کے زنگار کا مرہم درکار — اور کسی طرح مرے زخم کا بہبود نہیں

کرتا ہے کوئی یار رو اس وقت میں تدبیریں — مرتا ہے یہ دیوانہ اب کھول دو زنجیریں
ناداں ہیں جو معنی چھوڑ صورت کی طرف جاوے — لڑکوں کو کتابوں سے منظور ہیں تصویریں
چہرے سے نکل کر مو لپٹے ہیں یقیں منہ پر — اوراقِ طلائی پر جوں کھینچی ہیں تحریریں

کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجھ کو بہاراں میں
عبث سیتے ہو اُس کو کیا رہا ہے اب گریباں میں

چمن کے بیچ کلیانی ہے جیسے شاخ سنبل کی
ہوئے ہیں کس قدر دل جمع اُس زلفِ پریشاں میں

بہار آئی ہے ہم کو کیا کہے گا باغباں دیکھیں
چمن میں باندھنے پاوینگے اب کے آشیاں دیکھیں

اٹھا اس منھ سے اے بادِ صبا گھونگٹ کی آنچل کو
توجہ سے تری ہم بھی ٹک اک یہ گلستاں دیکھیں

نہ کر خجل مجھے مہماں مرا نہ ہولے عشق
کہ میری آنکھ میں آنسو جگر میں آہ نہیں

تونے ہم پر جو جفا کی ہے سو مذکور نہیں
تس پہ ہم نے جو وفا کی ہے سو منظور نہیں

سینہ میرے میں ترے عشق سے جوشاں ہے عسل
کون ناسور ہے جو نیش کا معمور نہیں

دین و دنیا گئے مجھے کام سے کھوتا ہی **یقیں**
چھوڑ دوں عشق نہ باللہ کہ معذور نہیں

خدا کی بندگی کہئے اُسے یا عشق معشوقی
وہ نسبت ایک ہے سو سو طرح تعبیر کرتے ہیں

سو سو ہیں التفات تغافل میں یار کے
بیگانگی سے اُس کی کوئی آشنا نہیں

شیریں دہن بھی تلخ لگے بولنے **یقیں**
اب چھوڑ دے نظارہ کچھ اس میں مزا نہیں

وہ کون دل ہے جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں
اُس آفتاب کا کس ذرہ میں ظہور نہیں

ترے سفر کی خبر سن کے جان دھڑکوں سے
جو پہنچوں مرنے کے نزدیک میں تو دور نہیں

کوئی بھی دیتا ہے لڑکوں کے ہاتھ شیشۂ دل
یقیں میں غور سے دیکھا تو کچھ شعور نہیں

جس محبت میں نہیں ہے شور ہے وہ بے نمک
کیا مزا ہے عشق کرنے میں جو رسوائی نہیں

بن **یقیں** کے باغ میں جا کر بتاں کہتے ہیں سب
سیر گل سے جی نہیں لگتا وہ سودائی نہیں

شکوہ جفا کا یار سے کرنا وفا نہیں
بندہ کو اعتراض خدا پر روا نہیں

اگر رستم ہو عاشق دم نہ مارے یار کے آگے
کہ اُس کا جی نکل جاتا ہے اُس کی ایک ٹھمکن میں

گالی بھی پی گئے ہیں ماریں بھی کھائیاں ہیں
کیا کیا تری جفائیں ہم نے اُٹھائیاں ہیں

ایسا دراز دامن میں ہاتھ اُن کے آیا
بختوں کی عاشقوں کے کیا نارسائیاں ہیں

حق کو یقیں کے آخر برباد مت دو یارو
تم نے سخن کی طرزیں اس کی اڑائیاں ہیں

قامتِ رعنا سے تیرے بس کہ شرماتا ہے سرو
دیکھ کر تجھ کو زمیں کے بیچ گڑ جاتا ہے سرو

تم ہمیں پامال یوں کرتے ہو اب خوش قامتو
دیکھتے ہو قمریوں کو سر پہ بٹھلاتا ہے سرو

کھڑا ہے سرو نپٹ بن بنا کے رعنا ہو
جو یار پردے سے نکلے تو کیا تماشا ہو

نہ لانا تھا مرے گریہ کو شور پر اے عشق
بُری بلا تو نے چھیڑی ہے دیکھئے کیا ہو

خونِ انصاف سے اتنا بھی زباں تر نہ کرو
لعل کو یار کے ہونٹوں سے برابر نہ کرو

باندھ کر مجھ پہ کمر لطف نہیں غیر کا قتل
اپنی بیداد کے مضموں کو مکرّر نہ کرو

کوئی یہ چاند سا منھ چھوڑ کر عاشق ہو شعلہ کا
گزر آتش پرستی سے یہ پروانے سے کہہ دیجو

ستاؤ مت یقیں کا دل کہ یہ خوباں کا مسکن ہے
خدا جانے کہ کیا ہو اس مرے خانے کو مت چھیڑو

جفا کے عذر میں اے ظالمو نہ دیر کرو
مری زباں شکایت پہ مت دلیر کرو

حنا کی طرح ہیں اپنا بحل کیا ہے خوں
بتاں شہید کرو خواہ دستگیر کرو

خدا کرے کہ کہوں حق شتاب ثابت ہو
مت امتحانِ وفا میں یقیں کے دیر کرو

جو تو شراب پئے کیونکہ دل کباب نہ ہو
لگے جب آگ کہاں تک یہ زہرہ آب نہ ہو

خنک گزرتے ہیں ایام عشق داغ بغیر
کہ سرد ہووے ہوا جس دن آفتاب نہ ہو

دیوانے شہر سے یہاں آ کے جی چھپاتے ہیں
خدا کرے یہ خرابہ کبھی خراب نہ ہو

بتاں کی مدح نہیں حسنِ خلق و دامنِ پاک
وہ کیا مزا ہے جو معشوق بد شراب نہ ہو

یقیں بتاں کا ہوا جب سے بندہ تب سے ہی داغ
جو ہووے کافر اسے کس طرح عذاب نہ ہو

شہر میں تھا نہ ترے حسن کا سا شور کبھو
مصر اس جنس سے اتنا نہ تھا معمور کبھو

فکر مرہم کی مرے واسطے مت کر ناصح
خوب ہوتا نہیں اس عشق کا ناسور کبھو

گو نہ کر وعدہ وفا دے مجھے اس کا تو جواب
مجھ سے ملنا بھی سجن ہے تجھے منظور کبھو

اپنی بیداد کی سوگند ہے تجھ کو اے مرگ
تو نے دیکھا ہے یقیں سا کوئی رنجور کبھو

خواب میں کس طرح دیکھوں تجھ کو بیخوابی کے ساتھ
جمع آسایش کہاں ہوتی ہی بیگانے کے ساتھ

مفت نیں لیتے وفا کو شہر خوباں میں یقیں
کس قدر بے قدر ہے یہ جنس نایابی کے ساتھ

بہار آئی ہمیں کیا حکم ہے اے باغباں سچ کہہ
چمن میں رہنے پاوے گا ہمارا آشیاں سچ کہہ

نمک ڈالا ہے مجھ میں اے ہما شورِ محبت نے
کبھو کھائی ہیں تو نے اس مزے کی استخواں سچ کہہ

یقیں راتوں کو کر کر شور نیندیں سب کی کھوتا ہے
یہ کس بے درد سے سیکھا ہی فریاد و فغاں سچ کہہ

کچھ عمر نہیں باقی پیارے تو شتاب آجا
ڈرتا ہوں چھلک جاوے لبریز ہی پیمانہ

منہ اپنے کے گلشن میں رہنے نہ دیا کر تو
یہ سبزہ ترے خط کا ہی سبزۂ بیگانہ

روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سے
کچھ خوب نہیں سننا افسوں ہی یہ افسانہ

عمر میں تو نے تو دیکھے ہیں بہت غم خانے
آ تو اے چرخ ٹک اک اس دلِ ناشاد کو دیکھ

کہاں تاثیر نالوں میں ہی اے مرغِ سحر چپ رہ
عبث صیاد کو ناخوش ہے کیوں کرتا ہے بس چپ رہ

جب ہوا معشوق عاشق دلربائی کیا کرے
بندگی سے جس نے خو کی ہو خدائی کیا کرے

وصل کی گرمی سے مجھ کو ضعف آتا ہی یقیں
دیکھئے مجھ ساتھ خوباں کی جدائی کیا کرے

کیا دل ہے اگر جلوۂ دیدار نہ ہووے
ہے طور سے کیا کام جو دیدار نہ ہووے

دل جل جو گیا خوب ہوا سوختہ بہتر
وہ جنس کوئی جس کا خریدار نہ ہووے

دوانے کس طرح ناصح اٹھا دیں ہاتھ طفلاں سے
کہ ہی کشتِ جنوں سیراب اُن کے سنگ باراں سے

یار کب دل کی جراحت پہ نظر کرتا ہے
کون اُس کوچہ میں جز تیر گزر کرتا ہے

اپنی حیرانی کی ہم عرض کریں کس منہ سے
کب وہ آئینہ پہ مغرور نظر کرتا ہے

عمر فریاد میں برباد گئی کچھ نہ ہوا
نالہ مشہور غلط ہے کہ اثر کرتا ہے

جو سر پاؤں پہ رکھ دیجے تو خوش ہوویں میاں ہم سے
ولیکن ہائے ہو سکتی ہی یہ جرأت کہاں ہم سے

مرے آنسو بھی مارے ضعف کے اب چل نہیں سکتے
کیا اے عشق مجھ کو ہائے ایسا ناتواں تو نے

خطا ہے مفت مر کر یار کیوں دیجے رقیباں کو
ہماری ہم سے پوچھو کوہکن کی کوہکن جانے

اگر دیتے ہو دل کی داد جتنا اُس کا جی چاہے
تو کرنے دو اُسے فریاد جتنا اُس کا جی چاہے

نہیں ممکن کہ ہم کعبہ کو جاویں چھوڑ بت خانہ
کرے واعظ ہمیں ارشاد جتنا اُس کا جی چاہے

نہیں کوئی کہ دشنام اُس کی ہم تک یا دعا لاوے
گیا ہے اب اُس کو دیکھیے کب تک خدا لاوے

پڑے پتھر الٰہی اس محبت پر کہ ہووے کس
مرے فرہاد اور پرویز شیریں کو اُٹھا لاوے

دیارِ حسن میں تو خوش ہوا پر یہ بڑی مشکل
کہ لُٹ جاتا ہے وہاں جو کارواں حسنِ وفا لاوے

مناسب نیں ہے شکوہ جور کا ان خوبرویوں سے
یقیں کوئی بُری باتوں کو اچھے پہ کیا لاوے

زمیں پہ جس طرح گرتا ہے سایہ سروِ رعنا کا
تری قامت کے آگے فرش ہو جاتی ہے رعنائی

نہیں ہوتی کبھو احباب کی خاطر ملول اُس سے
خدا شاہد عجب بے بد مصاحب ہے یہ تنہائی

معاوضہ میں وفا کے جو یہ جفا ہووے
کبھو کسو سے کوئی کیونکہ آشنا ہووے

اگر بہ خیر ہمیں یاد کر نہیں سکتا
کبھو بُرا ہی ہمیں کہہ ترا بھلا ہووے

یقیں ہوا مجھے قطرے سے اشک کے معلوم
نہ اُٹھ سکے کوئی جو آنکھ سے گرا ہووے

خبر کیا پوچھئے مرغِ قفس سے آشیانے کی
اسیروں کو توقع کب ہے پھر گلشن میں جانے کی

گئے بگڑے شروعِ گل میں اور پروازِ اوّل میں
نہ دی فرصت زمانے نے ہمیں دھومیں مچلنے کی

موا جاتا ہوں مت اتنا بھی کس کر باندھ بالوں کو
ٹک اک ڈھیلی تو کر دے جان زنجیریں دوانے کی

زنجیر میں بالوں کے پھنس جانے کو کیا کہئے
کیا کیا کیا یہ دل نے دیوانے کو کیا کہئے

دل چھوڑ گیا ہم کو دلبر سے توقع کیا
اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہئے

دکھ تو دیتا ہے کروں تجھ کو بھی حیراں تو سہی
باغباں اب کے اجاڑے لوں گلستاں تو سہی

مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے
جی ہی لے چھوڑے گی آخر کو یہ بیماری مجھے

کب ہوس ہے مجھ کو رسوائی کی لیکن کیا کروں
کھینچ کر لاتی ہے اس کوچہ میں ناچاری مجھے

کیا لگا لیتا ہے خوباں کو یقیں کرتے ہی داغ
آئینہ کی سادہ لوحی ساتھ پرکاری مجھے

بے قراری کب ٹھیرنے دے ہے مجھ کو زیرِ تیغ — مارنا سیماب کا مشکل ہے قاتل کیا کرے
ستم ہے قید کرنا اس طرح کے مرغِ ناداں کو — کہ جو مارے بھلائی کے قفس کو آشیاں سمجھے
کرتے ہیں اپنے بال دکھا مبتلا مجھے — اس پیچ سے بتاں کے نکالے خدا مجھے
جور و جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر — کرتے تو گی یہ راست نہ آئی وفا مجھے
خدا مجھے ترے داغوں سے لالہ زار کرے — یہ خارِ خشک مگر آگ سے بہار کرے
قیامت آپ یہ اس قد سے لا چکے ہم تو — کہاں تک کوئی محشر کا انتظار کرے
اس سینتی پوش سے آغوشِ رنگیں کیجئے — جی میں ہے اک مصرعِ موزوں کو تضمین کیجئے
نگاہِ گرم سے کھاؤ بھی تاب موم کی طرح — خدا کسی کے تئیں اتنا خوش کمر نہ کرے
یہ دل مملوک ہے خوباں کا کون اس کو چھپا رکھے — بغل میں کون مالِ بادشاہی کو دبا رکھے

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے — میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے
دوستی بد بلا ہے اس میں خدا — کسی دشمن کو مبتلا نہ کرے
ہے وہ مقتوں کا فرِ نعمت — اپنے قاتل کو جو دعا نہ کرے

ناصحوں کی یہ کچھ نصیحت ہے
کہ یقیںؔ یار سے وفا نہ کرے

حسن اور عشق میں اک طور کی نسبت ہی ضرور — چشمِ بیمار تجھے وہی ہے دلِ زار مجھے
یار آیا پہ مجھے ہوش نہ تھا کیا کیجے — نہ کیا اس دلِ دشمن نے خبردار مجھے
چھٹے اس زندگی کی قید سے اور داد کو پہنچے — وصیت ہے ہماری خوں بہا جلاد کو پہنچے
نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے اب نالہ کرتا ہوں — مری فریاد بھی شاید مری فریاد کو پہنچے
ہمیں اس غم کے ہاتوں زندگانی خوش نہیں آتی — کوئی بیداد گر یارب ہماری داد کو پہنچے
ہوا میں سرو کے اتنا نہ کر شور و شر اے قمری — نہ دے برباد تو اپنی کفِ خاکستر اے قمری
یقیںؔ یاد رکھیو کہ شوخی خوب نئیں خدمت میں خوباں کی — تو بیجا سرو کے چڑھ بیٹھ بیٹھے سر پہ اے قمری

گئے سب بھول شکوے دیکھ روئے یار کیا کہئے
زبانِ چرب ہے میری ہوئے بے کار کیا کہئے

تبسم میں جو اُس کا منھ کھلا جی بندھ گیا اپنا
مرا دل لے گیا ہنستے ہی ہنستے یار کیا کہئے

اگر اُس کی جگہ پہلو میں ہونا چار بہتر تھا
بہت دیتا ہے میرا دل مجھے آزار کیا کہئے

یقیں کے واقعہ کی سن خبر وہ بدگماں بولا
یہ دیوانہ کچھ ایسا تو نہ تھا بیمار کیا کہئے

دوانہ ہوں میں جی دینے میں مجنوں کے سلیقہ کا
مزے لے کے مرنے کی طرح فرہاد کیا جانے

گلا تو پھٹ گیا نَے کی طرح فریاد کرنے سے
قیامت دُور ہے کب تک ملے گی داد کیا جانے

نکل بھاگا ہے کوئی صید کیا اس دام سے سچ کہہ
کئی دن میں کہ تیری زلف کی خاطر پریشانی

اگر زنجیر میرے پاؤں میں ڈالے تو کیا ہوگا
بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

یہ وہ آنسو ہیں جن سے دہر آتش ناک ہو جاوے
اگر ہووے کوئی یہ آب جل کر خاک ہو جاوے

گنہگاروں کو ہے اُمید اس اشکِ ندامت سے
کہ دامن شاید اس آبِ رواں سے پاک ہو جاوے

عجب کیا ہے تری خشکی کی شامت سے جو تو نہائے
نہال تاک تبلا دے تو وہ مسواک ہو جاوے

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

یہ کون ڈھب ہے سجن خاک میں ملانے کا
کسو کا دل کبھو پاؤں تلے ملا بھی ہے

یقیں کا شورِ جنوں سُن کے یار نے پوچھا
کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

خوش آئی ہے مجھے یہ بات اُس مجنونِ عریاں سے
کیا کیجے کہاں تک چاک گر رہے ہم گریباں سے

نہیں ہے جامِ مے بن کچھ ہمارا خوں بہا ساقی
اس آبِ زندگی سے اپنے یاروں کو جلا ساقی

ٹک اک تو رحم کر اے مرگ مے کی تمنا میں
ہماری جان کو روتے ہیں یہ ابر و ہوا ساقی

وفا کا کیا قیامت ہے کوئی بدلا جفا دیوے
ترحم ان بتوں کو اپنے بندوں پر خدا دیوے

نہیں پرواز قسمت میں میری اُڑتا
خفا ہو زندگی سے مر گیا ہوں لیک ڈرتا ہوں

مبادا حشر مجھ کو خواب راحت سے جگا دیوے | محبت کا جو ناتا ہے عجب آداب ہیں اس کے
کہ جوں جوں یار دیوے گالیاں عاشق دعا دیوے | نہ دے فرصت ان ہاتھوں سے کہ کچھ کام اور بھی نکلے
ہم آخر ہو نگے دامنگیر اس چاک گریباں کے | رگڑتا ہے سر اپنا پشت پا پر متصل تیرے
گریباں پھاڑتے اس پر کہ کیا طالع ہیں داماں کے | ٹک اک انصاف کر کرتا ہے اتنی بھی جفا کوئی
کھوڈ صندل کھینچ ماتھے پر کیا ہے قتل عام | تیغ ابرو کو دیا ہے سنگ دیکھا چاہیئے

۱۳۱۵ - یک رنگ - دہلوی مصطفیٰ خاں - کوئی اضافہ نہیں۔

(۴ سطر ۲۲ شعر)

یکرنگ تخلص مصطفیٰ قلی خاں نام، متوطن شاہ جہان آباد کے۔ نواسوں میں خانجہان خاں لودی کے اور معاصر شاہ نجم الدین آبرو کے تھے منصبداروں میں محمد شاہ بادشاہ او شہرۂ آفاق ساتھ عزت وجاہ کے، مشہور سخنوروں میں شاہ جہاں آباد کے اور معروف زباں آوروں میں اس خجستہ بنیاد کے تھے۔ طور ان کی گویائی کا پیرو قدماء کی گفتگو کے ہے اور طرز ان کے کلام کی روِیّہ پر مضمون و آبرو کی ہے۔ لیکن ازبسکہ شیوہ سابق یاران حال کے غیر مرغوب ہے، تو آہنگ قدیم سمع خراش و دماغ کوب ہے۔ بلدۂ شاہجہان آباد میں اُنھوں نے اس سرائے فانی سے سفر کیا اور دلوں پر احباب کے داغ حرماں کا دیا یہ اشعار پُر معنی و خوش بیان ان کے منتخب دیوان ہیں ؎

مجھے مت بوجھ پیارے اپنا دشمن | کوئی دشمن ہوا ہے اپنی جاں کا
میں روز و شب وصال سے تیرے ہوں کامیاب | کیوں کر کہوں کہ تجھ سے بہتر ہے آفتاب
سچ کہہ جو کوئی تو مارا جائے | راستے ہیں گے دار کی صورت
مجکو معلوم یوں ہوا گل سے | پھول جاتے ہیں اس سے دولتمند
کیوں ہوئے ہو تم کو دشمن ہمارے اس قدر | دوست کا دشمن کوئی ہوتا ہے پیارے اس قدر
نگہباں چاہیئے سرشار کے پاس | تری آنکھوں سے کیوں کرئیں جدا ہم

رو ٹھتا ہوں اس سبب ہر بار میں — تا گلے تیرے لگوں اے یار میں

اُس پری پیکر کو مت انسان بوجھ — تنک میں کیوں پڑتا ہے اے دل جان بوجھ

کیا جانئے وصال ترا ہو کسے نصیب — ہم تو ترے فراق میں اے یار مر چلے

رونقِ اسلام تیرے رو سے ہے — کفر کا رشتہ ترے گیسو سے ہے

بے قراروں کے تئیں آرام دل — اے مرے پیارے ترے پہلو سے ہے

جدائی سے تری اے صندلی رنگ — مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے

ہوا معلوم یہ غنچہ سے ہم کو — جو کوئی زردار ہے سو تنگ دل ہے

نہیں چھوڑتی ہیں سدا زلف تری اپنی مروڑ — باوجودیکہ کمال ان میں پریشانی ہے

اب تو سجن ہمیں کو تباہی تمھیں سے ہے — ہم سب طرف سوں یار تمہارے گلے پڑے

یکرنگ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط — رکھتا ہے یہ دو نین کہو تو نظر کرے

زخمی برنگِ گل ہیں شہیدانِ کربلا — گلزار کی نمط ہے بیابانِ کربلا

کھانے چلا ہے زخمِ ستم شامیوں کے ہاتھ — دھو ہاتھ زندگی سیتی مہمانِ کربلا

اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ — ہے سر بریدہ شمعِ شبستانِ کربلا

۳۱۶ - یونس مشہور بہ حکیم یونس - ظاہرا در عہد اکبری بود -

سو گیا جیسے جگایا تھا مجھے

بخت مرا جاگ اُٹھا سو گیا

۳۱۷ - یکرو - عبدالوہاب - از شاگردان شاہ نجم الدین آبرو ست

کلامش بر طرز محاورۂ قدما مشتمل بر ایہام ست

(۳ شعر)

۳۱۸ - **یار** دہلوی - میر احمد خلف شاہ اللہ یار - جوانے نہایت زیبا شاگرد تقی میر و محبوب میر ضیا بود - گاہے فکر ریختہ می نمود - در زمان احمد شاہ ایں فردوس آرامگاہ جمعے از شعرائے ریختہ تعلقے بوے داشتہ اند -

آفریں اے دستِ گستاخِ محبت آفریں
یہ گریباں ایک مدت سے گلے کا ہار تھا

۳۱۹ - **یاس** - حسن علی خاں - نسب آں عالی حسب بہ نواب عقیدت جناں نعمت الٰہی پیوندد - درایں ولا شنیدہ شد در لکھنؤ بسر می برد - و استصلاح ریختہ از مرزا جعفر علی حسرت می نماید - ایں اشعار ازاں والا تبار ست -

(۲ شعر)

ابو الحسن خسرو دہلوی - از اکابر شعراست - پدرش سیف الدین لاچین ترک از ہزارہ بلخ - مولدش مومن آباد مشہور بہ سیستانی ست - رفیق محمد سلطان بود - بعد از شہادت او ندیم سلطان بلبن گشت - ہفت بادشاہ را خدمت کرد واز مریدان (را) شیخ نظام الدین اولیا بود در سخن فارسی نود و نہ کتاب گفتہ و در علم موسیقی مہارت تمام داشت در آخر عمر خواہش ایجاد شعر ہندی کرد و اکثر بطرز ایہام کہ

ہم فارسی وہم ہندی تواں خواند می گفت۔ ازاں ست سے

اسے ندیمی بہاسے جان کسے

ہمہ سولیک جائے دور بسے

ودرغم وفات حضرت نظام الدین اولیا درگزشت۔

ازان ست (الحد) ؟ شعر ہندی، عربی

مرکب دراداین گفتہ بود اینست۔

زحال مسکیں مکن تغافل۔

(۵ شعر)

اشاریہ

متعلقۂ تذکرہ جات گلزارِ ابراہیم و گلشنِ ہند

(نوٹ - اس اشاریہ کی ترتیب میں میں نے اپنے دوست اور شاگرد سید اختر حسن سے مدد حاصل کی ہے
سید محی الدین قادری)

ا

ب

ح

خ

ش

ص

ض

ط

ظ

ع

ق

ک

گ

ل

ن

ی

[illegible]

[illegible]